مولانا آزاد لائبریری

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کلکشن

(عطیہ: مسز آفتاب سکسینہ)

Kitab K

1584

# باکمالوں کے درشن

از

پریم چند

پبلشر

لالہ رام نراین لال پبلیشر

کٹرہ روڈ - الہ آباد

سنہ ۱۹۴۰ء

بار سوم

قیمت ۱۴ر

٩٢٠٥٠٥٣

CHECKED-2002

M.A.LIBRARY, A.M.U.

U32685

۳۲۶۸۵

# فہرست مضامین

۱۵۳



رانا پرتاب

# رانا پرتاپ

راجستھان کی تاریخ کا ایک ایک صفحہ دلیرانہ جانبازیوں اور مردانہ جاں نثاریوں کے کارناموں سے مزین ہے۔ بپا راول، رانا سنگا اور رانا پرتاپ ایسے ایسے ممتاز نام ہیں جو باوجود اس کے کہ زمانہ نے انھیں حرف غلط کی طرح مٹا دینے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، ابھی تک زندہ ہیں اور اسی طرح ہمیشہ زندہ اور روشن رہیں گے۔ ان میں سے کسی نے سلطنتوں کی بنیادیں نہیں ڈالیں فتوحات نہیں حاصل کیں۔ نئی قومیں نہیں بنائیں مگر ان بزرگوں کے سینے میں وہ شعلہ دہک رہا تھا جسے حب قوم کہتے ہیں۔ وہ یہ نہیں دیکھ سکتے تھے کہ کوئی غیر شخص آئے اور ہمارے ملک میں ہمارا ہمسر ہوکر رہے۔ انھوں نے مصائب زندگی جھیلے۔ اپنی جانیں گنوائیں مگر اپنے ملک پر قبضہ کرنے والوں کے قدم اکھاڑنے کی فکر میں ہمیشہ پیچ و تاب کھاتے رہے۔ وہ میانہ روی کے حامی نہ تھے کہ میں بھی رہوں اور تو بھی رہ۔ ان کے دعوے زیادہ مردانیت و شجاعت کا پہلو لئے ہوئے تھے کہ رہیں تو ہم رہیں یا ہمارے ہم قوم۔ مگر غیر قوم ہرگز قدم نہ جمانے پائے۔ ان کے

کارنامے اس قابل ہیں کہ ہماری مذہبی تصانیف کا حصّہ بنیں۔ اِس وقت ہم فخر
رانا پرتاپ کے سوانح زندگی ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں جو اقبال اکبری کا
جب تک زندہ رہا سامنا کرتا رہا۔ اُس وقت جب کہ کوٹا، جیسلمیر، آمیر،
مارواڑ سبھی دیسوں کے فرماں روا یا تو دربار اکبری کے دعاگو یا سرکار
اکبری کے وظیفہ خوار بن چکے تھے، یہ بیشۂ شجاعت کا شیر۔ یہ دریائے استقلال
کا نہنگ اور راہ ثبات کا رہرو یکہ و تنہا اُن کی مجموعی قوت کا مقابلہ کرتا رہا۔
پہاڑ کے دروں اور درختوں کے شگافوں میں چھپ چھپ کر اُس انمول ہیرے
کو دشمن کے دست تصرّف سے بچاتا رہا جسے قومی آزادی کہتے ہیں۔ اور
جب مرا تو اُس کے پاس بجز اپنی برق دم تلوار اور چند رفیقان جاں نثار
کے اور کوئی سامان شان و شکوہ نہ تھا۔ جتنے اور یار و مددگار تھے یا تو
حق رفاقت ادا کر چکے تھے یا اقبال اکبری کا دم بھرنے لگے تھے۔ مگر یہ
گمنامی اور بے سروسامانی کی موت اُس تخت زرّیں پر اور آن ہوا خواہوں
کے جمگھٹ میں مرنے سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ جو قوم کی آزادی۔ روح کی
غلامی اور ملک کی ذلّت کے صلے میں ملے ہوں۔

پرتاپ اودے سنگھ کا سپوت بیٹا اور شیر دل دادا کا پوتا تھا۔ رانا سنگا
اور بابر کی صف آرائیاں اور جنگ آزمائیاں تاریخ کے صفحوں پر ثبت ہیں
گو رانا نے شکست کھائی مگر اپنے ملک کی محافظت میں اپنا خون بہا کر ہمیشہ

کے لئے سرخرو ہو گیا۔ اُس کے بیٹے اودے سنگھ میں باپ کے مردانہ اوصاف متوارث نہ ہوئے تھے۔ وہ کچھ دنوں تک تو چتوڑ کو مغلوں کی دست بُرد سے بچاتا رہا مگر جیوں ہی اکبر کے تیور بدلے دیکھے شہر جگمل کو سپرد کر کے خود اراولی کی پہاڑیوں میں جا چھپا اور وہاں ایک نئے شہر کی بنیا ڈ ڈالی جو آج تک اُس کے نام سے اودے پور مشہور ہے۔ جگمل نے جس دلاوری سے حریف کا مقابلہ کیا۔ باشندگان چتوڑ جس مردانگی سے سربکف ہو کر دشمن کو ہٹانے کے لئے آمادہ ہوئے اور نازنینان چتوڑ نے جس استقلال سے اپنے حفظ ناموس کے لئے آگ میں جل جانے کو ترجیح دی۔ یہ سب باتیں ہر زبان پر ہیں اور مورخوں کے قلم اُن کے تذکروں پر ہمیشہ وجد کرتے رہینگے۔ اِدھر بھگوڑا اودے سنگھ اپنے کوہستانی قلعہ میں اپنے رفیقوں کے ساتھ زندگی بسر کرتا رہا۔ رانا پرتاب نے انھیں پہاڑیوں میں مناظر فطرت سے تعلیم پائی۔ شیروں سے مردانگی تو پہاڑوں سے اٹل رہنے کے سبق پڑھے۔ باپ کی وفات تک اُسے بجز سیر و شکار کے اور کوئی مشغلہ نہ تھا۔ ہاں اپنی سلطنت کی پامالی، اپنے ہمعصر ہندو راجوں مہاراجوں کی پست ہمتی، مغل بادشاہوں کے تحکّم اور خاندان میواڑ کے دلیرانہ کارناموں نے اُس کے غیور، باحمیت اور پُرجوش دل کو ٹھوکے دیکر اُبھار رکھا تھا۔

باپ کے انتقال کے بعد جب وہ مسند فرمانروائی پر متمکّن ہوا تو میواڑ

ہوگئے اور جنگل کے بسنے والے جانوروں نے اُسے اپنا مسکن بنا لیا مگر اکبر بھی فن کشورکشائی کا اُستاد کامل تھا۔ اُس نے راجپوتوں کی تلوار کی کاٹ دیکھی تھی اور خوب جانتا تھا کہ جب یہ اپنی جانیں بیچتے ہیں تو سستی نہیں بیچتے۔ اس شیر کو چھیڑنے سے پہلے اُس نے مارواڑ کے راجہ مالدیو کو ملایا۔ آمبر کا راجہ بھگوانداس اور اُس کا بہادر بیٹا مان سنگھ دونوں پہلے ہی اکبر کے حلقہ بگوشوں کے زمرہ میں آگئے تھے۔ جب دوسرے راجوں نے دیکھا کہ ایسے ایسے زبردست پرتاپی راجے اپنی اپنی جانوں کی خیر منا رہے ہیں تو وہ بھی ایک ایک کرکے ہوا خواہانِ اکبری میں شامل ہوگئے۔ اِن میں کوئی تو رانا کا ماموں تھا۔ کوئی پھوپھا۔ حتّٰی کہ اس کا عم زاد بھائی ساگرجی بھی اُس سے منحرف ہوکر اکبر سے آملا تھا۔ پس کیا تعجب ہے کہ جب رانا نے اپنے مقابل بجائے مغلوں کی فوج کے اپنی ہی قوم کے سورماؤں اور شہسواروں کو آتے دیکھا ہو۔ اپنے ہی بھائیوں۔ اپنے ہی عزیزوں اور رشتہ داروں کو اپنے مقابل شمشیر بکف پایا ہو تو اُس کی تلوار ایک دم کے لئے رُک گئی ہو۔ ذرا دیر کے لئے وہ خود ٹھٹھک گیا ہو اور مہاراجہ یُدھشٹر کی طرح پکار اُٹھا ہو "کیا میں اپنے ہی بھائی بندوں سے لڑنے کے لئے آیا ہوں" اس میں شک نہیں کہ اِن بھائی بندوں سے وہ بارہا لڑ چکا تھا۔ راجستھان کی تاریخ ایسی خانہ جنگیوں سے بھری پڑی

ہے مگر یہ لڑائیاں اُنھیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کرتی تھیں۔ دن بھر ایک دوسرے کے خون میں نیزے تر کرنے کے بعد شام کو وہ پھر مل بیٹھتے اور آپس میں بغلگیر ہو جاتے تھے مگر آج رانا کو ایسا معلوم ہوا کہ یہ بھائی بند مجھ سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ گئے ہیں۔ کیونکہ وہ سچے راجپوت نہیں رہ گئے۔ اُن کی بیٹیاں اور بہنیں حرم سرائے اکبری میں داخل ہو گئی ہیں افسوس! اِن راجپوتوں کا خون حمیت ایسا سرد ہو گیا ہے۔ کیا اِن میں غیرت قومی نام کو بھی باقی نہیں رہ گئی کیا حفظ ناموس و ننگ کا خیال اُن کے دلوں سے بالکل اُٹھ گیا۔ حیف کہ اِنھیں عصمتِ مآب راجپوتوں کی بہنیں جو محاصرۂ چتوڑ میں جل کر خاکستر ہو گئی تھیں آج اکبر کے پہلو میں بیٹھی ہیں اور خوش و خرم ہیں! اُن کے میان سے تیغہ کیوں نہیں نکل پڑتا۔ اُن کے کلیجے کیوں نہیں پھٹ جاتے۔ اُن کی آنکھوں سے خون کیوں نہیں ٹپک پڑتا۔ افسوس! اکشواک کے بنس اور پرتھی راج کے کُل کی یہ دُردشا ہو رہی ہے۔

پرتاپ نے اُن راجوں سے جنھوں نے اُس کی دانست میں راجپوتوں کو اس حد تک ذلیل کیا تھا قطع تعلق کر لیا۔ اُن کے ساتھ شادی بیاہ تو درکنار کھانا پینا تک جائز نہ رکھا اور جب تک مغل فرمانروا تخت پر رہا، خاندان اودے پور نے نہ صرف خاندانِ شاہی سے ایسے تعلقات نہیں پیدا کئے بلکہ آمبر اور مارواڑ کو بھی برادری سے خارج سمجھا کئے۔ اودے پور اگرچہ

پاس وضع کی بدولت زوال اور تباہی میں پڑا رہا اور دوسرے خاندان وضع کو ہاتھ سے دیدینے کی بدولت باغ عروج کی سیر کرتے رہے مگر سارے راجستھان میں ایسا کوئی خاندان نہ تھا جس پر اودے پور کا اخلاقی رُعب نہ حاوی ہو یا جو اُس کی فضیلت خاندانی کو نہ تسلیم کرتا ہو حتیٰ کہ جب راجہ جے سنگھ اور راجہ بخت سنگھ جیسے جیسے زبردست راجاؤں نے بڑے منکسرانہ الفاظ میں اودے پور سے پوتر بنائے جانے کی درخواست کی اور اُن کی درخواست منظور ہوئی تو یہ شرط لگادی گئی کہ خاندان اودے پور کی لڑکی چاہے کسی خاندان میں بیاہی جائے مگر ہمیشہ اُسی کی اولاد تخت نشین ہوگی۔

کاش رانا اِس نفرت کو اپنے دل ہی تک محدود رکھتا اور زبان تک نہ آنے دیتا تو اُس کو بہت سی مصیبتوں کا سامنا نہ کرنا پڑتا مگر اُس کا جری دل دبنا جانتا ہی نہ تھا۔ مان سنگھ شعلہ پور کی مہم مارے چلا آرہا تھا کہ رانا کی ملاقات کو کوملمیر چلا آیا۔ رانا خود اُس کے استقبال کو گیا اور بڑے تُزک و احتشام سے اُس کی دعوت کی مگر جب کھانے کا وقت آیا تو رانا نے کہلا بھیجا مجھے درد سر ہے۔ مان سنگھ تاڑ گیا کہ اُن کو میرے ساتھ بیٹھ کر کھانے سے عار ہے۔ جھلا کر اُٹھ کھڑا ہوا اور بولا اگر میں نے تمھارا گھمنڈ نہ ڈھا دیا ہو تو نام مان سنگھ نہیں۔ اُس وقت تک رانا بھی وہاں پہنچ گیا تھا۔ بولا تمھارا جب جی چاہے چلے آنا۔ مجھے ہر دم تیار پاؤ گے۔ مان سنگھ نے آکر اکبر کو

اُبھارا۔ بارود پر فتیلہ پہنچ گیا۔ فوراً رانا پر حملہ کرنے کے لئے فوج کی تیاری کا حکم ہوا۔ شہزادہ سلیم کے نام سپہ سالاری ہوئی۔ مان سنگھ اور مہابت خاں مشورہ کار قرار پائے۔

رانا بھی اپنے بائیس ہزار سورما جاں باز راجپوتوں کے ساتھ ہلدی گھاٹ کے میدان میں پرا جمائے کھڑا تھا جیوں ہی دونوں فوجیں مقابل ہوئیں کہ شورِ قیامت برپا ہو گیا۔ مان سنگھ کے رفیقوں کو یہ کدتھی کہ اپنے سردار کی تحقیر کا انتقام لیں۔ رانا کے رفیقوں کو یہ دکھانا منظور تھا کہ ہم اپنی آزادی کو جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ رانا نے ہرچند چاہا کہ مان سنگھ سے مڈبھیڑ ہو جائے تو ذرا دل کے حوصلے نکل جائیں۔ مگر اس کوشش میں کامیابی نہ ہوئی۔ ہاں اُس کا گھوڑا اتفاق سے شہزادہ سلیم کے ہاتھی کے روبرو آگیا پھر کیا تھا۔ رانا نے جھٹ رکاب پر قدم رکھ کر نیزہ چلایا جس نے مہاوت کا کام تمام کر دیا۔ چاہتا تھا کہ دوسرا تُلا ہوا ہاتھ چلا کر اکبر کا چراغ گُل کر دے کہ ہاتھی بھاگا۔ شہزادہ کو خطرہ میں دیکھ کر اس کے سپاہی لپکے اور رانا کو گھیر لیا۔ رانا کے راجپوتوں نے دیکھا کہ سردار گھر گیا تو اُنھوں نے بھی جان توڑ کر ہلا کیا اور اُسے نرغہ سے صاف نکال لائے پھر تو وہ گھمسان کا رن پڑا کہ خون کی ندیاں بہ گئیں۔ رانا زخموں سے چوُر چوُر ہو رہا تھا۔ بدن سے خون کے فوارے

جاری تھے مگر تیغہ ہاتھ میں لئے بپھرے ہوئے شیر کی طرح میدان میں ڈٹا کھڑا تھا۔ غنیم اُس کے چھتر کو دیکھ دیکھ اپنی پوری طاقت سے اُسی مقام پر دھاوے کرتے مگر رانا نے سوائے قدم آگے بڑھانے کے پیچھے ہٹنے کا نام بھی نہ لیا۔ یہاں تک کہ تین بار وہ دشمنوں کی زد میں آتے آتے بچ گیا مگر اُس وقت تک لڑائی کا رُخ پلٹنے لگا۔ دل کی دلیری اور ہمت کے جوش کا توپ و تفنگ۔ گولہ و بارود سے کب تک مقابلہ ہو سکتا تھا۔ سردار جھالا نے جب یہ رنگ دیکھا تو جھٹ چھتر بردار کے ہاتھ سے چھتر چھین لیا اور اُسے ہاتھ میں لئے ایک پیچیدہ مقام پر چلا گیا۔ حریف سمجھا کہ رانا جا رہا ہے اُس کے پیچھے لپکے۔ ادھر رانا کے رفیقوں نے موقع پایا تو اُسے میدان سے زندہ و سلامت بچالے گئے مگر سردار جھالا اپنے ڈیڑھ سو جانباز سپاہیوں کے ساتھ مارا گیا اور جاں نثاری اور رفاقت کا جو کچھ حق ہے وہ ادا کر گیا۔ چودہ ہزار بہادر راجپوت ہلدی گھاٹ کے میدان کو اپنے خون سے سیراب کر گئے۔ جن میں پانچ سے زائد خاندان شاہی کے راجکمار تھے۔

میواڑ میں جب اس شکست کی خبر پہنچی تو گھر گھر کہرام مچ گیا۔ ایسا کوئی خاندان نہ تھا جس کا ایک نہ ایک سپوت نذرِ اجل نہ ہوا ہو۔ ہلدی گھاٹ کے نام پر میواڑ کا بچہ بچہ آج تک فخر کرتا ہے۔ بھاٹ اور کیشر گلیوں اور سڑکوں پر ہلدی گھاٹ کا واقعہ سُنا سُنا کر لوگوں کو رُلاتے

ہیں اور جب تک میواڑ میں کوئی کبیشر زندہ رہیگا اور اُس کے دل آویز کبت کی قدر کرنے والے باقی رہیں گے اُس وقت تک ہلدی گھاٹ کی یادگار ہمیشہ تازہ رہیگی۔

اُدھر رانا اپنے وفادار گھوڑے چٹیک پر سوار یکہ و تنہا چل نکلا۔ دو مغل سرداروں نے اُسے پہچان لیا۔ اور جھٹ اُس کے پیچھے گھوڑے ڈال دیئے۔ اب آگے آگے زخمی رانا بڑھا جا رہا ہے اُس کے پیچھے دونوں سردار گھوڑے دبائے بڑھے آتے ہیں۔ چٹیک اپنے آقا کی طرح زخموں سے چور ہے۔ وہ ہرچند زور مارتا۔ ہرچند جی توڑ کر قدم اُٹھاتا ہے مگر پیچھا کرنے والے نزدیک آتے جاتے ہیں۔ اب اُن کے قدموں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ اب وہ پہنچ گئے۔ رانا تیغہ سوت لیتا ہے کہ یکایک اُسے پیچھے سے کوئی للکارتا ہے "او نیلے گھوڑے کے سوار! او نیلے گھوڑے کے سوار"۔ زبان اور لہجہ بالکل میواڑی ہے۔ رانا بھوچکا ہوکر پیچھے دیکھتا ہے تو اُس کا عموزاد بھائی سکت چلا آرہا ہے۔ سکت پرتاپ سے ناراض ہوکر اکبر کے ہوا خواہوں میں جا ملا تھا اور اُس وقت شہزادہ سلیم کے ہمراہیوں میں تھا مگر جب اُس نے نیلے گھوڑے کے سوار کو یکہ و تنہا زخموں سے چور میدان سے جاتے دیکھا تو خون برادرانہ جوش میں آگیا۔ پُرانی شکایتیں اور کدورتیں دل سے یکلخت

محو ہو گئیں اور فوراً تعاقب کرنے والوں میں جا ملا اور آخر اُن کو اپنے تیر سے خاک پر سُلاتا ہوا راناتک پہنچ گیا۔ اُس وقت اپنی زندگی میں پہلی بار دونوں بھائی سچے برادرانہ جوش و یگانگت سے بغلگیر ہوئے۔ یہاں وفادار چیٹک نے دم توڑ دیا۔ سکت نے اپنا گھوڑا بھائی کے نذر کیا۔ جب رانا نے چیٹک کی پشت سے زین اُتار کر اُس نئے گھوڑے کی پُشت پر رکھا ہے تو وہ زار و قطار رو رہا تھا۔ اُسے اپنے کسی عزیز کے مرجانے کا ایسا صدمہ نہ ہوا تھا۔ کیا سکندر کا گھوڑا بسفالا چیٹک سے زیادہ وفادار تھا؟ مگر اُس کے آقا نے اُس کے نام پر شہر بسا دیا تھا۔ رانا کا ادبار کا زمانہ تھا اُس نے صرف آنسو بہانے پر قناعت کی۔ آج اُس مقام پر ایک ٹوٹا پھوٹا چبوترہ نظر آتا ہے جو چیٹک کی جاں نثاری کا شاہد ہے۔

شہزادہ سلیم فتح کے شادیانے بجاتا پہاڑیوں سے نکلا اُس وقت تک برسات کا موسم شروع ہو گیا تھا اور چونکہ یہ زمانہ اُن پہاڑیوں میں آب و ہوا کے لحاظ سے ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔ رانا کو تین چار مہینے اطمینان رہا مگر موسم بہار کے شروع ہوتے ہی غنیم نے پھر دھاوا کیا۔ مہابت خاں اودے پور پر حکمراں تھا ہی کوکہ شہباز خاں نے کوملمیر کا محاصرہ کیا۔ رانا اور اُس کے رفیقوں نے یہاں بھی خوب دادِ شجاعت دی مگر کسی گھر کے بھیدی نے جو اکبر سے ملا ہوا تھا قلعہ کے اندر کنوئیں میں زہر ملا دیا

ملا دیا اور رانا کو بجز وہاں سے نکل جانے کے اور چارہ نظر نہ آیا۔ تاہم اُس کے ایک سردار نے جس کا نام بھان تھا مرتے دم تک قلعہ کو دشمنوں سے بچائے رکھا۔ اُس کے مارے جانے پر یہ قلعہ بھی غنیم کی فتوحات میں شامل ہو گیا۔

کوملمیر پر قبضہ کر لینے کے بعد راجہ مان سنگھ نے دھرمیتی اور گوگنڈا کے قلعوں کا محاصرہ کیا۔ ایک اور سردار عبداللہ نامے جنوب سے بڑھا۔ فرید خاں نے چھپن پر حملہ کیا۔ اس طرح ہر چہار طرف سے گھر کر پرتاپ کے لئے بجز اطاعت اختیار کرنے کے اور کوئی صورت نہ باقی رہی مگر وہ شیر دل راجپوت اُسی دم خم اُسی جوش شجاعت اور اُسی مستقل مزاجی سے حریف کا اب تک سامنا کرتا رہا۔ کبھی دن دہاڑے کبھی شب تار میں جب کہ فوج شاہی بے خبر سوتی ہوتی وہ یکایک اپنے کمین گاہ سے نکل پڑتا۔ اشاروں سے اپنے رفیقوں کو اکٹھا کر لیتا اور جو شاہی فوج قریب ہوتی اُسی پر چڑھ دوڑتا۔ فرید خاں کو جو رانا کو گرفتار کرنے کے لئے زنجیر بنوائے بیٹھے تھے اُس نے ایسی ہوشیاری سے ایک دشوار گزار گھاٹی میں گھیرا کہ اُن کا ایک آدمی زندہ و سلامت نہ گیا۔ آخر فوج شاہی بھی اس ڈھنگ کی لڑائی سے تنگ آ گئی۔ میدانوں کے لڑنے والے مغل پہاڑ میں لڑتا کیا جانیں اُس پر سے جب بارش شروع ہو جاتی تو چوطرفہ وبا اور امراض

مُہلک پھیل جاتے۔ یہ بارش کے دن پرتاپ کے لئے ذرا دم لینے کے دن تھے۔ اسی طرح کئی برس بیت گئے۔ پرتاپ کے رفیق کچھ تو لڑکر مرے کچھ نذرِ اجل ہوئے کچھ جو ذرا ابو دے سے تھے اِدھر اُدھر دبک رہے۔ رسد اور خوراک کے لالے پڑ گئے۔ پرتاپ کو ہمیشہ یہ کھٹکا لگا رہتا کہ کہیں میرے لڑکے بالے دشمنوں کے پنجہ میں نہ پھنس جائیں۔ ایک بار وہاں کے جنگلی بھیلوں نے اُن کو فوج شاہی سے بچایا اور اُنھیں ایک ٹوکرے میں رکھ کر جاورہ کے کانوں میں چھپا دیا جہاں وہ اُن کی ہر طرح حفاظت اور نگرانی کرتے رہے۔ ابھی تک وہ بلّے اور زنجیریں موجود ہیں جن میں یہ ٹوکرے لٹکا دئے جاتے تھے تاکہ لڑکے درندوں سے محفوظ رہ سکیں۔ ایسی ایسی سختیاں جھیلنے پر بھی پرتاپ کے استقلال میں ذرا بھی لغزش نہ آئی۔ وہ اب بھی کسی شگاف کوہ میں اپنے چند جاں نثار۔ آزمودہ کار رفیقوں کے ساتھ اُسی شان و تجمّل سے بیٹھتا جیسے تختِ شاہی پر بیٹھتا تھا۔ اُن سے اُسی شاہانہ رُعب و داب سے پیش آتا جیونار کے وقت خاص خاص آدمیوں کو دَونے عنایت کرتا۔ اور اگرچہ یہ دَونے محض جنگلی پھلوں کے ہوتے تھے مگر بڑے ادب اور تعظیم سے لئے جاتے ماتھے پر چڑھائے جاتے اور تبرک کے طور پر کھائے جاتے۔ اِس آہنی استقلال نے رانا کو راجستھان کے تمام راجاؤں کی نگاہوں میں ہیرو بنا دیا جو لوگ دربار اکبری کے

مسند نشیں ہو گئے تھے وہ بھی اب رانا کے نام پر فخر کرنے لگے۔ اکبر خود جو دربار قدرت سے دلیری اور جوانمردی لے کر آیا تھا اور بہادر دشمن کی قدر کرنا جانتا تھا اپنے سرداروں سے پرتاپ کی ہمت اور حوصلے کی تعریفیں کرتا۔ شعراے دربار اُس کی شان میں مدحیہ اشعار کہنے لگے اور عبدالرحیم خاں خانخاناں نے جو ہندی بھاشا کا نہایت خوشگو نازک خیال شاعر تھا، میواڑی زبان میں اُس کی داد شجاعت دی۔ سبحان اللہ کیسے قدر شناس دریا دل لوگ تھے کہ دشمن کی بہادری کو سراہ کر اُس کا دل بڑھاتے اور حوصلے اُبھارتے تھے۔

لیکن کبھی کبھی ایسے بھی موقعے آجاتے کہ اپنے یگانوں۔ پیارے بچوں کی مصیبتیں اُس سے نہ دیکھی جاتیں۔ اُس وقت اُس کے حوصلے پست ہو جاتے اور آپ اپنے سینے میں چھُری مار لینے کو جی چاہتا۔ فوج شاہی اُس کی گھات میں ایسی لگی رہتی تھی کہ پکا ہوا کھانا کھانے کی نوبت نہ آتی۔ کھانا کھانے کے لئے ہاتھ منہ دھو رہے ہیں کہ جاسوس نے خبر دی، فوج شاہی آگئی۔ اور اُسی وقت سب چھوڑ چھاڑ بھاگے۔ ایک دن وہ ایک پہاڑ کے دَرّہ میں لیٹا ہوا تھا۔ رانی اور اُس کی بہو گندمول کی روٹیاں پکا رہی تھیں بچے کھانا پانے کی خوشی میں اِدھر اُدھر کِلیلیں کرتے پھرتے تھے۔ آج پانچ فاقے گزر چکے تھے۔ رانا نہ معلوم کن خیالات میں غرق

بچّوں کی حرکتوں کو حسرت آلود نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ افسوس ! یہ وہ بچّے ہیں جن کو مخملی گدّوں پر نیند نہ آتی تھی۔ جو زمانہ کی نعمتوں کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھتے تھے۔ جن کو اپنے بیگانے گود کے بجائے سر اور آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ آج اُن کی یہ حالت ہے کہ کوئی بات بھی نہیں پوچھتا۔ نہ کپڑے ہیں نہ لتّے۔ کند مول کی روٹیوں کی اُمید پر خوش ہو رہے ہیں اور اُچھل کود رہے ہیں وہ انھیں افسردہ کن خیالات میں ڈوبا ہوا تھا کہ یکایک اپنی پیاری بیٹی کی زور کی چیخ نے اُسے چونکا دیا۔ دیکھتا ہے تو ایک جنگلی بلّی اُس کے ہاتھ سے روٹی چھینے لئے جاتی ہے اور وہ بیچاری بڑی درد ناک آواز میں رو رہی ہے۔ ہائے ! غریب کیوں نہ روئے۔ آج پانچ فاقوں کے بعد آدھی روٹی ملی تھی پھر نہیں معلوم کے کڑا کے گزریں گے۔ یہ دیکھ کر رانا کی آنکھوں میں آنسو اُمنڈ آئے۔ اُس نے اپنے جوان جوان بیٹوں کو میدان جنگ میں اپنی آنکھوں سے دم توڑتے دیکھا تھا مگر کبھی اُس کے دل پر رقّت طاری نہ ہوئی تھی۔ کبھی آنکھیں اشک آلود نہ ہوئی تھیں۔ مرنا مارنا تو راجپوتوں کا دھرم ہے۔ اُس پر کوئی راجپوت کیوں آنسو بہائے۔ مگر آج اُس لڑکی کے رونے نے اُسے بے بس کر دیا۔ آج ایک دم کے لئے اُس کا پائے ثبات ڈگ گیا۔ آج ذرا دیر کے لئے فطرت انسانی جوہر ذاتی پر غالب آگئی۔ اہل دل جتنے ہی دلیر و جری ہوتے ہیں

اُتنے ہی رقیق القلب بھی ہوتے ہیں۔ نپولین بونا پارٹ نے ہزاروں آدمیوں کو مرتے دیکھا تھا اور ہزاروں کو اپنے ہی ہاتھوں سے خاک پر سُلا دیا تھا مگر ایک بھوکے لاغر و نحیف کتّے کو اپنے آقا کی لاش بے جان کے اِدھر اُدھر منڈلاتے دیکھ کر اُس کی آنکھیں سیلاب اشک کو نہ روک سکی تھیں۔ رانا نے لڑکی کو گود میں لے لیا اور بولا تُف ہے مجھ پر کہ محض نام کی بادشاہت کے لئے اپنے پیارے بچّوں کو ایسی تکلیفیں دے رہا ہوں، اُسی وقت اکبر کے پاس ایک نوشتہ بھیجا کہ اب تکلیفیں برداشت نہیں کی جاتیں۔ کچھ میرے حال زار پر نظر کرم کیجئے۔

اکبر کے پاس جب یہ پیغام پہنچا تو گویا کوئی نعمت غیر مترقبہ ہاتھ آ گئی۔ فرط مسرت سے جامہ میں پھولا نہ سمایا۔ رانا کا خط اہلِ دربار کو فخریہ دکھانے لگا مگر بہت کم لوگ دربار میں ایسے ناقدر شناس ہوں گے جنھوں نے رانا کی اطاعت کی خبر مسرت سے سُنی ہو۔ راجے مہاراجے اگرچہ اکبر کی دربار داری کرتے تھے مگر یہ قومی ہمدردی کا تقاضا تھا کہ رانا کی عظمت سب کے دلوں میں جاگزیں تھی۔ اُن کو اس بات کا فخر تھا کہ ہم اگرچہ اطاعت پذیر ہو گئے ہیں مگر ہمارا ایک بھائی ابھی تک کوس فرمانروائی بجا رہا ہے اور کیا تعجب ہے کہ کبھی کبھی اُن کے دلوں میں ایسی آسانی سے اطاعت اختیار کر لینے پر ندامت بھی ہوتی ہو۔ اِن میں، مہاراجہ

بیکانیر کا چھوٹا بھائی پرتھی سنگھ بھی تھا جو بڑا جیالا تلوار کا دھنی اور شیر دل تھا۔ اُسے رانا سے غائبانہ سچی عقیدت ہو گئی تھی۔ اُس نے جو یہ خبر سُنی تو یہ یقین نہ آیا مگر رانا کی تحریر دیکھی تو سخت صدمہ ہوا۔ خانخاناں کی طرح وہ بھی نہ صرف شمشیر کا مالک تھا بلکہ نہایت خوش مذاق شاعر بھی تھا اور مردانہ جذبات سے بھرے اشعار کہا کرتا تھا۔ اُس نے اکبر سے رانا کی خدمت میں ایک خط بھیجنے کی اجازت لے لی۔ اِس بہانے سے کہ میں اُس کی اطاعت کی خبر کی تصدیق کروں گا مگر اُس خط میں اُس نے اپنا دل نکال کر رکھ دیا۔ ایسے ایسے مردانہ پُرزور اور حوصلہ افزا اشعار کہے کہ وہ رانا کے دل پر رجز کا کام کر گئے۔ اُس کے دبے ہوئے حوصلوں نے پھر سر اُبھارا۔ جوش آزادی نے پھر شورش مچائی اور اطاعت کا خیال کافور ہو گیا۔

مگر اب کی بار اُس کے ارادوں نے کچھ اور ہی پہلو اختیار کیا۔ متواتر زکوں اور ناکامیوں نے اب اُس پر ثابت کر دیا کہ اقبال اکبری کی موج کو گنے گنائے رفیقوں اور زنگ آلود تیغوں سے روکنا مشکل ہی نہیں بلکہ غیر ممکن ہے لہذا کیوں نہ اس ملک کو جہاں سے آزادی ہمیشہ کے لئے چلی گئی۔ خیر باد کہوں اور ایسے مقام پر سسودیہ خاندان کا قرمزی جھنڈا نصب کروں جہاں اُس کے سرنگوں ہونے کا کوئی کھٹکا نہ ہو۔ بہت ردّ و قدح کے بعد یہ صلاح طے پائی کہ دریائے انڈس کے کنارے جہاں پہنچنے کے

لئے غنیم کو ایک ریگستان طے کرنا پڑیگا۔ نیا راج قائم کیا جائے۔
کیسا وسیع دل اور کیسی ہمت عالی تھی کہ اتنی شکستوں پر بھی ایسے بلند
ارادے دل میں پیدا ہوتے تھے۔ یہ مصمم ارادہ کرکے وہ اپنے عیال و اطفال
اور بچے کھچے رفیقوں کے ساتھ اس نئی مہم پر چل کھڑا ہوا اور اراؤلی کے
مغربی دامن کو طے کرتا ہوا ساحل ریگستان تک جا پہنچا مگر اسی اثنا
میں ایک ایسا مبارک واقعہ ہو گیا جس نے اُس کے ارادے پلٹ
دئے اور اُسے اپنے عزیز وطن کو لوٹ آنے کی تحریک کی۔ راجستھان
کی تاریخ نہ صرف سرفروشی و جانبازی کی داستانوں سے بھری ہوئی ہے
بلکہ اُس میں آقا پرستی عقیدتمندی اور وفاداری کی قابل یادگار و قابلِ فخر
مثالیں بھی اسی کثرت کے ساتھ موجود ہیں۔ بھاماشاہ نے جس کے آبا و اجداد
چتوڑ کے وزیر رہے تھے جب اپنے آقا کو جلا وطن ہوتے دیکھا تو نمکخواری
کا جوش اُمنڈ آیا۔ ہاتھ باندھ کر رانا کی خدمت میں حاضر ہوا اور بولا مہاراج
میں پشتہا پشت سے آپ کا نمک خوار ہوں۔ میری جمع جتھا جو کچھ ہے آپ
کی دی ہوئی ہے۔ میرا جسم بھی آپ کا پروردہ ہے کیا میرے جیتے جی آپ اپنے
پیارے دیس کو ہمیشہ کے لئے تیاگ دیں گے؟ یہ کہہ کر اُس بندۂ وفا
نے اپنے خزانے کی کنجی رانا کے قدموں پر رکھ دی۔ کہتے ہیں اُس خزانے
میں اتنی دولت تھی کہ اُس کے صرفہ سے ۲۵ ہزار آدمی بارہ سال تک

فراغت سے بسر کر سکتے تھے۔ لازم ہے کہ آج جہاں رانا پرتاپ کے نام پر عزت کے سہرے چڑھائے جائیں وہاں بھاما شاہ کے نام پر بھی چند پھول بکھیر دیے جائیں۔

کچھ تو اِس زرِ کثیر کے ملنے اور کچھ پرتھی سنگھ کے مردانہ اشعار نے رانا کے ڈگمگاتے ہوئے استقلال کو پھر جمایا۔ اُس نے اپنے رفیقوں کو جو اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے تھے جھٹ پٹ جمع کر لیا۔ حریف تو بے غم بیٹھے تھے کہ اب یہ بلا اراولی کے اُس پار ریگستانوں سے سر مار رہی ہو گی کہ رانا اپنی جمعیت کے ساتھ شیر کی طرح ٹوٹ پڑا اور گوکہ شہباز خاں کو جو دویر کے مقام پر فوج لئے غافل پڑا تھا جا گھیرا۔ دم کے دم میں ساری فوج فرش خاک پر سُلا دی گئی۔ ابھی غنیم کامل طور پر چوکنا نہ ہونے پایا تھا کہ رانا کوملمیر پر جا ڈٹا اور عبداللہ اور اُس کی فوج کو تلوار کے گھاٹ اُتار دیا۔ جب تک دربارِ شاہی تک خبر پہنچے پہنچے کہ رانا کا قرمزی جھنڈا ۳۲ قلعوں پر لہرا رہا تھا۔ سال بھر بھی نہ گزرا تھا کہ اُس نے اپنے ہاتھ سے گئی ہوئی سلطنت لے لی۔ صرف چتوڑ، اجمیر اور منڈل گڑھ پر قبضہ نہ ہو سکا۔ اِسی یلغار میں اُس نے راجہ مان سنگھ کو بھی ایک خفیف سی سرزنش کر دی۔ آمبر پر چڑھ دوڑا اور وہاں کی مشہور منڈی مال پورہ کو لوٹ لیا۔

اب خیال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اکبر نے رانا کو کیوں اطمینان سے بیٹھنے

دیا۔ اُس کی طاقت پہلے کے مقابلے میں اب بہت زیادہ ہو گئی تھی۔ اُس کی سلطنت کے حدود روز بروز وسیع ہوتے جاتے تھے۔ جس طرف رُخ کرتا اُدھر فتحمندی ہاتھ باندھ کر حاضر ہوتی۔ اُمرا میں ایک سے ایک آزمودہ کار فنِ جنگ سے ماہر لوگ موجود تھے۔ ایسی حالت میں وہ رانا کی اِن زیادتیوں کو کیوں خموشی سے دیکھتا رہا؟ شاید اِس کا سبب یہ ہو کہ وہ اُن دنوں دوسرے ملکوں کو فتح کرنے میں اُلجھا ہوا تھا یا یہ کہ اپنے دربار کو رانا کا ہمدرد پاکر اُس نے اُسے پھر چھیڑنے کی جرأت نہ کی ہو۔ بہرحال اُس نے طے کر لیا کہ رانا کو اُن پہاڑیوں میں خاموش رہنے دیا جائے مگر اُس کے ساتھ ہی نگاہ رکھی جائے کہ وہ میدان کی طرف نہ بڑھ سکے۔ اگر رانا کے بجائے کوئی دوسرا شخص ہوتا تو شاید اس آرام و سکون کو ہزار غنیمت سمجھتا اور اِتنی تکلیفیں جھیلنے کے بعد اس آسائش کو تائیدِ غیبی خیال کرتا۔

مگر اولوالعزم رانا کو چین کہاں؟ جب تک وہ اکبر سے برسرِ کارزار تھا جب تک اکبر کی فوج اُس کی تلاش میں کوہ و بیابان سے سر ٹکراتی پھری۔ اُس وقت تک رانا کے دل کو تسکین تھی جب تک اکبر کو یہ فکر سوہانِ روح ہو رہی تھی۔ اُس وقت تک رانا آسودہ تھا۔ وہ سچا راجپوت تھا وہ غنیم کا غصہ، قہر، نفرت، حتّٰی کہ حقارت کو بھی برداشت کر سکتا تھا مگر اُس کا

دل کبھی اِس کو گوارا نہ کر سکتا تھا کہ کوئی اُس کو رحم سے دیکھے یا اُس پر ترس کھائے۔ اُس کا مغرور دل کبھی اس خیال کی تاب نہ لا سکتا تھا۔

جو دل اپنی قوم کی آزادی پر بکا ہوا ہو اُسے ایک پہاڑی میں بند رہ کر حکومت کرنے سے کیا تسکین ہو سکتی تھی۔ وہ کبھی کبھی پہاڑیوں سے باہر نکل کر اودے پور اور چتوڑ کی طرف خواہشمند نگاہوں سے دیکھتا کہ افسوس! اب یہ پھر میرے قبضہ میں نہ آئیں گے۔ کیا یہ پہاڑیاں میری اُمیدوں کی انتہا ہیں۔ اکثر وہ تنہا پا پیادہ پہاڑ کے دروں میں بیٹھ کر گھنٹوں غور کیا کرتا۔ اُس کے دل میں اُس وقت آزادی کا بحرِ زخار جوش مارنے لگتا۔ آنکھیں سُرخ ہو جاتیں۔ رگیں پھڑکنے لگتیں۔ وہ اپنے خیال کی آنکھوں سے غنیم کو آتے دیکھتا پھر خود اپنا تیغہ سنبھال کر آمادۂ جنگ ہو جاتا۔ ہاں! میں بپا راول کے خاندان سے ہوں۔ رانا سنگا میرا دادا تھا۔ میں اُس کا پوتا ہوں۔ بیر جکمل میرا ایک سردار تھا۔ دیکھو تو میں یہ سُرخ نشان کہاں کہاں نصب کرتا ہوں۔ اگر پرتھی راج کے تخت پر یہ جھنڈا نہ گاڑوں تو میرے لئے جینا اکارت ہے۔

یہ خیالات، یہ منصوبے، یہ جوش آزادی، یہ سوزش اندرونی ہمیشہ اُس کی روح کو گھلاتی رہی، اور آخر ش اِسی آتش نہانی نے اُسے قبل از وقت بسترِ مرگ پر سُلا دیا۔ اُس کے گینڈے کے سے مضبوط اعضا اور شیر کا سا

بے خوف دل بھی اِس آگ کی جلن کو عرصہ تک نہ برداشت کر سکے۔ آخری وقت تک ملک کی آزادی اور قوم کی حریّت کا خیال اُسے بندھا رہا۔ دم واپسیں کے وقت اُس کے سردار جنھوں نے اُس کے ساتھ بہت سے اچھّے بُرے دن دیکھے تھے۔ اُس کی چارپائی کے اِدھر اُدھر غمناک اشک آلود کھڑے تھے۔ رآنا کی ٹکٹکی دیوار کی طرف لگی ہوئی تھی اور کوئی خیال اُسے بیچین کرتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ ایک سردار نے کہا مہاراج رام نام لیجے۔ رآنا نے جان کندنی کے درد سے کراہ کر کہا "میری آتما کو تب چین ہوگا کہ تُم لوگ اپنی اپنی تلواریں ہاتھ میں لے کر قسم کھاؤ کہ ہمارا یہ پیارا ملک ترکوں کے قبضہ میں نہ جائے گا۔ تمھاری رگوں میں جبتک ایک قطرہ بھی خون باقی رہے گا تم اُسے تُرکوں سے بچاتے رہو گے۔ اور بیٹا امر سنگھ! تم سے خاص طور پر التجا ہے کہ اپنے باپ دادوں کے نام پر داغ مت لگانا اور اپنی آزادی کو ہمیشہ اپنی جان سے زیادہ سمجھتے رہنا۔ مجھے خوف ہے کہ کہیں عیش پرستی اور آرام طلبی تُمھارے دلوں پر غالب آجائے اور تم میواڑ کی اُس آزادی کو ہاتھ سے دیدو جس کے لئے میواڑ کے بیروں نے اپنے خون بہائے ہیں"۔ جمیع حاضرین نے ہم آواز ہو کر قسم کھائی کہ جب تک ہمارے دم میں دم ہے ہم میواڑ کی آزادی کو نگاہ بد سے بچاتے رہیں گے۔ پرتاپ کو اطمینان ہوگیا اور سرداروں کو روتا بلکتا چھوڑ روح

قالب عنصری سے پرواز کر گئی گویا موت نے اُسے اپنے سرداروں سے یہ قسم لینے کی مُہلت دے رکھی تھی۔

اِس طرح اُس شیر دل راجپوت کی زندگی کا خاتمہ ہوا جس کے فتوحات کے کارنامے جس کی مصیبت کی داستانیں میواڑ کے بچے بچے کی زبانوں پر ہیں اور جو اس قابل ہے کہ اُس کے نام کے مندر اور شوالے گاؤں گاؤں اور قصبوں قصبوں میں رکھے جائیں اور اُن میں آزادی کی دیوی کی پرستش کی جائے۔ لوگ جب اُن مندروں میں جائیں تو آزادی کا نام لیتے ہوئے جائیں اور وہاں اِس راجپوت کے سوانح زندگی سے سچی آزادی کا سبق سیکھیں۔

# راجہ ٹوڈرمل

یوں تو اکبر کا دربار علم و فضیلت، کاروانی و کارپردازی کا گنجینہ تھا مگر تاریخ کے صفحات پر جس آب و تاب کے ساتھ ٹوڈرمل کا نام چمکا اور انتظام سلطنت و ملکداری جو قابل یادگار خدمات اُس کے نام سے وابستہ ہیں وہ اِس کے معاصرین میں سے کسی کو میسّر نہیں خانخاناں و خان زماں و خان اعظم کے جہانسوز تیغے تھے جنھوں نے اکبری دنیا میں ایک غلغلہ مچا رکھا تھا مگر وہ بجلی تھے کہ یکایک کوندے اور پھر نظروں سے پنہاں ہو گئے۔ ابوالفضل و فیضی کی جگر کاویاں تھیں کہ اگر متلاشیانِ علم چاہیں تو آج بھی اُن سے معلومات کے سبق لے سکتے ہیں مگر ٹوڈرمل کے یادگار وہ آئین سلطنت ہیں جو باوجود ترقی تہذیب و تمدن کے آج تک وقیع نگاہوں سے دیکھے جاتے اور عقیدت کے ساتھ برتے جاتے ہیں نہ تو زمانہ کی روبہ ترقی رفتار اور نہ طرز حکومت کے تغیرات نے اُن پر دستبرد کرنے کی جرأت کی۔

ٹوڈرمل ذات کا کھتری اور گوت کا ٹمن تھا۔ اُس کے وطن کی نسبت اختلافات ہیں مگر ایشیاٹک سوسائٹی کی جدید تحقیقاتوں نے فیصلہ کر دیا ہے کہ موضع لاہرپور علاقہ اودھ کو اُس کے وطن ہونے کا فخر حاصل ہے والدین

عسرت و تنگ حالی میں مبتلا تھے۔ اِس پر اور مصیبت یہ پڑی کہ ابھی ٹوڈرمل کے ہاتھ پاؤں نہ سنبھلنے پائے تھے کہ باپ کا سایہ حمایت سر سے اُٹھ گیا اور اُس کی بیوہ ماں نے نہیں معلوم کِن دقتوں سے اِس ہونہار بچے کو پالا مگر خدا کی کارسازی دیکھئے کہ یہی یتیم اور بے دست و پا بچہ شہنشاہ اکبر کا وزیرِ اعظم ہوا جس کا قلم سارے ہندوستان پر محیط تھا۔ دنیا میں بہت کم ایسی مائیں ہوں گی جن کے لڑکے ایسے سپوت ہوں گے اور کم کسی ولی کی دعائیں درگاہ الٰہی میں ایسی مقبول ہوئی ہوں گی۔

اُس زمانہ میں جبکہ تعلیم اعلیٰ طبقے کے لوگوں ہی تک محدود تھی اور آج کی تعلیمی آسانیوں کا نام بھی نہ تھا۔ اس مفلس لڑکے کی کیا تعلیم ہوتی۔ ہاں وہ خلقۃً ایک ذہین۔ جفاکش۔ سلیقہ شعار لڑکا تھا اور یہ عادتیں عمر کے ساتھ ساتھ مضبوط ہوتی گئیں۔ ابھی بالغ بھی نہ ہونے پایا تھا کہ معاش کی ضرورت نے گھر سے باہر نکالا۔ شیرشاہ سوری اُن دنوں ہندوستان کی قسمتوں کا مالک ہو رہا تھا اور اُس کا وزیر مظفر خاں زمین کے بندوبست میں سرگرم تھا۔ اُس کی سرکار میں معمولی متصدیوں کے خدمات انجام دینے لگا مگر فطری عطیات و خلقی صفات کب چھپے رہتے ہیں۔ اپنی کارپردازیوں اور جانفشانیوں کی بدولت پیش پیش رہنے لگا۔ اور دفاتر کے اکثر صیغے زیرِ قلم ہوگئے چونکہ اس کو ابتدا سے مطالعہ کتب و تحقیقات کا شوق تھا بہت جلد

امورات دفتر و حالات و معاملات سے ماہر ہو گیا۔ اسی اثنا میں زمانے نے کروٹ بدلی۔ سوری خاندان پر زوال آیا اور ہمایوں کے بھاگ جاگے۔ مگر وہ بھی چند دنوں میں جنّت کو سدھارا اور اکبر نے تاج شاہی سر پہ رکھا۔ وہ آدمی پرکھنے والا تھا۔ ایک ہی نظر میں تاڑ گیا کہ یہ نوجوان متصدی ضرور نام و نمود حاصل کریگا۔ اُسے اپنی سرکار میں لے لیا اور حضوری میں رہنے کا حکم دیا۔

مگر اکبر کا دربار وہ گلشن نہ تھا جس میں کوئی نرا سپاہی یا نرا منشی شہرت و اعزاز کے پھول چُن سکتا۔ ٹوڈرمل اب تک قلم ہی کے جوہر دکھاتا رہا مگر ۱۵۶۵ء میں ضرورت ہوئی کہ وہ یہ دکھلائے کہ ہیں کس رگ۔ پٹھے اور دم خم کا سپاہی ہوں۔

اُن دنوں حسین قلی خاں خان زماں نے فتنہ پردازیوں پر کمر باندھی تھی۔ وہ اپنے وقت کا نہایت واقف کار جری شیر دل سپاہی تھا۔ اور بار ہا جان نثاریوں کے ثبوت دے چکا تھا۔ خود تو بہار اور جونپور کا صوبہ دبائے بیٹھا تھا اور اپنے چھوٹے بھائی بہادر خان کو جو دلاوری میں اُسی کا ہم پلہ تھا اودھ کی طرف روانہ کیا تھا۔ اکبر نے میر معز الملک کو بھیجا کہ بہادر خاں کو گرفتار کرکے حاضر دربار کرے مگر میر صاحب سے کوئی کام نہ بنتے دیکھ کر ٹوڈرمل کو بھیجا کہ سرشور نمک حراموں کی فہمائش۔ اور اگر فہمائش

سے کام نہ نکلے تو سرزنش کرے۔ ٹوڈر مل فوراً اِس مُہم پر روانہ ہوا مگر مقابلہ ایسا کرارا تھا اور میر معز الملک جس کے نام سپہ سالاری تھی ایسا ناقص فن سپاہی تھا کہ فوج شاہی کو پیچھے ہٹتے ہی بن پڑی۔ ہاں ٹوڈر مل کو آفریں ہے کہ میدان سے نہ ٹلا اور اس ہار میں بھی گویا اس کی جیت ہی رہی۔ اکبر نے پہلی بار امتحان لیا تھا اُس میں پورا اترا۔ پھر تو اُس کے قلم کی طرح اُس کا تیغہ بھی جولانیاں کرنے لگا اور جس مُہم پر جاتا فرخندہ بختی، کامیابی، سہرا اُس کے سر باندھتی اور جانفشانی، سرخروئی کا جیمال اُس کے گلے ڈالتی چتوڑ۔ رنتھنبور، سورت کی فتحوں میں اُس نے اپنا لوہا منوا دیا۔ وقت کے پختہ کار۔ ذی وقار سپہ سالار میں شمار ہونے لگا۔

مگر سب سے بڑی مُہم جس نے اِس کی جانبازیوں کا سکہ بٹھا دیا اور جس میں اُس نے اپنی زندگی کے سات سال صرف کئے۔ بنگالہ کی مُہم تھی۔ خانِ زماں ۱۵۶۷ء میں کیفر کردار کو پہنچا اور منعم خان خان خاناں اِس کا نعم البدل قرار دیا گیا۔ مگر کچھ تو خان خاناں خود ہی صلح پسند تھا اور کچھ بنگالہ کے افغان شورہ پشت کی لڑائی نے طول کھینچا۔ آخر خدمتگزارانِ شاہی کا آٹھوں پہر کی دوڑ دھوپ دوا دوش سے ناک میں دم آگیا۔ جی چرانے لگے۔ اکبر کو اِن تمام ماجروں کی درپردہ خبر لگتی رہتی تھی۔ ارادہ ہوا کہ اِس وقت کسی ایسے قوی ہمت قواعد داں شخص کو بنگالہ بھیجے جو ساری سپاہ کو قواعد کے شکنجے میں کس کر اُن کی رگیں ڈھیلی کردے۔ ایسا شخص بجز ٹوڈر مل کے اور کوئی نظر نہ آیا۔

چنانچہ راجہ چند نامور جنگجو دلاوروں کے ساتھ بنگالہ کو چلا۔
بنگالہ میں راجہ ٹوڈرمل نے وہ وہ کارنمایاں کئے جن سے تاریخ کے صفحے ہمیشہ مزیّن رہیں گے۔ یہ اُسی کی خرد پژوہی تھی جس نے سارے بنگالہ میں اکبری خطبہ پڑھوایا۔ اس کے ایک ہاتھ میں تلوار ہے دوسرے میں تیغہ۔ مشاغل کثیرہ سے دم لینے کی فرصت نہیں ہے کہیں تو وہ شجاعت کے جوہر دکھاتا ہے کہیں کاغذی گھوڑے دوڑاتا ہے۔ جنگ کے وقت جہاں اڑ جاتا ہے وہاں سے ہٹنا نہیں جانتا۔ سپاہیوں کو ایسا بڑھاتا ہے ایسا للکارتا ہے کہ ہاری ہوئی لڑائی جیت لیتا ہے۔ یہ اُسی کا گروہ ہے کہ ترک وتاتاری سپاہیوں کو بے وفائی جن کی گھٹی میں پڑی ہے۔ کہیں دوستانہ فہمائش سے کہیں ڈراوے سے کہیں لالچ سے قابو میں رکھتا ہے۔ اِس کے متواتر فتوحات نے افغانوں کے چھکے چھڑا دئے۔ داؤد خاں آخری بار اپنے دل کے ارمان نکال کر قتل ہوا۔ صوبۂ بنگالہ پر اکبری پھریرا لہرانے لگا اور ٹوڈرمل فتح ونصرت کے نقارے بجاتا اقبال کے گھوڑے پر سوار دارالخلافت کو لوٹا اور وزارت کے خدمات انجام دینے لگا۔ معتمدالدولہ خطاب ہوا اور علم نے اور بھی اعزاز بڑھایا۔
اِسی اثناء میں خبر پہنچی کہ وزیر خاں کی بے عنوانیوں نے گجرات میں بدنظمی پھیلا رکھی ہے۔ ٹوڈرمل کو فوراً حکم ہوا کہ جاکر وہاں کے معاملات سدھارے۔ راجہ صاحب روانہ ہوئے اور وہاں پہنچ کر دفتر مالیات

وغیرہ کا معائنہ کرنے لگے۔ اِتنے ہی میں یہ شگوفہ کھلا کہ گجرات کے چند مفسدوں نے بغاوت مچادی۔ وزیر خاں کی ہمتیں چھوٹ گئیں۔ قلعہ بند ہوگیا اور ساتھ ہی قاصد دوڑائے کہ بھاگا بھاگ ٹوڈرمل کو خبر کریں۔ راجہ کو تاب کہاں کہ ایسی ڈراؤنی اور متوحش خبر سُنے اور ایک دم کی تاخیر کرے۔ اُسی وقت باغیوں پر دھاوا کیا۔ وزیر خاں کو مرد بنا کر قلعہ سے باہر نکالا اور دُشمنوں کو دولقہ کے تنگ میدان میں جالیا۔ وہاں خوب گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ حریفوں کی نیت تھی کہ راجہ کو ٹھکانے لگاویں۔ پہلے ہی سے گھات لگائے بیٹھے تھے مگر راجہ کی شیرانہ للکار اور برق دم تلوار نے اُن کا سب تانا بانا توڑ ڈالا۔ یہ مُہم مار کر دارالخلافت کو سُرخرو لوٹا اعزاز دوبالا ہوگیا۔

مگر وہ زمانہ ہی کچھ ایسا واقعہ خیز تھا اور وفادار کارپردازوں کا کچھ ایسا قحط تھا کہ ٹوڈرمل جیسے سرگرم خدمت گزار کو چین سے بیٹھنا ممکن نہ تھا۔ گجرات سے آیا ہی تھا کہ بنگالہ میں پھر زور شور سے غبار اُٹھا مگر اب کی آندھی کا رنگ کچھ اور ہی تھا۔ سپاہ اور سرداران سپاہ سپہ سالار سے باغی ہوگئے تھے۔ اکبر نے ٹوڈرمل کو روانہ کیا اور اس بلوے کو راجہ نے ایسی حکمت عملیوں اور پسندیدہ تدبیروں سے فرو کیا کہ

کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی - ورنہ حریف کب سر اُٹھانے سے باز رہتا۔ ہاں چند کینہ جو۔ سیہ باطن حاسدوں نے گھات لگائی تھی کہ موجودات کے وقت راجہ کا کام تمام کردیں مگر وہ ایک ہی سیانا تھا۔ ایسے حضرات کے پنجے میں کب آسکتا تھا۔ صاف نکل گیا۔

۱۵۸۲ء میں آگرے کو لوٹا۔ جاں نثاریوں نے سلطنت کا دیوان کل بنا دیا اور بائیس صوبوں پر اُس کا قلم دوڑنے لگا۔ اُس وقت سے اور زمانہ وفات تک ٹوڈر مل کو اپنے قلم کے جوہر اور اپنی مدبّرانہ جدّت کے کرشمے دکھانے کا خوب موقع ملا۔ صرف ایک بار یوسف زیئوں کے مہم میں راجہ مان سنگھ کی کمک کو جانا پڑا تھا۔

گو راجہ نہایت نیک طینت صاف باطن آدمی تھا مگر ۱۵۸۹ء میں کسی حریف نے اِس پر تلوار چلائی۔ خوش قسمتی سے راجہ بال بال بچ گئے۔ اس کا خمیازہ ایک سیہ بخت کھتری بچے کو اُٹھانا پڑا مگر گمان غالب ہے کہ یہ اشارہ کینہ خواہ امرا کی طرف سے تھا۔

مگر غالبًا یہ حملہ موت ہی کا تھا کیونکہ اس حادثے کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد راجہ کو اِس دُنیا سے رُخصت ہونا پڑا۔ ۱۵۹۰ء میں ظالم نے دوسرا حملہ بخار کی صورت میں کیا اور اب کی جان ہی لے کر چھوڑا۔

ٹوڈر مل پر مورخیں نے خوب رائے زنی کی ہے مگر جن لوگوں کو

اس سے حد درجہ کا اختلاف ہے۔ وہ بھی اس کو دعائے خیر سے یاد کرتے ہیں۔ وہ اکبر کے تمام امرا میں سب سے زیادہ سچّا اور معتمد خیر اندیش تھا بجز اُس کے اور کوئی امیر ایسا نہ تھا جو بے وفائی اور نمک حرامی کا داغ اپنے اوپر نہ لے گیا ہو۔ وہی ایک مرد ہے جس کی شہرت کی چادر بگلے کے پر کی طرح صاف ہے۔ متعصب مؤرخین نے دھبّے لگانے کی کوشش ضرور کی ہے مگر ناکام رہے ہیں۔

اُس کی کارگذاریوں کو بیان کرنا گویا اکبر کے زمانے کی تاریخ لکھنا ہے۔ ایسا کونسا صیغہ تھا دیوانی یا مالیات یا فوجی جس پر ٹوڈرمل کی کارفرمائیوں اور اصول تراشیوں نے اپنی مُہر نہ لگائی ہو۔ پہلے لشکر شاہی کوسوں میں اُترا کرتا تھا فیلخانہ کچھ یہاں ہے کچھ وہاں۔ توپ خانہ کا ایک حصّہ اِس سرے پر ہے تو دوسرا اُس سرے پر۔ الغرض بڑی بے ترتیبی رہا کرتی تھی۔ ٹوڈرمل کے قواعد پسند طبیعت نے پیادہ۔ سوار۔ توپخانہ رسد۔ بازار لشکر وغیرہ کے اُتارنے کے لئے تجویزیں نکالیں۔ اِسی سلسلے میں آئین داغ کی تشریح بھی ضروری معلوم ہوتی ہے۔ پہلے مستقل فوجیں نہ رکھی جاتی تھیں۔ امرا کو دربارشاہی سے جاگیریں مل جایا کرتی تھیں اور اُن کو حکم تھا کہ عندالطلب مع اپنی مقرّرہ فوج کے حاضر دربار ہوا کریں۔ اُمرا اس میں داؤں پیچ نکال کر اپنی جیب بھرتے۔

موجودات کے وقت تو گھوڑوں کی مقررہ تعداد اِدھر اُدھر سے مانگ جانچ کر دکھا دیتے جب یہ بلا سر سے ٹل جاتی تو پھر وہی روش اختیار کرتے۔ ٹوڈرمل نے اِس کا انسداد یوں کیا کہ موجودات کے وقت گھوڑوں پر داغ لگا دیا جاتا تاکہ جعلسازی کا کوئی موقع نہ رہے۔

سکندر لودی کے زمانے تک ہندو عموماً فارسی یا عربی نہ پڑھتے تھے۔ اِسے ملکش بدّیا کہتے تھے۔ راجہ نے تجویز کی کہ کل قلمروِ ہند میں یک قلم دفتر فارسی ہو جائیں پہلے تو اِس تجویز سے ہندو چونکے مگر ٹوڈرمل نے اِن کے دلوں پر یہ خیال اچھی طرح جما دیا کہ بادشاہِ وقت کی زبان رزق کی کنجی ہے۔ اگر اونچے مناصب اعزاز و وقار چاہتے ہو تو اِس زبان کے سیکھنے سے پا سکتے ہو۔ اکبر نے بھی سہارا دیا۔ تجویز چل نکلی اور چند سال کے عرصے میں بہت سے ہندو فارسی داں اور فارسی خواں بن گئے۔ اِس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ٹوڈرمل زبان اُردو کا مورثِ اعلیٰ ہے۔ کیونکہ یہ اُسی کی دور بینیوں کا ثمرہ ہے کہ فارسی ہندوؤں میں رائج ہوئی۔ فارسی الفاظ معمولی گھریلو بول چال میں مستعمل ہونے لگے اور اس طرح اُردو کی بنیاد ریختہ سے استوار ہوئی۔

ٹوڈرمل حقائق سیاق میں اپنے وقت کا مسلم الثبوت اُستاد تھا۔ پہلے شاہی دفتر حساب بالکل برہم تھا۔ کہیں کاغذات فارسی میں تھے

کہیں ہندی ہیں۔ ٹوڈرمل نے اِس پریشان دفتر کو بھی قواعد و ضوابط کے شیرازے میں کسا گو اس زُمرے میں خواجہ شاہ منصور مظفر خاں اور آصف خاں نے بھی بڑے بڑے کام کئے مگر ٹوڈرمل کی شہرت کی چمک دمک کے سامنے اِن کی کچھ وقعت نہ رہی۔ بہت سے نقشے اور فردوں کے نمونے آئین اکبری میں درج ہیں۔ آج بھی انھیں کی خانہ پُری کی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ اصطلاحوں میں بھی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔

مگر سب سے مہتم بالشان کام جو ٹوڈرمل کی یادگار ہے اور جس نے ساری مہذّب دنیا میں اِس کو فائننشل مدبّروں میں ممتاز درجہ دے رکھا ہے وہ اِس کا بندوبست مالگذاری ہے جس کو ہم باوجود خوف طوالت مجملاً بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

پہلے مالگذاری کا انتظام تخمین پر تھا۔ ٹوڈرمل کی تجویز سے کل ممالک محروسہ کی پیمائش کی گئی۔ جریب رسّی کی ہوتی تھی۔ اِس سے تر و خشک میں فرق ہو جاتا تھا۔ اِس لئے بانس کے ٹوٹوں میں لوہے کے حلقے ڈالکر جریبیں تیار ہوئیں۔ تمام آراضی خشک و تر مع اقسام زمین۔ کوہستان بیابان جنگل۔ ادسر۔ بنجر سب کو ناپ ڈالا۔ چند گانوں کا پرگنہ چند پرگنوں کی سرکار اور چند سرکاروں کا ایک صوبہ قرار پایا۔ بندوبست دہ سالہ مقرّر کیا گیا۔ (اب سی سالہ ہے)۔

محصول کا آئین یہ باندھا کہ غلّہ زمین بارانی میں نصف کاشتکار کا نصف بادشاہ کا۔ غیر بارانی میں ہر قطعہ پر چوتھائی اخراجات اور اُس کی خرید و فروخت کی لاگت لگا کر غلّہ میں ایک تہائی بادشاہی نیشکر وغیرہ کہ جنس اعلےٰ کہلاتے ہیں اور پانی نگہبانی اور کمائی وغیرہ کی محنت غلّہ سے زیادہ کھاتے ہیں۔ اِن پر ۱/۴، ۱/۵، ۱/۶ یا ۱/۷ حسب مراتب حق بادشاہی باقی حق کاشتکار اس کا دستور العمل آئین اکبری میں جنس وار لکھا ہوا ہے۔

عظمائے یورپ کی طرح ٹوڈرمل نے بھی اُصول پسندی و قواعد بندی کو اپنا شعار بنایا تھا۔ تمام صیغوں کے دفاتر کٹھ پتلی کی طرح اس کی اُنگلی کے اشارے پر کام کرتے تھے۔ ممکن نہ تھا کہ اکبر جیسا جوہر شناس بادشاہ اِن اوصاف کی قدر نہ کرتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بسا اوقات اِس کی بندشیں اور پابندیاں امرا کے دلوں کو جلاتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ مؤرخین عہد اکبری نے اُسے مُدمّغ اور مغرور بتایا ہے۔ مگر واضح رہے کہ جو لوگ باقاعدہ روش اختیار کرتے ہیں وہ اکثر غرضمند لوگوں کی افترا پردازیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ ٹوڈرمل کی سلامت روی تھی کہ وہ اپنی عزّت و آبرو سنبھالے رہا۔ ورنہ اُمرا نے تو اُس کی بدخواہی میں کوئی کسر نہ رکھی تھی۔

اُس کو مغرور و مُدمّغ کہنا واقعات پر خاک ڈالنا ہے۔ بنگالہ میں اُس نے سات برس تک تیغہ چلایا اور گو سارہی سپاہ اُسی کے ابرو کے اشارے پر

چلتی تھی مگر اُس نے کبھی سپہ سالاری کا دعویٰ نہیں کیا۔ اُس نے اپنے کو بلند کرنا سیکھا ہی نہ تھا اور اکبر جیسا جوہر شناس آقا اس کو نہ مِل جاتا تو متصدّیوں کا عہدہ اُس کے لئے معراج ترقی ہو کر رہ جاتا۔ اِس کسرنفسی کے ساتھ آزادی بھی مزاج میں ایسی تھی کہ بنگالہ میں جس وقت منعم خاں خانخاناں نے داؤد خاں سے صلح کی تو ٹوڈرمل نے اُس سے اختلاف کیا اور اپنی بات پر ایسا اڑا کہ صلح نامہ پر مُہر تک نہ کی۔ اِسی آزاد پسندی کو حاسدوں کی کم نظریوں نے نخوت و تکبر بنا دیا ہے۔ اِس آزادی کے ساتھ صاف گوئی بھی اُس کے حصے میں خوب آئی تھی۔ بادشاہ کے مُنھ پر بھی حق کہنے سے نہ چوکتا۔ سیکڑوں ڈاڑھی والے مُلّاؤں نے دربار کی ہوا میں آکر لامذہبی کا کلمہ پڑھنا اختیار کر لیا تھا۔ مگر راجہ مرتے دم تک راسخ الاعتقاد ہندو بنا رہا۔ جب تک ٹھاکر جی کی پوجا نہ کر لیتا دانہ نہ کھاتا۔ اِس سے بڑھ کر آزادیِ خیال کا اور کیا ثبوت مل سکتا ہے۔



راجه مان سنگهه

# راجہ مان سنگھ

دربار اکبری کے جادو طراز مصوّر نے کیا خوب کہا ہے" اِس عالی خاندان کے راجہ کی تصویر دربار اکبری کے مرقّع میں سونے کے پانی سے کھینچنی چاہیئے" بیشک! اور نہ صرف مآن سنگھ کی بلکہ اُس کے نامور باپ راجہ بھگوانداس دمشہور دادا راجہ پہاڑآمل کی تصویریں بھی اسی اعزاز اور سنگار کی مستحق ہیں۔ راجہ پہاڑامل وہ پہلا عالی دماغ وسیع نظر راجہ تھا جس نے ہزاروں برس کے مذہبی تعصبات مصالح ملکی پر قربان کر کے مسلمانوں سے ناتا جوڑا اور ۹۶۹ھ میں اپنی فرخندہ صفات لڑکی اکبر کی عروسی میں دی۔ امیر کے خاندان کچھواہہ کو آزاد خیالی اور بے تعصبی کے میدان میں پیشقدمی کرنے کا فخر حاصل ہے اور جب تک اِن اوصاف خجستہ کی وقعت زمانے کی نگاہوں میں رہیگی اس خاندان کے نام پر ہمیشہ اعزاز کی فاتحہ پڑھی جائیگی۔

مآن سنگھ امبیر میں پیدا ہوا اور اس کی طفولیت کا زمانہ اسی ملک کے پُرجوش وجنگجو باشندوں میں گذرا جن سے اس نے دلاوری و جانبازی کے سبق پڑھے مگر جب شباب نے دل میں جوش اور جوش

میں اُمنگ پیدا کی تو دربار اکبری کی طرف رُخ کیا۔ جو اُس زمانے میں اعزاز و وقار منصب و اقتدار کی کان سمجھا جاتا تھا۔ بھگوان داس کی خیر اندیشیوں اور جاں نثاریوں نے اُسے بارگاہ سلطانی میں عزت کی مسند پر بٹھا دیا تھا۔ اس کے ہونہار جوان بخت بیٹے کی جتنی آؤ بھگت ہونی چاہیئے اُس سے زیادہ ہوئی۔ اکبر اُس کے ساتھ پدرانہ شفقت سے پیش آیا اور جب ۱۵۷۲ء میں گجرات پر فوج کشی کی تو اُس نوجوان کنور کو ہمراہی کا افتخار بخشا۔ اس مُہم میں اُس نے وہ بڑھ بڑھ کر ہاتھ مارے کہ اکبر کی نظروں میں جچ گیا۔ اگر کچھ کور کسر تھی تو وہ اُس وقت پوری ہو گئی جب خان اعظم احمد آباد میں گھر گئے اور اکبر نے آگرے سے کوچ کر کے دو مہینے کی راہ سات دن میں طے کی۔ نوجوان کنور اس یلغار میں بھی ہمرکاب رہا۔ یہ گویا اُس کے تعلیم و امتحان کے دن تھے۔

اب وہ زمانہ آیا کہ معتمد خدمات کی دستار فضیلت اُس کے سر باندھی جائے۔ حُسنِ اتفاق سے موقع بھی جلد ہاتھ آیا۔ شولاپور کی مُہم مارے چلا آرہا تھا کہ راستے میں مقام کوملمیر پر رانا پرتاب سنگھ سے ملاقات ہوئی۔ رانا کچھواہہ خاندان پر اُس کی آزاد خیالیوں کے باعث سے تنا بیٹھا تھا کہ اِس نے راجپوتوں کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگایا۔ مان سنگھ پر طعن و تشنیع کے چُبھتے ہوئے تیر سر کئے جو اِس کے کلیجے کے پار ہو گئے۔ اِن زخموں کے

لئے سوائے انتقام کے اور کوئی شفا بخش مرہم نظر نہ آیا۔

مان سنگھ نے آگرہ میں آکر اکبر سے تمام ماجرا بیان کیا۔ اکبر عالی ہمت بادشاہ تھا۔ غضب میں آگیا۔ رانا پر فوج کشی کی تیاری کی۔ شہزادہ سلیم کے نام سپہ سالاری ہوئی اور مان سنگھ اس کا مشیر مقرر ہوا۔

شاہی فوج پہاڑوں جنگلوں کو طے کرتی رانا کے ملک میں داخل ہوئی۔ رانا پرتاپ سنگھ بھی اپنے بائیس ہزار جان نثار راجپوتوں کے ساتھ ہلدی گھاٹ کے میدان میں اڑا کھڑا تھا۔ یہاں خوب گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ خون کی ندیاں بہ گئیں۔ پہاڑوں کے پتھر شنگرف ہو گئے۔ میواڑ کے بیر مان سنگھ کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ ایسے جان توڑ توڑ کر حملے کرتے تھے کہ اگر سد سکندر بھی ہوتی تو شاید اپنی جگہ پر قائم نہ رہ سکتی۔ مگر مان سنگھ بھی شیر کا دل رکھتا تھا۔ اُس پر جوانی کا جوش۔ حوصلہ کہتا تھا ساری فوج کی نگاہیں تجھ پر ہیں۔ دکھا دے کہ راجپوت اپنی تلوار کا ایسا دھنی ہوتا ہے! آخر اقبال اکبری غالب آیا۔ رانا کے پیروں کے قدم اُکھڑ گئے۔ چودہ ہزار کھیت رہے۔ صرف آٹھ ہزار اپنی جانیں سلامت لے گئے۔ کہاں ہیں اسپارٹا کی تعریف میں ورقوں کے سیاہ کرنے والے۔ آئیں اور دیکھیں

کہ ہندوستان کے جودھا کیسے بے جگری کے ساتھ جان دیتے ہیں۔

رانا لڑائی تو ہار گیا مگر ہمت نہ ہارا۔ اُس کی ہیکڑی اُس کے گلے کا ہار بنی رہی۔ جب کبھی میدان خالی پاتا اپنے جانبازوں کے ساتھ قلعہ سے نکل پڑتا اور قرب و جوار میں طوفان برپا کرتا۔ اکبر نے کچھ دنوں تک طرح دی۔ مگر جب رانا کی زیادتیاں جادۂ اعتدال سے تجاوز ہوگئیں تو ۱۵۷۶ء میں اُس پر پھر فوج کشی کی تیاری کی۔ خود تو اجمیر میں آکر ٹھہرا اور مان سنگھ کو خطاب فرزندی کے ساتھ اس مہم کی سپہ سالاری پر ممتاز کیا۔ راجہ ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو کر دم کے دم میں گوکنڈا پر جا دھمکا۔ جہاں رانا اپنے بُرے دن کاٹ رہا تھا۔

رانا نے بھی اب کی مرنے مارنے کی ٹھان لی۔ جوں ہی دونوں فوجیں مقابل میں آراستہ ہوئیں اور ڈنکے پر چوٹ پڑی ووں ہی لڑائی دست بدست ہونے لگی۔ رانا کے غیور راجپوت ایسی بے جگری سے جھپٹے کہ شاہی فوج کے دونوں بازوؤں کو درہم برہم کر دیا مگر مان سنگھ جو قلب فوج میں تھا۔ استقلال سے ڈٹا کھڑا رہا۔ یکایک اُس کے تیور بدلے۔ شیر کی طرح گرجا۔ اپنے ساتھیوں کو للکارا اور بجلی کی طرح رانا کی فوج پر ٹوٹ پڑا۔ رانا غصے میں بھرا خم ٹھونک کر سامنے آیا اور

دونوں دلاور گتھ گئے۔ اوپر تلے کئی وار ہوئے اور رانا گھائل ہو کر پیچھے ہٹا۔ اس کے ہٹتے ہی اس کی فوج میں کھلبلی پڑ گئی۔ اُن کے قدم اُکھڑے تھے کہ مان سنگھ کے جہاں سوز تیغے نے ہزاروں کو خاک پر سُلا دیا۔ اُس کی شجاعت نے آج وہ کرتب دکھائے کہ اچھے اچھے جنگ آزما مغل جو بابری تلوار کی کاٹ دیکھے ہوئے تھے۔ دانتوں تلے اُنگلی دبا کر رہ گئے۔

اِس فتح نے کنور مان سنگھ کی سپہ سالاری کی دھوم مچا دی مگر ۱۵۸۱ء میں اس کی تلوار نے وہ تڑپ دکھائی کہ ہندی لوہے نے ولایتی کے جوہر مٹا دیے" ملک بنگال میں چند امرا نے شورش کی اور اکبر کے سوتیلے بھائی مرزا حکیم کو چڑھا لانے کی بندشیں باندھنا شروع کیں۔ مرزا باغ باغ ہو گیا اپنی فوج لے کر پنجاب کی طرف بڑھا۔ اِدھر سے راجہ مان سنگھ سپہ سالار بن کر اس کے مقابلے کو روانہ ہوئے۔ مرزا کا کوکا شادمان جو ایک دلیر آدمی تھا۔ اٹک کا محاصرہ کئے پڑا تھا۔ نقارے کی گھن گرج آواز کان میں پڑی تو چونکا مگر اب کیا ہوتا تھا۔ مان سنگھ سر پر آپہنچا تھا۔ اُس کی فوج طرفۃ العین میں تتر بتر ہو گئی اور شادمان خاک پر پڑا دکھائی دیا۔

مرزا نے جب یہ خبر بد سُنی تو سخت برہم ہوا۔ فوراً کمر ہمت چست

باندھی اور یہ سمجھ کر کہ اکبر بنگالہ کے معاملات میں اُلجھا ہوا ہے
لاہور تک دندناتا ہوا گھس آیا۔ مگر جوں ہی سُنا کہ اکبر دھاوا مارے اِدھر
چلا آرہا ہے اُس کے اوسان خطا ہو گئے۔ پہاڑوں کو پھاندتا۔ دریاؤں
کو پار کرتا۔ کابل کو بھاگا۔ مان سنگھ بھی بموجب حکم بادشاہی پشاور پر جا پڑے
اور کابل کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ اکبر اقبال کا لشکر لئے اُس کے
پیچھے پیچھے چلا۔

مان سنگھ بے خوف وخطر گھستا ہوا خُرد کابل تک جا پہنچا۔ اور
یہاں ٹھہرا کہ حریف میدان میں آئے تو دور دراز منزلوں کی تھکن دور
ہو۔ میرزا حکیم بھی بڑے شش و پنج کے بعد فوج لئے ایک گھاٹی سے
نمودار ہوا اور ہنگامۂ کارزار گرم ہو گیا۔ دونوں طرف سے دلاور خوب
دل توڑ کر لڑے گو مقابلہ بہت سخت تھا اور راجپوت ایسی ناہموار زمین
پر لڑنے کے عادی نہ تھے مگر مان سنگھ نے سپاہیوں کو ایسا اُبھارا اور ایسے
موقع موقع سے کمک پہنچائی کہ آخر میدان مار لیا۔ حریف بھیڑوں کی طرح
بھاگے۔ راجپوتوں کے ارمان دل کے دل ہی میں رہ گئے مگر دوسرے
دن سورج بھی نہ نکلنے پایا تھا کہ مرزا کا ماموں فریدوں پھر فوج لے کر
پہنچا۔ مان سنگھ نے بھی اپنی فوج اس کے مقابل کھڑی کی اور جھٹ پٹ
خون کی پیاسی تلواریں میانوں سے نکلیں اور توپوں نے گولے اُگلے

اور ریل پیل ہونے لگی۔ دو گھنٹے تک تیغے چلتے رہے۔ آخر دشمن پسپا ہوا اور مان سنگھ مظفر و منصور کابل میں داخل ہوا مگر اکبر کی کریم النفسی و دریا دلی پر ہزار آفریں ہے کہ اس ملک پر جو اتنی خونریزیوں کے بعد فتح ہوا تھا متصرف نہ ہوا بلکہ مرزا کی خطائیں معاف کیں اور اس کا ملک اُس کو دے دیا۔ پشاور اور سرحدی ملک کے اختیارات مان سنگھ کے سپرد کئے اور دو برس تک راجہ نے اِن خدمات کو بڑی فراست و متانت سے انجام دیا۔ اس ملک کا ایک ایک چپہ فتنہ وفساد کا اکھاڑا ہو رہا تھا۔ راجہ نے اپنی حکمت عملیوں اور جگرداریوں سے بڑے بڑے مفسدوں کی رگیں ڈھیلی کر دیں۔ اس کے ساتھ ہی اُس کے لطف و اخلاق نے شرفا پر تسخیر کا عمل پڑھا۔ غول کے غول سلام کو حاضر ہونے لگے۔ تاہم رعایا کو عرصے تک آسودہ نہ رکھ سکا۔ اُس کے سپاہی آخر راجپوت تھے، افغانوں کی بدعتیں اور اُس کے مظالم یاد کرتے تو بے اختیار پیشانیوں پر بل پڑ جاتے۔ اِس جذبہ میں آ کر رعایا کو ستاتے چنانچہ اس کی شکایتیں دربارِ شاہی میں پہنچیں۔ اور راجہ بہار بھیج دئے گئے۔

بنگالہ سلطنت اکبری کا وہ نازک حصہ تھا جہاں فاسد مادّہ مجتمع ہو کر پکا کرتا تھا۔ افغانوں نے اپنی تین سو برس کی عملداری میں اس

ملک پر خوب اچھی طرح تسلط جمالیا تھا۔ اکثر وہیں آباد ہو گئے تھے اور گو اکبر نے کئی بار اُن کا نشہ ہرن کر دیا تھا مگر اب بھی چند ایسے سر باقی تھے جن میں سلطنت کا سودا سمایا ہوا تھا اور وہ وقتاً فوقتاً فتنہ انگیزیاں کیا کرتے تھے وہاں کے ہندو راجاؤں نے بھی اُن کے ساتھ رشتہ اتحاد استوار کر رکھا تھا اور وقت ضرورت پر حق رفاقت ادا کرتے تھے۔

کنور مان سنگھ جاتے ہی راجہ پورن مل کندھوریہ پر چڑھ گیا اور اُس کے گھمنڈ کا قلعہ ڈھا دیا۔ راجہ سنگرام کو بھی تلوار کے گھاٹ اُتارا اور چند دیگر راجاؤں کو زیر کر کے بہار کو مفسدوں سے پاک و صاف کر دیا۔ اِن خدمات معتبرہ کے صلے میں اِس کو راجگی کا خطاب خلعت خاصہ اسپ بازیں زرّیں اور منصب پنجہزاری عطا ہوا۔

مگر ایسے اولوالعزم جوشیلے راجپوت سے کب خاموش بیٹھا جاتا تھا۔ ۱۵۹۰ء میں اُس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور اُڑیسہ میں داخل ہو گیا۔ اُن دنوں یہاں قتلو خاں افغان حکومت کرتا تھا۔ مقابلے پر آمادہ ہوا مگر حُسن اتفاق! اِسی اثناء میں افغانوں میں نا چاقی ہو گئی۔ قتلو خاں قتل ہوا۔ باقی سرداروں نے اطاعت اختیار کی اور کئی سال تک حلقہ بگوش رہے مگر یکایک اِن کی ہمتوں نے پھر سر اُبھارا۔ بادشاہی ملک پر چڑھ آئے راجہ کو بیکاری و بال جان ہو رہی تھی حیلہ ہاتھ آیا۔ فوراً

فوج لے کر بڑھا اور حریفوں کے علاقے میں نشان اکبری نصب کر دیا۔ افغان بڑے جوش و خروش سے مقابلہ کو آئے مگر راجپوت سورماؤں کے آگے ایک بھی پیش رفت نہ گئی۔ دم کے دم میں تتر بتر ہو گیا۔ بقیۃ السیف اپنی جان لے کر بھاگے اور بہار سے لے کر دریائے شور تک اقبال اکبری کا پھریرا لہرانے لگا۔

راجہ مان سنگھ جیسا جنگ آزمائی کے فن میں ماہر تھا ویسا ہی ملکداری کے اصولوں سے آگاہ تھا۔ اس کی تعمق نے صاف دیکھ لیا کہ یہ بیل منڈھے چڑھنے کی نہیں۔ یوں عملداری کبھی قائم نہ رہے گی۔ تاوقتیکہ ایک ایسا شہر آباد نہ کیا جائے جو دریائی حملے سے محفوظ ہو اور ایسے مرکزی مقام پر واقع ہو کہ وہاں سے چاروں طرف آسانی سے کمک بھیجی جا سکے آخر بڑی ردوکد صلاح و مشورہ کے بعد اکبر نگر کا بنیادی پتھر رکھا گیا۔ گویا جنگل میں منگل ہو گیا۔ چند ہی سالوں میں یہ شہر ایسی رونق پر ہو گیا کہ طلسمات کا عالم دکھانے لگا۔ یہ شہر آج راج محل کے نام سے مشہور ہے اور جب تک صفحہ ہستی پر قائم رہے گا اپنے بانی کا نام روشن کرتا رہے گا۔ اس شہر کے بیچوں بیچ میں ایک مستحکم و منیع قلعہ تعمیر کیا گیا اور پھر دوبارہ افغانوں کو سر اٹھانے کی جرأت نہ ہوئی۔ راجہ نے چار ہی پانچ سال کی جانفشانیوں میں سارے بنگال سے اکبر کے

قدموں پر سجدہ کرا دیا۔ خان زماں خان خاناں۔ راجہ ٹوڈرمل جیسے ناموروں نے بنگالہ پر جادو پھونکے مگر وہاں تسلط جمانے میں ناکام رہے۔ مورخین نے اس فضیلت کا تمغہ مان سنگھ کے نام پر لکھا ہے۔ ان صوبوں میں نوجوان جگت سنگھ نے بھی مردانگی کے خوب جوہر دکھائے اور ۱۵۹۹ء میں کوہستان پنجاب کی صوبہ داری سے سرفراز ہوا۔ مگر یہ سال مان سنگھ کے لئے نہایت منحوس تھا۔ اس کے دو بیٹے عین عنفوان شباب کے زمانے میں جبکہ نعمت زندگی سے متمتع ہونے کے دن آرہے تھے، اجل کا شکار ہوئے اور باپ کی امیدوں کی کمر توڑ گئے۔

مگر غالباً راجہ اب ان تمام نعمتوں سے حظ اٹھا چکا تھا جو قسام ازل نے اس کی پیشانی تقدیر میں لکھی تھیں۔ ان پر ملال جاں گداز سانحوں کے دو ہی سال بعد اس کے دل نے ایسے زخم کھائے جن سے وہ جانبر نہ ہو سکا۔

میواڑ کا رانا ابھی تک گوش گذاروں کے حلقے میں نہیں آیا تھا اور اکبر کے دل سے لگی ہوئی تھی کہ اسے اطاعت کا جوا پہنائے۔ ابھی تک جتنی فوجیں اس مہم پر گئی تھیں ناکام لوٹی تھیں۔ اب کی بار بڑے وسیع پیمانے پر تیاریاں ہوئیں۔ شہزادہ سلیم کے نام سپہ سالاری ہوئی اور راجہ مان سنگھ اس کے صلاح کار بنے۔ ہونہار جگت سنگھ بنگالہ میں باپ کا جانشین ہوا خوش خوش پنجاب سے آگرے آیا اور سامان سفر میں مصروف

تھا کہ یکایک دنیا سے اٹھ گیا۔ نہایت خوش رو۔ خوش اخلاق جوان تھا۔ کچھواہہ خاندان کے گھر گھر کہرام مچ گیا۔ مان سنگھ کو یہ خبر ملی تو اُس کی آنکھوں میں جگت سونا ہو گیا۔ دو بیٹوں کے زخم ابھی نہ بھرنے پائے تھے کہ یہ زخم کاری اور لگا۔ ہائے! جوان اور ہونہار بیٹے کی موت کا صدمہ کوئی اُس کے دل سے پوچھے! اکبر کو بھی اس جوانا مرگ کا سخت رنج ہوا۔ مرنے والے کو بہت عزیز رکھتا تھا۔ اُس کے بیٹے مہا سنگھ کو بنگالہ بھیجا۔ مگر کنور ابھی ناتجربہ کار تھا۔ افغانوں سے شکست کھائی اور سارے بنگال میں باغیوں نے خود سری کے نشان بلند کر دیئے۔ ادھر شہزادۂ سلیم کی طبیعت بھی رانا کی مہم سے اُچاٹ ہوئی۔ عیش و عشرت کا بندہ تھا۔ پہاڑوں سے ٹکرانا پسند نہ آیا۔ بلا بادشاہ کی اجازت کے الہ آباد کو لوٹ پڑا۔ راجہ بھی بنگالہ کو چلا کہ بغاوت کی آگ کو مفسدوں کے خون سے بجھائے مگر افسوس! بڑھاپے میں بدنامی کا دھبہ لگا جس کا راجہ کو نہایت سخت ملال ہوا۔ اکبر کو شبہہ ہوا کہ شاہزادۂ سلیم راجہ ہی کے اشارے سے لوٹا ہے گو اس کی کچھ بنیاد نہ تھی کیونکہ شہزادہ راجہ سے پہلے سے بدظن تھا۔ مگر راجہ کی کارگزاریوں و جاں بازیوں نے یہ شبہہ بہت جلد رفع کر دیا چندہی مہینوں میں بنگالہ پھر سربسجود ہو گیا۔ اور ۱۶۰۴ء میں اکبر کی قدردانی نے اُس کو شہزادۂ خسرو کی اتالیقی پر ممتاز کر کے ہفت ہزاری۔ چھ ہزار

سوار کے منصب پر سربلند کیا۔ اب تک یہ معراج کسی امیر کو میسر نہ ہوئی تھی۔ مگر بجز راجہ ٹوڈر مل کے دوسرا کون تھا جو وفاداری و جاں نثاری میں اُس کی برابری کر سکتا۔ اُس پر طرّہ یہ کہ وہ خود بھی ایک نامی گرامی خاندان کا چراغ تھا جس کے ساتھ بیس ہزار دلاور ہر دم پسینے کی جگہ خون بہانے کو تیار رہتے تھے مگر افسوس! فلک ناہنجار نے اِس اعزاز و اکرام سے زیادہ عرصہ تک دامن بھرنے نہ دیا۔ سنہ ۱۶۰۵ء میں اکبر نے اس دارِ فانی سے رحلت کی اور اُسی تاریخ سے مان سنگھ کا ستارہ بھی زوال میں آیا۔ تاہم جہانگیر کے عہد میں بھی اس نے نو برس تک عزت و آبرو کے ساتھ نباہا۔ اُس کی عقل سلیم و سلامت روی کی داد دینی چاہیئے کہ جیسا زمانہ دیکھتا تھا ویسا کرتا تھا اور جہانگیر کی بلند حوصلگی کو بھی آفریں ہے کہ گو راجہ کو خسرو کی فتنہ انگیزیوں کا بانی سمجھتا تھا مگر اس کا مرتبہ اور منصب سب بحال رکھا۔ خانِ خاناں اور مرزا عزیز مصلحت بیں نگاہیں نہ رکھتے تھے۔ اکبر کے بعد جب تک جئے زندہ درگور۔ ادبار کی مصیبتیں جھیلتے رہے۔

سنہ ۱۶۱۴ء میں جہانگیر نے ایک زبردست فوج خانِ جہاں کی سپہ سالاری میں مہم دکن پر بھیجی۔ راجہ مان سنگھ بھی جو کہ دربار کی سرد مہریوں و بے نیازیوں سے بیزار ہو رہا تھا اِس مہم کے ساتھ چلا کہ اگر ممکن ہو تو

بڑھاپے میں جوانی کا جوش دکھاکر بادشاہ کے دل میں جگہ پائے مگر موت نے یہ ارمان نکالنے نہ دیا۔ بیٹوں میں سے صرف بھاؤ سنگھ جیتا بچا تھا۔ جہانگیر نے اُسے مرزا راجہ کا خطاب دے کر چار ہزاری منصب پر ممتاز کیا۔

راجہ ملکداری و ملک گیری کے اصولوں سے خوب ماہر تھا اور اُن پر خوبی کے ساتھ کاربند ہونا جانتا تھا۔ جس مہم پر گیا سرخرو لوٹا۔ افغانستان کے لوگ ابھی تک اِس کا نام عزت سے لیتے ہیں۔ اِن فضائل کے ساتھ متواضع، ملنسار، خوش اخلاق، نیک محضر اور شگفتہ مزاج تھا۔ اس کی دریا دلی اُس زمانے میں بھی اپنی نظیر نہیں رکھتی تھی جس کی ایک روایت یوں بیان کی جاتی ہے۔ جس وقت دکن کو مہم جا رہی تھی، بالا گھاٹ میں غلہ کا ایسا قحط ہوا کہ ایک روپے کے آٹے میں بھی آدمی کا پیٹ نہیں بھرتا تھا۔ ایک دن راجہ نے کچہری سے اُٹھکر کہا کہ اگر میں مسلمان ہوتا تو ایک وقت طعام ہزار مسلمانوں کے ساتھ کھاتا مگر میں سب کی ریش سفید ہوں۔ مجھ سے سب بھائی برگ تنبول قبول کریں۔ سب سے اوّل خان جہاں لودی نے ہاتھ سر پر رکھ کر کہا مجھے قبول ہے۔ پھر اوروں نے بھی قبول کیا۔ راجہ نے یومیہ ایک سو روپیہ پنج ہزاری کا اور اِسی حساب سے اوروں کا صرفہ دعوت مقرر کیا۔ ہر رات کو ایک خریطہ میں ہر شخص کے پاس یہ روپیہ پہنچ جاتا۔ خریطہ پر اُس کا نام لکھا

ہوتا۔ سپاہیوں کو رسد پہنچے تک سستی قیمت پر جنس مہیا کرواتا حتیٰ کہ راہ میں مسلمانوں کے واسطے حمام اور کپڑے کی مسجد بنا کر ایستادہ کرواتا۔ اِس کو فیاضی کہتے ہیں اور دریا دلی اِس کا نام ہے۔ باغ و بہار میں شہزادی بصرہ کا قصہ پڑھئے اور اس کا موازنہ اس تاریخی روایت سے کیجئے۔

راجہ ٹوڈرمل کی طرح راجہ مان سنگھ بھی مرتے دم تک اپنے آبائی مذہب پر راسخ رہا مگر تعصب سے اِس کی فطرت کو ذرّہ بھر بھی لگاؤ نہ تھا۔ متعصب آدمی کا دورِ اکبری میں عروج پانا ناممکنات سے تھا۔ اکبر نے راجہ سے ایک بار کنایۃً تبدیل مذہب کی تحریک کی تھی۔ مگر راجہ نے ایسا برجستہ جواب دیا کہ بادشاہ کو خاموش ہو جانا پڑا۔ کتابوں میں بہت سے تذکرے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ راجہ لطیفہ گوئی۔ بذلہ سنجی و نکتہ فہمی میں بھی اوروں سے دو قدم آگے تھا۔ یہی اوصاف تھے جو اُس کے عروج کے زینے تھے۔

مگر ہماری نظروں میں تو اُس کی وقعت اس لئے ہے کہ اُس کے خاندان نے پہلے پہل متضاد عناصر میں اجتماع پیدا کرنے کی کوشش کی۔



اکبر اعظم

# اکبر اعظم

نام کو اللہ اکبر کیا ترے توقیر ہے
داخل ہر بانگ ہے شامل بہر تکبیر ہے

بابر کی اولوالعزمی نے چاروں طرف سے مایوس ہو کر پٹھانوں کی خانہ جنگیوں کی بدولت ہندوستان میں پانوٗں رکھنے کی جگہ پائی تھی کہ عام روایات کے بموجب محبّت پدری کے جوش میں اپنی جان بیٹے کی صحت پر قربان کی اور اُس کا لاڈلا بیٹا ابھی عروس سلطنت سے ہم آغوش بھی نہ ہونے پایا تھا کہ پٹھانوں کی متفرّق قوّت شیر خاں سور کی حوصلہ مندی کی شکل میں نمودار ہوئی ۔ ہمایوں کی اُس وقت عجب حالت تھی۔ سلطنت کو اگر دیکھو تو صرف چند شہروں پر محدود اور حکومت برائے نام تھی اور وہ خود اگرچہ اعلیٰ صفات انسانی سے آراستہ تھا مگر اُس میں اصابت رائے اور قوّت فیصلہ کی جو تمام سلطنت کے لئے ضروری ہے کمی تھی۔ گھر کی حالت دیکھو تو وہی خانہ جنگی جس نے پٹھانوں کو اُس کے باپ کی تدبیر اور شجاعت کا شکار بنایا تھا مسلط تھی

اور بھائی بھائی کا روادار نہ تھا۔ ارکین سلطنت اگرچہ پختہ کار اور شجاع تھے مگر اس خانہ جنگی کی بدولت وہ بھی ڈانوا ڈول ہو رہے تھے کبھی ایک بھائی کا ساتھ دینے میں اپنا فائدہ سمجھتے تھے اور کبھی دوسرے کی طرف ہو جاتے تھے۔ غرضکہ ادبار و تباہی کے تمام سامان جمع تھے اور ایسی حالت میں وہ شیر خاں کی پُر جوش اولوالعزمی اور پُر مغز خوش تدبیری اور راسخ ارادوں کے سامنے ٹھہرتا تو کیونکر۔ نتیجہ وہی ہوا جو پہلے سے نظر آ رہا تھا کہ شیر خاں کا اقبال بڑھا اور ہمایوں کا گھٹا اور بالآخر اُس کو سلطنت سے ہاتھ دھو کر فرار کو ذریعہ نجات سمجھنا پڑا۔ وہ وقت بھی عجب بیکسی کا تھا۔ کبھی گھبرا کر بیکانیر و جیسلمیر کے صحرائے بے آب میں ٹکراتا پھرتا تھا اور کبھی ضعیف سی اُمید پر جودھپور کے سنگلاخ میدانوں کی طرف بڑھتا تھا مگر دغا بازی دور ہی سے اپنا ڈراؤنا چہرہ دکھا کر قدم اُکھاڑ دیتی تھی۔ ادبار کی گھٹا ہر طرف چھائی ہوئی ہے۔ خون سفید ہو گیا ہے۔ بھائی بھائی کے کھانے کو دوڑتا ہے۔ برائے نام دوست بہت ہیں مگر دوستی کا وقت آیا اور انجان بنے اُمید کی جھلکی بھی کبھی کبھی نظر آ جاتی ہے۔ مگر فوراً ہی مایوسی کے غبار میں غائب ہو جاتی ہے۔ انتہا ہو گئی کہ جب راستہ میں اتفاقاً ہمایوں کا گھوڑا نظر اجل ہو گیا تو سخت دل تردی بیگ نے جو اُس کے

باپ کا رفیق اور خود اُس کا شیر تھا اس مصیبت زدہ بادشاہ کو اپنے اصطبل سے ایک گھوڑا دینے میں بھی انکار کیا جس کی وجہ سے اُس کو اونٹ کی ناہموار سواری نصیب ہوئی۔ ظاہر ہے کہ ایک تُرک کے لئے جو گویا ماں کے پیٹ سے نکل کر گھوڑے کی پیٹھ پر آنکھ کھولتا ہے اِس سے بڑھ کر کیا مصیبت ہو سکتی ہے۔ مگر غنیمت ہوا کہ اُس کے ایک رفیق ندیم خاں کو جو بیچارہ اپنی بوڑھی ماں کو اپنے گھوڑے پر سوار کر کے خود پیدل جا رہا تھا رحم آگیا اور اُس نے بیدریغ اپنا گھوڑا ہمایوں کی نذر کیا اور اُس کے اونٹ پر اپنی ماں کو سوار کیا۔ غضب یہ ہے کہ حالت تو ایسی ہو رہی ہے کہ رونگٹا رونگٹا دشمن معلوم ہوتا اور زمین و آسمان پھاڑ کھانے کو دوڑتا ہے مگر دشت غربت میں ہمایوں کی چہیتی بی بی حمیدہ بانو بیگم بھی ساتھ ہے اور وہ بھی اس شان سے کہ پورے دن ہیں اور ہر قدم پر خوف ہے کہ کہیں یہیں تکالیف مادری سے مقابلہ نہ کرنا پڑے۔ خیر خدا خدا کر کے یہ بینوا قافلہ سندھ کے بے گیاہ جنگلوں کو قطع کرتا ہوا امرکوٹ پہنچا اور وہاں پانوں رکھنے کو جگہ بھی ملی مگر گرگ صفت بھائی ہر طرف سے تاک میں لگے ہوئے تھے اور اس لئے اُس کو بی بی کو وہیں چھوڑ کر اُن کے مقابلے کے لئے روانہ ہونا پڑا۔ اُس وقت غریب حمیدہ بانو بیگم کی جو حالت ہوگی وہ خدا دشمن کو بھی نصیب نہ کرے۔

نہ تن پر کپڑا نہ پیٹ کے لئے کھانا۔ نہ کوئی مونس نہ غمخوار یہاں تک کہ شوہر بھی سربازی میں مصروف اُس پر اجنبی ملک اور اجنبی لوگ لیکن جس طرح کہ عین کشش باراں کے زمانے میں ہر طرف سے کالی گھٹائیں اُٹھ کر دم کے دم میں صحرائے بے گیاہ کو مرغزار بنا دیتیں یا دفعتاً گھنگھور اندھیرے میں دل بادل پھٹکر دنیا کو آفتاب کی تیز شعاعوں سے منور کر دیتے ہیں یا جس طور پر ع

ستارہ صبح عشرت کا شب ماتم نکلتا ہے

اُسی طرح بتاریخ ۵ رجب ۹۴۹ھ شب یکشنبہ وہ نیر برج سعادت طلوع ہوا جو بالآخر آفتاب ہو کر چمکا۔ اکبر جیسے عالم سراسیمگی میں پیدا ہوا تھا ایسی ہی بیچارگی میں اُس کا بچپن بھی گذرا۔ ابھی پورا ایک برس کا بھی نہ ہونے پایا تھا کہ مرزا عسکری کے دغا و فریب کے خوف سے ماں باپ کا ساتھ بھی چھوٹا اور بیرحم چچا کے ہاتھ پڑا مگر خدا بھلا کرے اُس کی بی بی سلطان بیگم اور اکبر کی دائیوں ماہم بیگم اور جی جی انگا کا کہ بچے کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے پائی۔ جب اکبر کی عمر دو سال سے کچھ اوپر ہوئی تو ہمایوں نے پھر کابل فتح کیا اور اُس کو باپ کا دیدار نصیب ہوا مگر ابھی پانچ برس کا نہ ہوا تھا کہ پھر ظالم کامران کے ہاتھ پڑ گیا اور جبکہ ہمایوں قلعہ کابل کے محاصرہ میں مصروف تھا ایک مورچے پر جہاں گولے بڑے زور و شور سے برس

رہے تھے اس ننھی سی جان کو لقمۂ اجل بنانے کے لئے بٹھا دیا گیا مگر شاباش ماہم کی وفاداری کو کہ وہ اُس کو اپنے گرد چھپا کر مورچے کی طرف پشت کرکے بیٹھ گئی ۔ ایسی پریشانی اور خانہ بربادی کی حالت میں ظاہر ہے کہ تعلیم تو کیا کسی بات کا بھی انتظام نہیں ہو سکتا اور اسی لئے اکبر باپ کے تربیت بار سایہ سے جدا ہو کر حرف آشنا بھی نہ ہو سکا لیکن جس طرح کہ اُس نے بیکسی کی گود میں پرورش پائی تھی اُسی طرح اُس کی تعلیم و تربیت بھی مصیبت ہی کے اعلیٰ مدرسے میں ہوئی ۔ اور یہ اُسی کا نتیجہ ہے کہ ابتدا ہی میں وہ اعلیٰ صفات انسانی اُس میں پیدا ہو گئیں جو کشمکش حیات میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے لازمی ہیں ۔ بارہ برس آٹھ مہینے کی عمر میں وہ سرہند کی لڑائی میں شریک ہوا اور ابھی پورے چودہ سال کا سن نہ ہونے پایا تھا کہ ہمایوں کی ناگہانی موت سے اُس کو یتیمی کا تمغہ اور سلطنت کا چھتر ملا اور اُس نے ۲ ربیع الثانی ۹۶۳ھ کو تخت شاہی پر قدم رکھا ۔ بادشاہ بچہ اور سلطنت برائے نام تھی مگر بیرم خاں اتالیق کی وفاداری و کاردانی ہر وقت آڑے آنے کے لئے موجود تھی ۔ بیرم خاں نے ابتدائی معرکوں میں نہایت ہی خوش تدبیری سے کام لیا اور خوب ہی دادِ شجاعت دی ۔ اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ افغانی سازشوں کا استیصال اور ہندوستان کا ایک معتدبہ حصہ سلطنت مغلیہ میں داخل ہو گیا * چار برس کی خودمختاری نے

---

* جلوس کے پہلے ہی سال میں جبکہ پٹھانوں کا مشہور جنرل ہیموں بقال گرفتار ہو کر آیا تو باوجود بیرم خاں کے اصرار کے اکبر کی حوصلہ مندی نے اپنی تلوار کو ایک بیکس قیدی کے خون سے رنگین کرنا پسند نہ کیا ۔

کچھ تو بیرم خاں کا سر پھرا یا اور ادھر ترقی عمر کے ساتھ اکبر نے بھی پر پُرزے نکالے اور کچھ باقی اُمراء کے دل میں حسد کی آگ مشتعل ہوئی اور اُنھوں نے طرح طرح پر بادشاہ کو اپنے ہاتھ میں عنانِ سلطنت لینے کے لئے آمادہ کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بیرم خاں کے اقبال کا چراغ گُل ہوا اور اکبر نے براہ راست حکومت شروع کی۔ تقریباً بیس سال تک اکبر ہندوستان کے مختلف صوبوں کے فتح کرنے اور اپنے باغی اُمراء کی سازشوں کو توڑنے اور بغاوتوں کے فرو کرنے میں مصروف رہا۔ یہاں تک کہ صوبۂ پنجاب و دہلی کے علاوہ جو اُس کو میراث میں ملے تھے۔ کابل۔ قندھار۔ کشمیر۔ سندھ۔ میواڑ۔ گجرات۔ اودھ۔ بہار۔ بنگالہ۔ اڑیسہ۔ احمد نگر۔ مالوہ اور خاندیس سب اُس کے دائرۂ حکومت میں داخل ہو گئے۔ گویا کہ مغرب میں اُس کی سلطنت کا ڈانڈا ہندوکش سے ملا ہوا تھا اور مشرق میں خلیج بنگالہ سے اور اگر شمال میں کوہ ہمالیہ سے ٹکراتا تھا تو جنوب میں مغربی گھاٹ سے۔ یہ فتوحات نہ صرف اکبر کے جنرلوں کی خوش تدبیری و کارданی کا نتیجہ تھیں بلکہ اُن میں پوری طور پہ اُس نے خود بھی اپنی دانائی۔ دور اندیشی۔ مستعدی۔ ان تھک جفاکشی۔ نڈر شجاعت اور تیز ہوشی کا ثبوت دیا تھا۔ جبکہ اُس کے جنرل دُور دراز مُہموں پر مصروف ہوتے تھے اور وہ ذرا بھی اُن کو بے عنوانیوں

کی طرف جھکتا ہوا دیکھتا یا اُن کی کوششوں میں سستی پاتا تھا تو دفعتاً بجلی کی طرح ایک ایک ہفتہ کی راہ ایک ایک دن میں طے کر کے اُن کے سر پہ جا دھمکتا تھا۔ مالوہ۔ گجرات اور بنگالہ کی یلغاریں آج تک اُس کی مستعدی و جواں مردی پر شہادت دے رہی ہیں۔ اُس کی خداداد طباعی نے فنون جنگ کو جہاں پایا تھا وہیں نہیں چھوڑا بلکہ اُن کی ہر ایک شاخ کو ترقی دی۔ اِس زمانے میں توپوں کے بنانے اور اُن سے کام لینے میں جس قدر ترقی ہوئی ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے مگر اکبر اُس قدیم زمانے ہی میں اس کی ضرورت سے واقف ہو گیا تھا اور اُس نے ایک ایسی توپ ایجاد کی تھی جو ایک شتابہ میں سترہ فیر کرتی تھی اور بعض ایسی توپیں بھی بنوائی تھیں جن کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ایک مقام سے دوسرے مقام کو آسانی سے لے جا سکتے تھے۔ ہندوستان میں قدیم سے سپہ سالاروں اور منصب داروں کی بے عنوانیوں کی بدولت فوج کی عجیب حالت ہو رہی تھی۔ سپاہیوں اور سواروں کی تنخواہوں کی بابت امراء کو بڑی بڑی جاگیریں دی گئی تھیں۔ لیکن اگر فوج کو دیکھو تو پتہ بھی نہیں اور اگر کچھ تھی بھی تو اُس کی عجیب حالت تھی۔ اگر کسی کے پاس زین ہے تو گھوڑا نہیں اور ہتھیار ہے تو لباس نہیں۔ اکبر نے سب سے پہلے اپنی نظر اصلاح اسی طرف متوجہ

کی اور سپاہیوں کو امراء کے دست حرص سے نکال کر علم شاہی کے سایہ میں لیا اور نقد تنخواہیں مقرر کر کے سپاہیوں کی چہرہ نویسی اور گھوڑوں کے داغ کے ذریعے سے اُن کو بدنیتی کے چنگل سے آزاد کیا اور اِس طور پہ ایک کارآمد اسٹینڈنگ آرمی کی بُنیاد ڈالی۔ گویا کہ اکبر ہی وہ پہلا شخص ہے جس نے ہندوستان میں قدیم فیوڈل سسٹم کو توڑ کر شاہی قوت و اقتدار کی بنیاد ڈالی۔ اگرچہ دُنیا کے عظیم الشان فاتحوں کی تاریخ میں بھی اکبر کو اپنی مُہموں کی کامیابی اور وسعت کے لحاظ سے ایک خاص امتیاز حاصل ہے۔ لیکن جس چیز نے کہ دراصل اکبر کو اکبر بنایا وہ اُس کے جنگی کارنامے نہیں ہیں بلکہ وہ مادّیات سے گذر کر روحانیات تک پھیلی ہوئی ہے۔ اکبر نے ابتدا ہی میں مدرسۂ مصیبت میں ایسی تعلیم نہ پائی تھی کہ وہ اپنے باپ کی تباہی اور کھڑے کھڑے ہندوستان سے نکالے جانے اور دربدر خاک بسر مارے مارے پھرنے سے نتیجہ خیز سبق نہ لیتا اور خواہ یہ صحیح ہو یا نہ ہو کہ اُس کے باپ کو شاہ طہماسپ صفوی نے ہندوستان کی واپسی کے وقت دو نصیحتیں کی تھیں۔ ایک تو یہ کہ افغانوں کو تجارت میں لگائے۔ دوسرے یہ کہ ہندوستان کی دیسی قوموں کو اپنا بنائے لیکن زمانے نے خود اُس کو بتا دیا تھا کہ اگر سلطنت کے

استحکام کی کوئی تدبیر ہو سکتی ہے تو وہ یہی ہے کہ اُس کی بنیاد بجائے تلوار کی باریک دھار کے رفاہ خلق اللہ کے ذریعے سے رعایا کے دلوں میں رکھی جائے۔ چنانچہ پہلے ہی سال اُس نے ایک ایسا حکم دیا جو انگلستان کی موجودہ ترقی کا راز ہے مگر جو صدیوں تک ٹھوکریں کھانے کے بعد اُس کو معلوم ہوا ہے۔ یعنے تجارت کو ہر قسم کے محصولات سے جو اُس کی ترقی کے خارج تھے آزاد کر دیا اور گو ابتدا میں اُس کی کمسنی اور بیدست و پائی کی وجہ سے اُس کا پوری طرح پر نفاذ نہ ہو سکا لیکن جب عنانِ حکومت اُس کے ہاتھ میں آئی تو وہ اُس کو جاری کر کے رہا۔ یہ تو وہ سلوک ہے جو اندرونی تجارت کے ساتھ کیا گیا۔ بیرونی تجارت کی روک بعض سنگین محصولوں سے ہوتی تھی جو میر بحری یا سی کسٹمس کے نام سے مشہور تھے۔ اکبر نے اِن محاصل میں بھی اس قدر تخفیف کی کہ وہ صرف برائے نام اڑھائی فی صدی رہ گئے۔ اور اس سے جیسا فائدہ کہ بیرونی تجارت کو پہنچا ہوگا وہ محتاج نہیں ہے۔ اگرچہ برٹش گورنمنٹ کا اوڑھنا بچھونا فری ٹریڈ یعنے آزادی تجارت ہے۔ لیکن اس زمانے میں بھی سی کسٹمس (محاصل بحری) کی شرح کہیں اکبر کی مقررہ شرح سے زیادہ ہے۔ تمام دنیا کے قانون کا یہ میلان رہا ہے کہ ابتدا میں نہایت سخت سزائیں چھوٹے چھوٹے جرائم کے

لئے بھی تجویز کی جاتی ہیں۔ لیکن جب تمدّن میں ترقی اور قوم کی حالت اصلاح پذیر ہو جاتی ہے تو سزاؤں میں بھی نرمی ہوتی جاتی ہے۔ ہندوستان میں بھی قدیم سے بعض وحشیانہ سزاؤں کا رواج چلا آتا تھا۔ مثلاً ہاتھ پاؤں کاٹنا یا اندھا کرنا وغیرہ لیکن اکبر کی روشن ضمیری نے ۶ سنہ جلوس میں اِن سزاؤں کو قطعاً موقوف کر دیا۔ قدیم زمانے میں یہ طریقہ تھا کہ جنگ میں جو جانباز قید ہوتے تھے وہ عمر بھر کے لئے آزادی کو خیرباد کہہ کر غلامی کا خلعت پاتے تھے۔ گو کہ سیاست کے لحاظ سے اِس کا کیسا ہی اثر پڑتا ہو لیکن انسانیت کے اعتبار سے یہ طریقہ جس قدر بے رحمی و ظلم سے مملو ہے وہ محتاج تصریح نہیں اور اِس لئے اکبر کے لئے یہ امر باعث فخر ہے کہ اُس نے ۷ سنہ جلوس میں یہ قاعدہ بنا دیا کہ جو شخص جنگ میں قید ہو وہ غلام نہ بنایا جائے اور موجودہ غلاموں سے بھی داغ غلامی اس حد تک دھو دیا کہ اُن کے خاص حقوق قرار دئے اور اُن کا نام بھی حیثیت کے ساتھ بدل کر چیلہ قرار دیا۔ اِسی کے ساتھ غلاموں کی عام خرید و فروخت کی بھی قطعاً ممانعت کر دی۔ اس کے دوسرے سال جاتریوں سے جو جابرانہ محصول لیا جاتا تھا اُس کو موقوف کیا اور یہ گویا کہ پہلی مرتبہ اس امر کا اعلان تھا کہ ہر شخص اپنے معتقدات مذہبی کے لحاظ سے آزاد ہے۔

اور اُن کے ادا کرنے میں کسی قسم کی روک ٹوک نہ ہونی چاہیئے۔
سنہ جلوس میں جو خیال کہ کسی قدر دبی زبان سے ظاہر کیا گیا تھا
اگلے سال خوب ہی زور شور سے اُس کا اعلان کیا گیا اور اکبر نے ایسا
کام کیا جس نے فی الواقع حاکم و محکوم کی حیثیت سلطنت کے
سامنے ایک کر دی یعنے جزیہ معاف کیا۔ جزیہ دراصل ایسا پُر رسوائی
ٹیکس نہیں ہے جیساکہ یوروپین مصنّفین نے سمجھا ہے بلکہ وہ مفتوح
قوموں سے فوجی خدمات سے مستثنیٰ ہونے کی وجہ سے لیا جاتا تھا تاکہ
جس طرح فاتح قوم امن عامہ کے قیام میں اپنی جان لڑاتی تھی اُسی طرح
مفتوح قومیں اپنے مال سے مدد کریں۔ اگر تاریخ ہندوستان
کا غور سے مطالعہ کیا جائے گا تو معلوم ہوگا کہ ابتدا میں سرکار کمپنی
بہادر جو دیسی ریاستوں میں بعض فوجیں امدادی یا کنٹنجنٹ کے
ناموں سے مقرر کر کے اُن کے اخراجات وصول کرتی تھی وہ بھی
ایک قسم کا جزیہ ہی تھا اور اس زمانہ میں بھی جو اخراجات فوجی یا شہنشاہی
کہلاتے ہیں اور جن میں اہل ملک کا کوئی دخل یا حصّہ نہیں ہوتا اُن پر
بھی خواہ کچھ ہی اُن کا نام رکھا جائے جزیہ کی تعریف صادق آسکتی
ہے۔ مسلمانوں میں قدیم سے کانس کرپشن کا طریقہ یعنے وقت پر ہر شخص
فوجی خدمت انجام دینے پر مجبور ہو۔ جاری ہے اور اس لئے اُس سے

مستثنیٰ ہونے کا اختیار ایک بہت بڑا حق تھا اور بصورت امکان غالباً بہت سے مسلمان بھی اُس سے فائدہ اُٹھاتے لیکن چونکہ اکبر کا منشا فاتح و مفتوح کا فرق اُٹھا کر اپنی سلطنت کو گویا کہ ہندوستان کی قومی سلطنت بنانا تھا جس کی اصلی ترقی کے لئے ہندوؤں کی تیز ہوشی و جرأت و ہمت کی بھی اُسی طرح ضرورت تھی جس طرح کہ مسلمانوں کی کاروائی اور شجاعت کی اور ملک کے امن و امان کی حفاظت اور توسیع میں ہندو بھی اُسی طرح حصّہ لینے کے مستحق تھے جس طرح کہ مسلمان۔ اس لئے جو امتیاز کہ جزیہ کے ذریعہ سے فاتح و مفتوح میں قائم کیا گیا تھا وہ در اصل باقی نہ رہا تھا اور جزیہ فی الحقیقت ایک جابرانہ ٹیکس ہو گیا تھا۔ اس لئے اکبر نے اُس کو موقوف کر کے رعایا کے تمام طبقوں کے مساوی ہونے کا اعلان کر دیا۔ گو کہ اکبر نے کبھی ہماری فیاض گورنمنٹ کی طرح اس امر کا اعلان نہیں کیا کہ اُمور سلطنت میں کوئی امتیاز خون یا رنگت یا مذہب کا روا نہ رکھا جائے گا لیکن عملی طور پر وہ تقررات میں خواہ ملکی ہوں یا فوجی یا مالی۔ عبداللہ اور رام داس میں کوئی فرق نہ کرتا تھا یہاں تک کہ کوئی منصب اور کوئی عہدہ ایسا نہ تھا جو ہندو مسلمان دونوں کے لئے یکساں کھلا ہوا نہ ہو۔ اُس کی بے تعصبی کا اِس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ مان سنگھ کو خود صوبۂ کابل کی گورنری کا اعزاز بخشتا جہاں کی آبادی بالکل مسلمان تھی۔ اُسی طرح مہمات فوجی اگر خان

خاناں اور خانِ اعظم کے سپرد ہوتے تھے تو بھگوانداس اور مان سنگھ کا درجہ بھی اُن سے کم نہ رہتا تھا اور اگر معاملات ملکی و مالی میں مظفر خاں کے مشورے پر عمل کیا جاتا تھا تو ٹوڈر مل کی رائے اُس سے بھی زیادہ وُقعت کی نظر سے دیکھی جاتی تھی۔ اِسی طرح اگر فیضی و ابوالفضل دربار کی زینت تھے تو بیربل بھی اکبر کے تاج کا ایک بے بہا جوہر تھا۔ یہی وہ چیز تھی کہ جس نے راجپوتوں اور برہمنوں کو سلطنت کا اس درجہ خیر خواہ بنا دیا تھا کہ وہ اپنے باغی ہموطنوں اور ہم مذہبوں کے مقابلے میں لڑنے اور جان دینے میں بھی تامّل نہ کرتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اکبر کو رات دن یہی فکر رہتی تھی کہ وہ ہندوستان کی مختلف قوموں کو ایک کرکے ایک زبردست قومی سلطنت قائم کرے اور اِسی لئے اُس نے قدیم راجپوت خاندانوں سے رشتہ داری کی بنیاد ڈالی تاکہ خاندان شاہی سے جو مغائرت تھی وہ یگانگت سے بدل جائے اور اِسی غرض سے ۲۳ جلوس میں اُس نے عبادت خانہ فتحپور سیکری میں اُن قابل یادگار مذہبی مناظروں کو قائم کیا جن میں ہر قوم و ہر مذہب کے علما حصّہ لیتے اور نہایت آزادی سے اپنے اپنے مذہب کے اصول کی تشریح کرتے تھے۔ اِن مناظروں کا یہ نتیجہ ہوا کہ اکبر جو زیور علم سے عاری تھا اُس بلندی خیال پر پہونچ گیا جو خاص فلاسفروں کا حصّہ ہے اور

جہاں سے ہر مذہب کے ابتدائی اصول یکساں حقّانیت کا رنگ لئے ہوئے آتے ہیں۔ اِن کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوا کہ جو لوگ شریک ہوئے تھے اُن میں وسعت نظر کی ترقّی کی وجہ سے تعصّب خواہ مخواہ کم ہو گیا۔ اس زمانے میں مذہب اسلام کی بھی صدیوں کی تقلید اور پیشوایانِ مذہب کی طبع آزمائیوں کی وجہ سے عجیب کیفیت ہو رہی تھی۔ سادگی جو اسلام کے لئے مخصوص ہے نام کو باقی نہ رہی تھی اور مذہب خارج از عقل اعتقادات اور بیجا توہمات اور تقلیدی تخیلات کا ایک مجموعہ ہو گیا تھا اور پیشوایان مذہب کی اُس سے بھی بدتر حالت تھی کہ گو ریاکاری کا جامہ ہر وقت زیب بدن رہتا تھا لیکن جاہ طلبی کے پیچھے احکام مذہبی کو بازیچۂ اطفال سمجھتے تھے اور جیسا موقع ہوتا تھا ویسا ہی فتویٰ دینے کے لئے موجود ہو جاتے تھے۔ اس کے متعلق مخدوم الملک اور صدر جہاں کے کارنامے اور دُنیا سازی قابل ملاحظہ ہیں۔ اِنھیں وجوہ سے اکبر کا ابتدائی جوشِ مذہبی جو اُسے اجمیر شریف کو پا پیادہ بھجاتا اور یا معین کے وظیفے میں دن رات مصروف رکھتا تھا ٹھنڈا ہوتا گیا اور وہ اِس نتیجے کے نکالنے پر مجبور ہوا تا وقتیکہ تقلید کے اِس مضبوط جال سے جس نے لوگوں کے اذہان کو مقیّد کر رکھا ہے نجات نہ ملے کسی پائدار اصلاح کی اُمید نہیں ہو سکتی۔

چنانچہ اُس نے ۲۴ سنہ جلوس میں علما سے اجتہاد کی سند حاصل کی[۱] اور مذہب الٰہی کی بنیاد ڈالی جو تمام مروّجہ مذاہب کے لوگوں کے لئے یکساں کھُلا ہوا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ کام ایک جاہل ترک کی قدرت اور منصب سے بالا تھا اور یہی وجہ سے اُس میں باوجود ابو الفضل و فیضی کی ذہانت آرائیوں کے جیسی کامیابی کہ چاہئے تھی نہ ہوئی بلکہ کھیل تماشہ بنکر رہ گیا۔ لیکن اُس کا اِتنا اثر ضرور ہوا کہ تعصّب کی بلا جو اہل ملک کو باہمی اختلافات کی وجہ سے سر نہ اُٹھانے دیتی تھی یک لخت رفع ہوگئی اور تنگ دلی کی جگہ وسعتِ خیال نے لوگوں کے دلوں میں لی۔ گو وہ خود علم سے بے بہرہ تھا لیکن وہ بخوبی جانتا تھا کہ تعصب کی بنیاد جہالت ہے اور اُس کے رفع اور اقوام ماتحت پر ٹھیک طور پر حکومت کرنے کی بہترین تدبیر یہ ہے کہ اُن کے حالات و علوم سے زیادہ واقفیت حاصل کی جائے اور اِسی لحاظ سے اُس نے خلفائے بغداد کی طرح ایک سر رشتۂ ترجمہ قائم کر کے بیسیوں سنسکرت کتابوں کے ترجمے

[۱] بعض انگریز مورّخوں مثل الفنسٹن و بلاک مین نے اس محضر کو بہت بڑی چیز سمجھا ہے مگر دراصل کوئی نئی بات نہ تھی خلفائے راشدین کے علاوہ خلفاء بنی اُمیّہ و بنی عباس کی امامت معاملات مذہبی میں مسلّم تھی اور اِسی طرح ترکوں میں شیخ الاسلام ابتک مجتہد کا مرتبہ رکھتے ہیں اور اہل تشیع میں کوئی زمانہ ایسا نہیں ہوتا جس میں چند مجتہد موجود نہ ہوں۔

شائع کرائے۔ ڈاڑھی منڈوائے۔ گائے کے گوشت اور لہسن پیاز کے
کھانے سے اجتناب کرنے اور غم کے موقعوں پر بھدرا کرانے کی غرض وغایت
بھی یہی تھی کہ حاکم و محکوم کے خیالات میں جو اختلاف ہے۔ وہ باقی نہ رہے۔
اکبر بخوبی جانتا تھا کہ وہ مسلمان تو ہے ہی اور اس لیے اگر اتحاد و یکجہتی قائم
کرنے کے لیے اُس کو ضرورت ہے تو ہندوؤں کی باتیں اختیار کرنے کی
ہے۔ قوموں اور مذاہب کے اختلافات رفع کرنے کے بعد اُس نے
اُن اصلاحوں کی طرف توجہ کی جو جماعت انسانی کی ترقی کے لیے
ضروری ہیں۔ نظام معاشرت کا دارومدار شادی بیاہ پر ہے اور
اُن سے متعلق آئے دن لڑائی جھگڑے پیدا ہوتے رہتے ہیں جو خاندانوں
کو تباہ کر دیتے یا خود شوہر یا زوجہ کی زندگی خاک میں ملا دیتے ہیں یا
اگر ابتدا میں کافی احتیاط نہ کی جائے تو اُن کا اثر موجودہ نسل سے
لے کر آئندہ نسل تک پہونچتا ہے۔ اکبر نے نہایت دُور اندیشی سے
قرار دیا کہ قریب کے رشتہ داروں میں شادیاں نہ ہوا کریں اور اِسی طرح
کسی کی شادی سن بلوغ کو پہونچنے سے پہلے یا اگر عورت کی عمر مرد سے
بارہ سال سے زیادہ ہو نہوا کرے اور ایک سے زیادہ عورت کرنا بھی
ناپسندیدہ ہے اور اِن امور کی نگرانی کی غرض سے یہ قاعدہ بنا دیا کہ تمام
شادیوں کا داخلہ دفاتر سرکاری میں رہا کرے۔ ہندوستان کی اعلیٰ قوموں

میں بیواؤں کے عقد ثانی کا رواج نہ ہونے سے نظام معاشرت میں جو خرابیاں پڑتی ہیں وہ محتاج بیان نہیں ہیں اور گو اس قسم کے اُمور میں قانونی مداخلت مناسب نہیں ہوتی لیکن اکبر نے اِس کے متعلق بھی دوراندیشی سے ایک نہایت مفید قاعدہ بنا دیا اور وہ یہ کہ اگر کوئی بیوہ عقد ثانی کرنا چاہے تو اُس کا روکنا داخل جرم ہوگا۔ اِن میں سے اکثر وہ اہم اصلاحیں ہیں جن کے لیئے آجکل کے سوشل رفارمر زور دے رہے ہیں مگر نقار خانے میں طوطی کی آواز کوئی نہیں سُنتا۔ ستی کی ظالمانہ اور قبیح رسم کے انسداد کا فخر بھی اکبر ہی کو حاصل ہے۔ اور وہ اپنے قوانین کا ایسا دلدادہ تھا کہ ایک مرتبہ جب راجہ جے مل مہم بنگالہ کے راستے میں بمقام جانسہ پہونچکر فوت ہوا اور اُس کے رشتہ داروں نے اُس کی رانی کو ستی ہونے پر مجبور کیا تو اکبر ایک طول طویل سفر کر کے خود جا پہونچا اور اُن کو اِس شرمناک فعل سے باز رکھا۔

تعلیم چونکہ غذائے روح ہے اور قومی ترقّی کا اُس پر دارومدار ہے اس لیئے اکبر نے اس طرف بھی پوری توجہ کی اور ایک مفید نصاب مقرر کر کے طریقہ تعلیم میں بھی ایسی مفید اصلاحیں کیں کہ بہ قول ابوالفضل کے جو بات برسوں میں نصیب ہوتی تھی وہ مہینوں میں حاصل ہونے لگی۔ لوگوں کی بداخلاقی کو محاصل آبکاری قائم کر کے کبھی اُس سے

اپنے خزانے کے بھرنے کا ذریعہ نہیں بنایا لیکن اُسی کے ساتھ بمقتضائے
ع۔ محتسب را درون خانہ چہ کار۔ یہ بھی تاکید کر دی کہ اگر کوئی چھپ
چھپا کر مسکرات کا استعمال کرے تو اُس سے مزاحمت بھی نہ کی جائے۔
اس زمانے میں محاصل آبکاری اور مسکرات پر جس قسم کے اعتراضات
ہمارے پولیٹکل رفارمر کیا کرتے ہیں وہ محتاج تشریح نہیں ہیں اور
نہ اس امر کے بیان کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ کس حد تک اکبر
کے انتظام پر عاید ہو سکتے ہیں۔ غلّہ اور مویشی اور صنعت و حرفت
کی ترقّی کے لئے اُس نے یہ تدبیر اختیار کی کہ ہر ایک شے کی ترقّی کا
ایک ایک امیر کو ذمّہ دار قرار دیا اور اس امر کی نگرانی کے لئے کہ
اُنھوں نے اپنے اس خاص فرض پر کس حد تک توجہ کی ہے جشن
نوروز کے بعد خاص محلات شاہی میں ایک بڑا بازار لگتا تھا جس میں
خود بادشاہ اور اُمرا اور محل کی بیگمات خرید و فروخت کرتی تھیں اور
ہر شخص اپنا کمال دکھانے کی کوشش کرتا تھا۔ اِس بازار کو
موجودہ نمائشوں کی ابتدا سمجھنا چاہیئے۔ دوسرے طور پر بھی اُس کو
تجارت کی ترقّی کا بیحد خیال تھا جس کا ایک شمّہ دلّالوں کا تقرّر بھی
تھا غربا کی امداد کے لئے پائے تخت کے باہر دو عالیشان مکان پورہ
اور دھرم پورہ کے نام سے تعمیر کرائے جن میں سے ایک مسلمانوں

کے لئے مخصوص تھا اور دوسرا ہندوؤں کے لئے۔ اور اُن میں ہر وقت ہر شخص کو تیار کھانا ملتا تھا اور جب اُن مکانوں میں جوگی زیادہ جمع ہونے لگے جس سے دوسروں کی حق تلفی ہوتی تھی تو اُن کے لئے ایک علیحدہ مکان بنام جوگی پورہ تعمیر کرایا گیا۔ انتظام سلطنت کی خوبی کا دارومدار چند اُمور پر ہے۔ شخصی آزادی۔ اَمن و امان۔ محصولوں کا معتدل ہونا اور مقررہ شرح سے لیا جاتا۔ اور راستوں کا درست حالت میں رہنا۔ اگر اس اعتبار سے اکبر کے عہد پر نظر ڈالی جائے تو وہ بھی کسی سے پیچھے نہ نظر آئے گا۔ شخصی آزادی کی تو یہ کیفیت تھی کہ ہر شخص کو اختیار تھا کہ جو مذہب چاہے اختیار کرے۔ اور اس میں یہاں تک اہتمام تھا کہ اگر کوئی ہندو لڑکا بچپن میں مسلمان ہو جائے تو سن بلوغ پر پہونچنے کے بعد اُس کو اپنے آبائی مذہب پر عود کرنے کا پورا اختیار ہوگا اور اسی طرح اگر کوئی ہندو عورت کسی مسلمان کے گھر میں پائی جائے تو وہ اپنے ورثا کے پاس پہونچا دی جائے۔ اُس زمانے میں پادری لوگ شخصی آزادی کے بھیس میں جو سلوک مختلف قوموں کے یتیم بچّوں سے کرتے یا بعض صورتوں میں زنانہ مشن کے ذریعے سے جاہل عورتوں کو اُن کے آبائی مذہب سے متنفر کر کے خانہ بربادی کا موجب ہوتے ہیں اُس کے بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ قیام امن و امان کے متعلق بھی اکبر نے نہایت

دانشمندانہ احکام جاری کئے تھے جیساکہ اشخاص جرائم پیشہ و وارد و صادر کی نگرانی ہر محلہ میں ایک ایک شخص کے بنام میر محلہ ذمہ دار انتظام قرار دئے جانے اور کوتوال اور چوکیداروں کے فرائض اور ذمہ داریوں سے معلوم ہوتا ہے اور خلق اللہ کی دادرسی اور اُن کے نزاعات باہمی کے تصفیہ کے لئے قاضی و میر عدل مقرر تھے جن میں سے قاضی کا کام تحقیقات۔ اور میر عدل کا فیصلے صادر کرنا تھا اور سب کی نگرانی کے لئے ایک اعلیٰ عہدہ دار بنام صدر جہاں مقرر تھا۔ فرائض کی اِس تقسیم سے ظاہر ہوتا ہے کہ انصاف رسانی کا کام کیسی احتیاط سے ہوتا ہوگا اور لطف یہ ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ شخص بلا کسی خرچ کے عدالت ہائے شاہی سے فیضیاب ہوسکتا تھا کیونکہ اُس زمانے میں نہ کوئی قانون اسٹامپ تھا اور نہ گروہ وُکلا۔ محصولات کے متعلق اکبر کی جو توجہ ابتدا سے تھی اُس کا ذکر پہلے ضمناً آچکا ہے۔ اُس نے نہایت استقلال اور دانشمندی کے ساتھ اُن تمام محصولات کو قطعاً موقوف کر دیا جو قومی ترقی میں حارج یا لوگوں کی دل آزاری کا موجب تھے اور جو محصول باقی رکھے اُن کے متعلق بھی صاف و صریح قاعدے بنادئے۔ انتظام مالگزاری کے متعلق بہت ضروری اصول یہ ہیں کہ اراضی زیر کاشت کا رقبہ معیّن ہو۔ لگان چند سال کی اوسط پیداوار کے لحاظ سے بہ لحاظ اقسام اراضی ایسی معتدل شرح

سے معیّن کیا جائے جس میں بُری اور بھلی دونوں قسم کی فصلوں کا لحاظ رہے اور کاشتکاروں کو علاوہ اپنی مقبوضہ زمین کے اراضی اُفتادہ کے لینے کی بھی ترغیب ہو۔ یہ اصول تو نفع سرکاری کے لحاظ سے ضروری ہیں لیکن کاشتکاروں کا فائدہ اس میں ہے کہ زمین کے متعلق اُن کو حق مقابضت حاصل ہو کہ ترقی اراضی و کاشت کی ترغیب ہو اور لگان کی شرح معیّن اور معلوم ہو کہ عمال کو زیادہ ستانے کا موقع نہ ملے اور اس قدر نرم ہو کہ اُس کو ہر سال کچھ پس انداز ہوتا رہے تاکہ بصورت خرابی فصل بسر اوقات بہ آسانی ہو سکے۔ یہی اصول تھے جن پر ٹوڈرمل اور مظفر خاں کا بندوبست مالگذاری مبنی تھا اور وہی اس وقت تک قوانین مالگذاری کی بنیاد ہیں۔ ضلع کا حاکم مال عامل گزار کہلاتا تھا جس کو وصول زر مالگذاری کے متعلق بلحاظ حالات فصول وسیع اختیار ہوتے تھے اور صوبہ کا گورنر سپہ سالار ہوتا تھا۔ علم اعداد جس کو اس زمانہ میں اسقدر ترقی ہوئی ہے کہ گورنمنٹ آف انڈیا نے ایک مستقل سررشتہ مقرر کیا اور جملہ دفاتر سرکاری کا بڑا وقت ترتیب نقشہ جات میں گزرتا ہے اور جو نتائج کہ اُن سے مستخرج ہوتے ہیں اُن سے نگرانی و انتظام میں بڑی مدد ملتی ہے اس کی بنیاد بھی ہندوستان میں اکبر ہی نے ڈالی تھی اور جو کیفیتیں کہ افسران مفصلات روزانہ اور ہفتہ وار اور ماہانہ پیش کرتے تھے اُن سے حکّام صدر کو نگرانی کا

عمدہ موقع ملتا تھا۔ اب اگر آسانی راہ کے اعتبار سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ محاصل راہداری تو قطعاً موقوف کر دئے گئے تھے اور حسن انتظام کی وجہ سے ہر شخص بے خوف ایک مقام سے دوسرے مقام پر جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ ابتدائی عہد میں آگرہ سے اجمیر شریف تک ایک پختہ سڑک جس پر کوس کوس بھر کے فاصلے پر چھوٹے چھوٹے مینارے اور کنوئیں اور ہر منزل پر سرائیں جہاں کھانا تیار ملتا تھا اکبر کی خوش اعتقادی نے بنوا دی تھیں۔ مگر ۴۸ سنہ جلوس میں رفاہ خلق اللہ کے خیال نے اس حکم کو عام کر دیا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اکبر کو اس کی تکمیل کا موقع نہیں ملا۔ ۱۲ سنہ جلوس میں ایک قحط پڑا۔ اور اکبر نامہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبر نے غربا و محتاجوں کی امداد کا خاص انتظام کیا اور اس کام کے لئے خاص خاص عہدہ دار بھی مقرر کئے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس مبارک طریقے کا بانی بھی جس نے برٹش گورنمنٹ کے روشن زمانے میں متعدد فمین کمیشنوں کی بدولت بہت کچھ ترقی کی ہے اکبر ہی تھا۔ ہم نے صرف اُن بڑے بڑے صیغوں کا مختصر سا حال لکھا ہے جن کا اثر خلق اللہ پر پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ باقی جتنے صیغے مثل دارالضرب و خزانہ و شتر خانہ و فیلخانہ وغیرہ وغیرہ تھے اُن کے آئین بھی نہایت باریک نظری سے مدوّن کئے گئے تھے۔ غرضکہ سلطنت کا کوئی صیغہ ایسا نہ تھا جس کو اکبر کی دانشمندی

سے فائدہ نہ پہونچا ہو۔ اب اگر سرکاری انتظامات سے گذر کر اکبرؔ کی پرائیویٹ لائف (نجی کی زندگی) کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ عجب محبّت کے قابل آدمی تھا۔ اُس کی خوش مزاجی کی یہ کیفیت تھی کہ کیسا ہی خشک آدمی اُس کی مجلس میں شریک ہو ممکن نہیں کہ باغ باغ نہو جائے۔ مروّت ورحم کا تو وہ پتلا تھا۔ جس شخص کی بھی اُس تک رسائی ہو جاتی عمر بھر کے لئے فارغ البال ہو جاتا تھا اور جس دشمن نے سرِ اطاعت اُس کے سامنے جھکایا اُس کا دریائے عفو وکرم جوش میں آیا اور اُس کو اپنے اُمراءِ خاص میں داخل کیا۔ کھانا صرف ایک وقت کھاتا تھا اور خواہشاتِ نفسانی کا بھی پابند نہ تھا۔ گو پڑھا لکھا نہ تھا مگر اپنا اکثر وقت علمی مجلسوں اور ہر قسم کی کتابوں کے سُننے میں صرف کرتا تھا اور علما کی خواہ وہ کسی قوم اور مذہب کے ہوں بڑی قدر کرتا تھا۔ اُس میں مردم شناسی کا مادّہ اعلیٰ درجے کا تھا۔ اور انتخاب کی یہ خوبی تھی کہ جو شخص جس کام کا اہل ہوتا تھا وہی اُس کے سپرد کیا جاتا تھا اور اِسی وجہ سے اُس کے منصوبے بہت کم ناکامی کی شکل دیکھتے تھے اور اُس کی بدولت وہ وہ جواہر بے بہا اُس کے دربار کی زیب وزینت کا باعث تھے جو وکرماجیت کے نورتن کو مات کرتے تھے۔ شکار کا بیحد شوق تھا اور ہاتھیوں کا تو عاشق ہی تھا اور فن موسیقی کے رموز سے بھی ناواقف نہ تھا۔

تعمیرات عامہ کی طرف بھی بہت توجہ تھی اور بہت سے عالیشان قلعے اور عمارتیں آج تک اُس کے حُسن مذاق اور شاہانہ اولوالعزمی پر شہادت دینے کے لئے موجود ہیں۔ قدرت نے جیسا حُسن سیرت سے آراستہ کیا تھا۔ ویسا حُسن ظاہری بھی عطا فرمایا تھا۔ جہانگیر نے بیٹے کی محبت اور نقاش کے قلم سے اُس کی تصویر تُزک جہانگیری میں کھینچی ہے جس کا ترجمہ ناظرین کی دلچسپی کے لئے درج ذیل کیا جاتا ہے۔

"دربلند بالا۔ قد میانہ۔ گندمی رنگ۔ آنکھوں کی پتلیاں اور بھویں سیاہ۔ رنگت گوری تھی مگر اُس میں پھیکا پن نہ تھا۔ نمکینی زیادہ تھی۔ شیر اندام۔ سینہ کشادہ۔ چھاتا اُبھرا ہوا۔ دست و بازو لمبے۔ بائیں نتھنے پر ایک مسّہ چنے کے برابر جس کو ماہرین فن قیافہ شناسی بہت مبارک سمجھتے تھے۔ آواز بلند اور گفتگو میں ایک خاص لوچ اور قدرتی نمکینی تھی اور سج دھج میں عام لوگوں کو اُن سے کچھ مناسبت نہ تھی۔ شکوہ خدا داد اُن کے چہرہ سے ظاہر تھی۔"

آخر عمر میں نالائق اولاد نے اِس محب وطن بادشاہ کو بہت سے داغ دئے اور وہ اِسی رنج و غم میں ۲۰ رجمادی الآخر ۱۰۱۴ھ مطابق ستمبر ۱۶۰۵ء کو دُنیائے فانی سے عالم جاودانی کو سدھارا اور سکندرہ کے عالیشان مقبرے میں اپنے پُرعظمت کارنامے ہمیشہ کے لئے

یادگار چھوڑکر دفن ہوا۔ اگرچہ اکبر میں چندر گپت کی شجاعت اور اولوالعزمی اشوک کی نیک نفسی اور انضباط قوانین۔ اور وکرما جیت کی شان و شوکت اور قدردانی علم وہنر جمع تھے۔ لیکن اُس نے جس کام کی بنیاد ڈالی تھی وہ ایک شخص کے بس کا نہ تھا اور چونکہ اُس کے جانشینوں میں کوئی اُس کا ہم خیال پیدا نہ ہوا اِس لئے وہ پوری طرح پر بار ور نہ ہوسکا لیکن پھر بھی اکبر کی پُرسوز کوششیں بیکار نہ گئیں اور یہ اُنھیں کی برکت تھی کہ ہندو مسلمان باوجود حکّام وقت کی بے پروائی کے نہایت سلوک اور اتفاق سے کئی صدیوں تک رہے اور اب اِس زمانے میں بھی جبکہ اجزائے اختلاف ہر طرف سے جمع ہوکر ایک پُرسوز سیلاب کی شکل میں نمودار ہو رہے ہیں اور قومی اتحاد کی کشتی کو ڈبونے کے لئے بھائیں بھائیں کرتے بڑھ رہے ہیں۔ اگر کوئی اُمید ہے تو اُسی کے مبارک نام سے ہے جو ہمارے بیڑے کو پار لگانے میں اسم اعظم کی تاثیر دکھائے گا۔ پس اے ہندو مسلمانو! خواب غفلت سے بیدار ہو اُٹھو اور سکندرہ کی راہ لو تاکہ اُس کے مقدّس مزار پر اگر ہم دو پھول چڑھائیں تو اے ہندو بھائیو! تم بھی تھوڑا پانی ڈالکر اُس کی روح کو خوش کرو۔ کیا عجب ہے کہ اُس کے فیضان سے ہمارے بے بنیاد اختلافات رفع ہوکر پھر یکجہتی کی صورت پیدا ہوجائے۔ افسوس

اور شرم کا مقام ہے کہ برٹش گورنمنٹ باوجود اجنبی ہونے کے
اپنے آپ کو اُس کا قائم مقام اور اُس کی تقلید کو باعثِ فخر سمجھے
لیکن تم اپنے محبّ وطن قومی بادشاہ کی قیمتی میراث کی طرف آنکھ
اُٹھا کر بھی نہ دیکھو!!!

۷۷

# رنجیت سنگھ

ہندوستان کے فرمانروایانِ سلف میں شاید ہی کوئی ایسا ہوگا جس پر یوروپین مؤرّخوں اور محقّقوں نے اس قدر شرح و بسط سے بحث کی ہو جس قدر پنجاب کے مہاراجہ رنجیت سنگھ پر۔ اُن کے عادات و اخلاق۔ اُن کی انصاف پروری اُن کی دلاوری۔ اُن کے حسنِ انتظام۔ اُن کی پُرجوش مہمان نوازی اور ایسے ہی دیگر صفات کے متعلّق روزانہ اتنی روایتیں مشہور ہوتی رہتی تھیں کہ یورپ کے منچلے مصنّفوں اور سیّاحوں کے دل میں خود بخود ایک جوش پیدا ہوتا تھا کہ چلکر ایسے عجیب اور باکمال شخص کو دیکھنا چاہئے۔ اُن میں سے جو آتا وہ مہاراج کے اوصافِ حمیدہ کا ایسا گہرا اثر دل پر لیکر جاتا جو دفتر کے دفتر تعریفوں سے رنگنے پر بھی ختم نہ ہوتا تھا۔ یورپ میں سراج الدولہ میر جعفر اور شاہانِ اودھ کے حالات پڑھ پڑھ کر یہ عام خیال ہو گیا تھا کہ ہندوستان میں یہ صلاحیت ہی نہیں کہ اعلےٰ رتبہ کا مدبّر اور منتظم پیدا کر سکے۔ زیادہ سے زیادہ وہاں کبھی کبھی لٹیرے سپاہی البتہ نکل کھڑے ہوتے ہیں اور بس۔ مگر مہاراج کی ذات نے اس عام خیال کی بڑے زور کے ساتھ تردید کر دی اور اہلِ یورپ کو دکھا دیا کہ نامور اشخاص پیدا کرنا کسی خاص ملک یا قوم

کا حصّہ نہیں ہے بلکہ ایسے نفوس بابرکات ہر قوم اور ہر زمانہ میں وجود پذیر ہوتے رہتے ہیں اور باوجودیکہ رنجیت سنگھ کے اکثر سوانح نگاروں پر اس عام متعصبانہ خیال کا اثر باقی ہے اور اُن کا مطالعہ کرنے میں وہ اس خیال کو علیٰحدہ نہیں کر سکے تاہم جو کچھ مہاراج کی ذاتی خوبیوں نے اُن کے قلم سے بزور لکھوالیا ہے وہ اس امر کو پایۂ ثبوت تک پہنچا دیتا ہے کہ اٹھارہویں صدی میں ایسا انسان بجز نپولین بونا پارٹ کے اور کوئی نہیں پیدا ہوا۔ بلکہ اُن حالات اور واقعات کو دیکھتے ہوئے جن کے دائرہ میں رنجیت سنگھ کو کام کرنا پڑا یہ کہہ سکتے ہیں کہ شاید نپولین میں بھی وہ قابلیتیں نہ تھیں جو مہاراج کی ذات میں مجتمع ہو گئی تھیں۔ فرانس ایک آزاد اور خود مختار ملک تھا۔ وہاں کے فلاسفروں نے عوام میں جمہوری خیالات پھیلا دئے تھے۔ نپولین کو زیادہ سے زیادہ اتنا ہی کرنا پڑا کہ موجودہ اور تیار مصالحہ کو مجتمع کرکے اُن سے ایک عمارت کھڑی کر لی۔ اِس کے برعکس ہندوستان صدیوں سے پامال ہو رہا تھا اور رنجیت سنگھ کو اُن لوگوں سے سابقہ پڑا جو مدتہائے دراز تک ہندوستان کی قسمتوں کے مالک رہ چکے تھے۔ بیشک بہ حیثیت ایک فوجی سپہ سالار کے نپولین کا رتبہ اعلیٰ تر ہے مگر ملکی انتظام و انصرام کی قابلیتوں میں مہاراج رنجیت سنگھ اس سے بہت آگے بڑھے ہوئے ہیں۔ اگرچہ اُن کی قائم کردہ سلطنت اُن کے بعد زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکی تو اس میں اُن کا کچھ قصور نہیں۔ اس کی جوابدہ وہ باہمی نفاق وہ آپس کی

پھوٹ ہے جس نے ہمیشہ ہندوستان کو ذلیل و خوار کیا اور جسے مہاراجہ رنجیت سنگھ بھی دلوں سے نکالنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔

رنجیت سنگھ کی پیدائش اور طفولیت کا زمانہ بڑی ہلچل اور حرکت کا زمانہ تھا۔ وہ سکھ قوم جو گرو گوبند سنگھ کے دل و دماغ سے نکلی تھی اور جسے کئی شہیدوں نے بیش بہا خون سے سینچ کر جوان کیا تھا۔ دلاوری اور سپہگری کے میدان میں اپنے پھریرے لہرا چکی تھی۔

سنہ ۱۷۶۴ء سے جبکہ سکھوں نے سرہند کا قلعہ جیتا اور جسے احمد شاہ ابدالی بھی اُن سے نہ چھین سکا۔ سکھوں کا اختیار اور اقتدار روبہ عروج تھا مگر وہ قومیت کا جذبہ جو چند دنوں کے لئے سکھوں میں موجزن ہو گیا تھا رخصت ہو چکا تھا۔ فرقہ بندیوں کی گرم بازاری تھی۔ متعدد مسلیں قائم ہو گئی تھیں اور اُن میں شب و روز خونریزیاں ہوتی رہتی تھیں جس خاص مشن کو لیکر سکھ قوم پیدا ہوئی تھی وہ مشن اگرچہ کسی حد تک پورا ضرور ہوا تھا مگر قبل اس کے کہ مشن میں پوری کامیابی ہو سکھوں میں خود منتشر و متفرق کرنے والی طاقتوں نے زور پکڑ لیا اور اُن کا خاص مشن نظر انداز ہو گیا۔ اٹھارہویں صدی کے آخر میں حالت بہت نازک ہو رہی تھی۔ خود سری اور سرکشی کا راج تھا۔ جس شخص نے اپنے گرد لٹیرے سپاہیوں کی ایک جماعت قائم کر لی وہ اپنے کسی کمزور پڑوسی سردار کو نیچا دکھا کر اپنی چند روزہ طاقت کی بنیاد ڈال دیتا تھا اور جلد یا دیر میں اُسے خود کسی اپنے سے زیادہ

طاقتور شخص کے لئے جگہ خالی کرنا پڑتی تھی۔ نہ کوئی قانون تھا نہ کوئی باقاعدہ انتظام امن واماں۔ یتیم بچوں کی طرح جائے پناہ ڈھونڈتے پھرتے تھے۔ ہر ایک گاؤں کا راجہ جدا۔ قانون جدا اور دُنیا جدی تھی۔ اخوت سکھ مذہب کی ایک نمایاں صفت ہے اور وہ صرف سکھ مذہب کی بلکہ ہر ایک مذہب میں انسانی اخوت کی تعلیم موجود ہے۔ یہ اعلیٰ اور پاک تعلیم ہے۔ کسی انسان کو کیا حق ہے۔ وہ دوسروں کو اپنا محکوم بنائے اور اُن کے وجود سے خود فائدہ اٹھائے۔ دُنیا کی برکات میں ہر شخص کا حصہ برابر ہے۔ جس وقت تک سکھ قوم نے اِس اخوت کی قدر کی، اُسے برتا اور اُس پر عمل کیا اُس وقت تک اُن کی طاقت زور پکڑتی گئی مگر جب غرور اور نفسانیت طمع اور نمود نے اُن کے دلوں میں گھر کر لیا۔ دولت اور اختیار کی چاٹ پڑی تو اخوت کو ناقابل برداشت صدمہ پہنچا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہتیں قائم ہوگئیں اور بھائیوں میں خونریزیاں ہونے لگیں۔ گرو گوبند سنگھ نے اخوت کا جوش پیدا کیا۔ مگر اُس باہمی ہمدردی کا جوش نہ پیدا کر سکے جو اخوت کے لئے محافظ جان کا کام کرتی۔

رنجیت سنگھ ۱۷۸۰ء میں بمقام گوجرانوالہ پیدا ہوئے۔ یہ عام خیال ہے کہ اُن کے والد ایک مفلس زمیندار تھے۔ مگر یہ خیال درست نہیں۔ اُن کے والد مہان سنگھ سکر چکیا مسل کے سردار اور بڑے مقتدر شخص تھے۔ اُن کا ۲۷ ہی سال کے سن میں انتقال ہوگیا۔ رنجیت سنگھ اُس وقت کل ۱۰ سال کے تھے اور اُسی

بچپن میں اُن کے سر پر خطرناک ذمہ داریوں کا بوجھ آ پڑا اگر اکبر کی طرح رنجیت سنگھ بھی انصرام و انتظام کی قابلیت ماں کے پیٹ سے لیکر نکلے تھے اور اسی سِن میں اپنے والد کے ساتھ کئی مہموں میں شریک بھی رہ چکے تھے۔ ایک روز ایک خونریز لڑائی میں وہ بال بال بچ گئے۔ گویا اُن کی طفولیت میدان جنگ ہی میں گذری، اور اُسی محاربات کے مدرسہ میں اُن کی تعلیم ہوئی۔ آٹھ دس سال کا بچہ۔ اُس کی آنکھوں سے ردوکشت و خون کے نظارے گذرے ہوں گے اپنے کُنبہ کے بڑے بوڑھے آدمیوں کو چوپال میں بیٹھ کر کسی پڑوسی سردار پر حملہ کرنے کے منصوبے باندھتے۔ یا کسی طاقتور حملہ سے بچنے کی تدبیریں سوچتے دیکھا ہوگا اور یہ مشاہدات اس کے اثر پذیر دل پر کیا کچھ نقش نہ ہو جاتے ہونگے۔ بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ یہ کمسن لڑکا ذہین اور طبّاع تھا۔ اُسے جو کچھ سبق ملے وہ اُس کے وجود کا جزو بن گئے، اُس نے جو کچھ دیکھا سبق گیر نگاہوں سے دیکھا۔ ۱۲ سال کی عمر میں وہ سکرچکیا مسل کے سردار قرار دئے گئے۔ اور بیسویں سال میں کچھ اپنی جوانمردی اور کچھ شطرنج بازی سے لاہور کے راجہ بن بیٹھے۔ اس کی کیفیت دلچسپی سے خالی نہیں ۱۷۹۸ء میں احمد شاہ ابدالی کا پوتا اپنے جدّ بزرگوار کے فتوحات پر تصرّف کرنے کے ارادہ سے ہندوستان پر چڑھا اور لاہور تک چلا آیا۔ اُس کا قصد تھا کہ یہاں مقیم ہو کر ملحق مقامات سے خراج وصول کرے مگر اسی اثنا میں اُسے اپنے وطن میں شورش پیدا ہونے کی خبر ملی۔ وہ گھبرا کر لوٹا۔

جہلم طغیانی پر تھا - بار برداری کا انتظام خراب اُس کی کئی توپیں اُس کے ساتھ نہ جا سکیں، حُسنِ اتفاق سے رنجیت سنگھ کہیں قریب ہی تھے۔ شاہ زماں سے ملے تو اُس نے کہا کہ اگر تم میری توپیں فارس بھجوا دو تو اُس کے صلہ میں تمھیں لاہور دیدوں - رنجیت سنگھ نے یہ شرط بڑی خوشی سے منظور کر لی - حالانکہ شاہ زماں کا یہ وعدہ مہمل تھا - اور اگر رنجیت سنگھ خود طاقتور نہ ہوتے تو اُس سے مطلق فائدہ نہ اُٹھا سکتے - مگر اُس کے ذاتی وقار اور اثر پر شاہ زماں کا یہ وعدہ قندِ مکرر ہو گیا - اُس کے تھوڑے ہی دنوں بعد رنجیت سنگھ نے امرتسر پر بھی قبضہ کر لیا اور اب اُس کی شوکت اور طاقت کے آگے سب سکھ مسایں ماند پڑ گئیں۔

رنجیت سنگھ پر یورپین سوانح نگاروں نے خود غرضی - دغا - بیرحمی اور بیوفائی کے فتوے صادر کیئے ہیں - کسی حد تک ان کے فتوے درست ہیں مُلکی معاملات میں بزرگانِ سلف نے بھی کسی حد تک شطرنج بازی اور سختی کی اجازت دی ہے جسے دوسرے الفاظ میں بیوفائی اور بے رحمی کہہ سکتے ہیں - بلا ان تدابیر کے سلطنت کا نیا پودھا کبھی جڑ نہیں پکڑ سکتا - رہی خود غرضی یہ الزام ہر فرد بشر پر بالعموم اور ہر ایک راجہ پر بالخصوص عائد ہو سکتا ہے۔

آج تک کسی قوم میں کوئی ایسا بادشاہ نہیں ہوا اور شاید مستقبل میں بھی نہ ہو سکے جس نے کسی قوم پر محض نیک نیتی - فلاح انسانی یا رفاہ عام کے خیال سے حکومت کی ہو بلکہ ہمیں اس کے ماننے میں بھی تامل ہے کہ آیا یہ نیک نیتی

خود غرضی پر غالب بھی تھی۔ خود غرضی حکومت کے مفہوم میں شامل ہے۔ یہ بھی خیال رہے کہ رنجیت سنگھ کے قول و فعل اور طرز سیاست کو موجودہ معیار سے پرکھنا انصاف سے بعید ہے۔ سو برس گذرے جبکہ رنجیت سنگھ نے لاہوری دربار کے اسٹیج پر اپنے پارٹ کھیلے اور ان سو سالوں میں تہذیب و روشنی اخلاق اور حسن معاشرت نے بڑی تیزی سے قدم بڑھائے ہیں ہر ایک زمانہ میں میعار اخلاق تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ وہ فعل جو آج سے سو برس پہلے جائز سمجھا جاتا تھا آج ناجائز ہے اور ممکن ہے کہ اکثر افعال جنہیں ہم آج بے جھجھک کرتے ہیں۔ آج کے سو سال بعد شرمناک خیال کئے جانے لگیں۔ سو سال کا زمانہ تو بہت ہوتا ہے۔ ابھی پچیس سال سے زیادہ نہیں گذرے کہ ہولی کے دنوں میں ہر ایک شہر کے عشرت پسند رؤسا کو طائفوں کے ساتھ نشہ میں مست گلیوں کی سیر کرتے ہوئے دیکھنا ایک معمولی نظارہ تھا۔ مگر اب یہ شرمناک خیال کیا جاتا ہے بلکہ کوئی شریف آدمی آج شراب پی کر پبلک میں نکلنے کی جرأت نہ کریگا۔ ان قیود کو مدنظر رکھ کر اگر رنجیت سنگھ کے قول و فعل کو جانچیں تو ہم یقیناً اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ فرمانروایانہ معیار سے دیکھتے ہوئے اُن سے بہت کم فعل ایسے سرزد ہوئے جن پر اُنھیں نادم ہونا پڑے۔ مگر فرمانروایانہ معیار کی شرط ہے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ اعلےٰ درجہ کے مستقل مزاج۔ جفاکش اور

مآل اندیش شخص تھے۔ اُن کی ہمتوں نے ہار ماننا سیکھا ہی نہ تھا۔ جفاکشی کا
یہ حالم کہ اکثر اُن کے دن گھوڑے پر سوار گزر جاتے۔ ذہانت کا مادہ اُن میں
بڑا زبردست تھا۔ اگرچہ کتابی علم سے بالکل بے بہرہ تھے۔ مگر مکالمہ اور مشاہدے
سے اپنی استعداد یہاں تک بڑھالی تھی کہ یورپ کے سیاحوں کو بھی
اُن کی وسعت معلومات پر حیرت ہوتی تھی۔ مردانگی اُن کی سرشت میں داخل تھی۔ اور مردانگی
کے تذکرے۔ بالخصوص سپاہیانہ مردانگی کے واقعات انھیں بہت مرغوب تھے۔
یورپ کی نئی ایجادوں اور تحقیقاتوں سے واقف رہنے کی انھیں جستجو رہتی تھی۔
اُن کا لباس بہت سادہ اور مصنوعات سے خالی ہوتا تھا اور گو خود حسین نہ تھے
بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ کریہ منظر تھے۔ اور قدوقامت کے لحاظ سے
بھی بہت خوش نصیب آدمیوں میں نہ تھے مگر اُن کے حُسن صفات نے اِن ظاہری
عیوب کو ڈھک لیا تھا۔ اُن کے چہرے پر چیچک کے بدنما داغ تھے اور
ایک آنکھ بھی اِسی کی نذر ہوچکی تھی۔ مگر باوجود اس کے اُن کے چہرہ پر
ایک جلال برسا کرتا تھا۔ فقیر عزیز الدین دربار لاہور میں وزارت خارجیہ کے
عہدہ پر مامور تھے۔ ایک بار وہ سفارت لیکر لارڈ بینٹنگ کی خدمت میں آئے
تھے۔ دوران گفتگو میں لارڈ ممدوح نے فقیر سے پوچھا کہ مہاراج کی کون سی
آنکھ جاتی رہی ہے۔ فقیر نے اِس کے جواب میں کہا "جناب! میرے آقا
نامدار کے چہرہ پر وہ جلال ہے کہ ہم میں سے کسی کو اتنی جرات ہی نہیں ہوئی

کہ اُن کی طرف آنکھ اُٹھا سکے ؟ جواب اگرچہ مبالغہ سے خالی نہیں ہے۔ تاہم اس سے اُس رُعب کا پتہ چلتا ہے جو اراکین دربار کے دلوں پر چھایا ہوا تھا۔

رنجیت سنگھ بے حد منتظم تھے۔ اِن میں کوئی ایسی صفت۔ کوئی ایسی طاقت کوئی ایسی کشش تھی جو بڑے بڑے سرکش اور خود پسند آدمیوں کو بھی اُن کی اطاعت پر مجبور کر دیتی تھی۔

انسان کو پرکھنے کا اُن میں بڑا زبردست ملکہ تھا اور اُن کی کامیابی بڑی حد تک اسی خاصہ پر مبنی تھی۔ کون شخص کس کام کو بوجوہ احسن انجام دے سکتا ہے اِس کا تصفیہ کرنا معمولی کام نہیں ہے۔ شاہجہاں، جہانگیر اور نگ زیب بڑے بڑے بادشاہ تھے۔ مگر ان کی سلطنت میں آئے دن بغاوتیں اور سازشیں ہوتی رہتی تھیں اور صوبہ داروں کی تہدید کے لئے اکثر دہلی سے فوجیں روانہ کرنا پڑتی تھیں۔ رنجیت سنگھ کے عہد سلطنت میں ایسے واقعات شاذونادر ہوتے تھے۔ یہ حیرت انگیز ہے کہ اس خانہ برانداز زمانہ میں بھی اُن کے ملازمین کتنی وفاداری سے اُن کی خدمت کرتے تھے۔ مہاراج مذہبی بے تعصبی کی زندہ مثال تھے اور بالخصوص ملازمین شاہی کے انتخاب میں وہ تعصب کو مطلق دخل نہ دیتے تھے۔ اس پالیسی میں وہ اکبر سے بھی بڑھے ہوئے تھے۔ سکھوں کو مسلمانوں سے کوئی فیض نہ پہنچا تھا۔ بلکہ مسلمانوں نے اِن کا وجود مٹانے میں کوئی کوشش باقی نہیں رکھی تھی۔ مگر رنجیت سنگھ اِن تنگ خیالیوں سے بالکل

پاک تھے ۔ اُن کے دربار میں کئی معزز عہدوں پر مسلمان مامور تھے ۔ فقیر
عزیز الدین ۔ نور الدین ۔ امام الدین سب کے سب اونچے عہدوں پر تھے۔
برہمن ۔ کھتری ۔ راجپوت غرض ہر ایک فرقے سے اُنھوں نے انصرام سلطنت
میں مدد لی ۔ انسانی جوہر اُنھیں جہاں نظر آیا اُس کی قدر کی راجہ دینا ناتھ، دیوان
محکم چند، رام پال، معزز دیوان ساون مل یہ دربار لاہور کے اراکین خاص میں تھے اور
بڑی بڑی مہموں پر مامور تھے، رنجیت سنگھ کی دقیقہ رس نگاہوں نے تاڑ لیا تھا
کہ اگر انصاف اور سلامت روی کے ساتھ حکومت کرنی ہے تو بلا اُن فرقوں
کی امداد کے کام نہ چلے گا جو مدت ہائے دراز سے انتظام سلطنت میں حصہ
لیتی آئی ہیں ۔ اس وقت تک سکھوں نے بجز میدانِ جنگ کے انصرام سلطنت میں
اپنی قابلیتوں کا ثبوت نہیں دیا تھا ۔ چنانچہ فوجی عہدے زیادہ تر سکھوں کے
ہاتھ میں تھے اور دیوانی اور مال کے مسلمانوں، برہمنوں، کھتریوں اور کایستھوں
کے ہاتھ میں تھے ۔ مگر جنگی مہمات کے سپہ سالار اکثر متذکرہ بالا اراکین ہی
قرار دئے جاتے تھے ۔ اُس وقت سے اب تک سکھ راجاؤں نے اِس
بے تعصبی کو نبھانا اپنا اصول قائم کر رکھا ہے ۔ بالخصوص نابھا ۔ پٹیالہ، کپورتھلہ
اور جھیند میں جو سکھوں کی سب سے بڑی ریاستیں ہیں ۔ یہ وسیع خیال نمایاں
طور پر نظر آتا ہے ۔ البتہ اسلامی ریاستوں میں کیفیت اس کے برعکس ہے ۔
بہ استثنار حیدر آباد دکن کے جہاں عہدہ وزارت پر ایک ہندو صاحب مامور

ہیں اور شاید کوئی ایسی ریاست نہیں ہے جہاں اس مذہبی وسیع الخیالی سے کام لیا گیا ہو۔ ہندوؤں کو متعصب اور تنگ خیال کہنا آسان ہے، مگر واقعات اِس کے بالکل مخالف ہیں؛ ابھی حال ہی میں مہاراج جے پور نے عہدہ وزارت پر ایک مسلمان صاحب کو مشرف کیا ہے۔ کیا یہ ہندوؤں کی تنگ خیالی ہے۔

اُس زمانہ میں اکثر کم نگاہ فرمانرواؤں کا یہ قاعدہ تھا کہ جب حریف پر غالب آجاتے تو یا تو اُسے خاک میں ملا دیتے یا اُس کے ساتھ ایسی سختیاں کرتے جس سے اُس کے دل میں انتقام اور حسد کی آگ بھڑکتی رہتی تھی۔ رنجیت سنگھ کی پالیسی اِس معاملہ میں انسانیت اور شرافت کی پالیسی تھی جو اگرچہ موجودہ رواج کے مطابق معمولی طرزِ عمل ہے۔ مگر اس پُرآشوب زمانہ کا خیال کرتے ہوئے بہت سی غیر معمولی بات تھی۔ وہ اپنے حریف پر غالب آنے کے بعد اُس کے ساتھ ایسے حُسنِ سلوک اور خاطرداری سے پیش آتے کہ وہ اُن کی دوستی کا دم بھرنے لگتا تھا۔ اور سختیوں کے بجائے اُسے مراعات اور الطاف کی زنجیر میں باندھتے تھے۔ ملتان پر جب کئی محاصروں کے بعد اُن کا قبضہ ہوا اور نواب مظفر خاں اپنے پانچوں بیٹوں اور تین سو عزیزوں کے ساتھ قلعہ کے دروازہ پر مارا گیا تو رنجیت سنگھ نے نواب کے دو باقی لڑکوں کو دربار میں بلا لیا۔ اُن کے وظیفے مقرّر کر دئے اور دربار میں اُن کے لئے اعزاز کی جگہ مخصوص

کردی۔ اِسی طرح محمد یار خاں ٹوانہ اور دیگر فرقوں کے مغلوب سرداروں کے ساتھ اُنھوں نے شرافت کا برتاؤ قائم رکھا۔ ایسا شاید ہی کبھی ہوا ہو کہ دشمن پر غالب آنے کے بعد رنجیت سنگھ نے اُسے زندہ دیوار میں چنوا دیا ہو یا سرِ عام تہِ تیغ کرا دیا ہو یا اُس سے کینے کا بخار نکالا ہو۔ بسا اوقات اُنھیں مغلوبوں پر راجہ کی نظرِ عنایت زیادہ ہوتی تھی جنھوں نے اِن کا مردانہ اور جانبازانہ مقابلہ کیا ہو، وہ خود دلیر تھے اور دلیروں کی قدر کرتے تھے۔ جودھ سنگھ وزیر آباد کا ایک سکھ سردار تھا۔ راجہ کسی وجہ سے اس پر ناراض تھے اور اُس کی سرزنش کرنی چاہتے تھے مگر یہ منظور نہ تھا کہ اُس کے لئے ایک فوج بھیجی جائے، پس راجہ نے جودھ سنگھ کو حیلہ سے دربار میں بلایا اور اُسے گرفتار کرنا چاہا۔ جودھ سنگھ نے فوراً تلوار کھینچ لی اور مرنے مارنے کے لئے تیار ہو گیا۔ راجہ اُس کی مردانگی پر اس قدر خوش ہوئے کہ اُسی جگہ اُس سے بغلگیر ہو گئے اور جب تک جودھ سنگھ زندہ رہا اُس سے شرطِ وفا نباہی۔

رنجیت سنگھ کے قبل سکھوں کی فوج بیشتر سواروں کی ہوتی تھی اور پیدل حقارت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ اس کے برعکس یورپ میں جنگ کا دارومدار پیادہ فوج پر تھا اور ہے۔ انگریزی پیدل کو ہندوستانی سواروں کے مقابلہ میں بارہا نمایاں کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ یہ دیکھ کر راجہ نے بھی اپنی فوج کی کایا پلٹ کردی۔ سواروں کے بجائے پیدل فوجیں ترتیب دینی شروع کیں اور اُن کی ترتیب

کے لئے فرانس اور اٹلی کے آزمودہ کار جنرل مامور کئے جن میں سے کئی افسر نپولین بونا پارٹ کے طلسمی محاربات میں شریک رہ چکے تھے جنرل ونچورا ان میں سب سے زیادہ ہوشیار تھا۔ ان افسروں کی تعلیم نے سکھ پیدل کو یورپ کی بہترین فوجوں کا مقابل بنا دیا تھا۔ پنجاب کے منتخب جوان پیادوں میں بھرتی کئے جاتے تھے اور راجہ کی یہ کوشش رہتی تھی کہ اس صیغہ کو زیادہ مقبول بنایا جاوے سکھوں کی پیدل فوج کی جفاکشی کا یہ حال تھا کہ مہینوں تک متواتر بیس میل منزلیں روزانہ طے کر سکتی تھی۔ راجہ کی کل فوج تقریباً ایک لاکھ تھی۔ اور جاگیرداروں کی ملا کر سوا لاکھ۔

رنجیت سنگھ کے ممالک محروسہ پنجاب خاص (در میان ستلج و اندس کشمیر۔ ملتان۔ ڈیرہ جات۔ پیشاور اور سرحدی اضلاع شامل تھے اگرچہ سلطنت بہت وسیع نہ تھی۔ مگر اس میں ہندوستان کے وہ خطے شامل تھے جو طبعی کیفیات کے لحاظ سے دشوار گذار تھے اور جہاں کی آبادی دلیر سرکش اور دغاباز ہے۔ یہ خطہ ہندوستان کے بادشاہوں کے لئے ہمیشہ پریشانیوں اور مشکلات کا مخزن ثابت ہوا ہے۔ مغل بادشاہوں کے زمانہ میں اکثر مہمیں بھیجنی پڑتی تھیں جو نتائج کے لحاظ سے بہت ہی ناقابل قدر مگر مصارف اور خونریزیوں کے لحاظ سے معرکتہ الآرا ہوتی تھیں۔ یہ خطہ متعصب اور جاہل مسلمان فرقوں سے آباد ہے جو تعلیم اور تہذیب سے بالکل بے بہرہ ہیں

اور جن کی زندگی کا ماحصل چوری، ڈاکہ اور لوٹ ہے اور باوجود یکہ اس خطہ پر پچاس سالوں سے انگریزی سلطنت کی خوش آیند برکتیں پھیلی ہوئی ہیں مگر وہ ابھی تک جہالت اور تاریکی کے اُسی غار میں ڈوبا ہوا ہے اور جب کبھی موقع پاتا ہے سرحد کے ہند وؤں کو اور اگر ہندو نہ ملے تو مسلمانوں کو اپنے وحشیانہ جذبات کا نشانہ بناتا ہے ۔ رنجیت سنگھ کو اُن فرقوں سے بہت نقصانات اُٹھانے پڑے ۔ آزمودہ کار افسر اور منتخب فوجیں اکثر انھیں سرحدی مناقشات کے نذر ہو جاتی تھیں ۔ یوں تو چھیڑ چھاڑ بارہوں ماس ہوتی رہتی تھی مگر تحصیل لگان کا زمانہ دیگر الفاظ میں جنگ و جدل کا زمانہ ہوتا تھا ۔ رنجیت سنگھ کو اگر جنوب میں توسیع سلطنت کے وسائل ہاتھ آتے تو شاید وہ ان سرحدی مقامات کی طرف متوجہ نہ ہوتے ۔ کیونکہ اُن پر حکومت کرنا درد سر مول لینا ہے مگر دکن میں برٹش گورنمنٹ نے اُن کے فتوحات کی حد کھینچ دی تھی اور پٹیالہ نابھا جھند وغیرہ ریاستوں کو اپنے زیر اثر بنا لیا تھا ۔ فنون لطیفہ اور ترقی علوم کے لحاظ سے رنجیت سنگھ کا عہد سلطنت قابل ذکر نہیں ۔ ان کی زندگی استحکام سلطنت کی کوششوں ہی میں صرف ہو گئی ۔ فن تعمیر اور سنگتراشی کی وہ یادگاریں جن سے عہد مغلیہ کا نشان اب تک قائم ہے وجود پذیر نہ ہو سکیں ۔ کیونکہ یہ پودے باغ امن ہی میں اُگتے اور سرسبز ہوتے ہیں ۔

رنجیت سنگھ کی خانگی زندگی قابل رشک نہیں کہی جا سکتی ۔ اس لحاظ سے

اُنھوں نے اُن کمزوریوں میں حصّہ وافر پایا تھا جو اُس زمانہ تک روسا اور
شرفا کے لئے تمغۂ افتخار سمجھی جاتی تھیں اور جن سے رئیسوں کا طبقہ اب بھی
پاک نہیں ہے اُن کے نو منکوحہ رانیاں تھیں اور نو مدخولہ۔ کنیزوں کی تعداد
صدہا تک پہنچی تھی۔ منکوحہ رانیاں اکثر ذی اثر سکھ خاندانوں کی بیٹیاں
تھیں جنھیں اُن کے والدین نے اپنا پولیٹیکل وقار بڑھانے کے لئے
حرم میں داخل کیا تھا اس لئے حرم سرا میں اکثر سازشیں ہوتی رہتی تھیں۔
مے نوشی بھی اُس وقت سکھ روسا کی ایک عام کمزوری تھی اور راجہ بلا کے
مے نوش تھے۔ اُن کی شراب غایت درجہ کی تیز ہوتی تھی۔ اِسی کثرت
شراب سے وہ کئی بار فالج کے شکار ہوئے اور آخری حملہ مہلک ثابت ہوا۔
یہ حملہ ۱۸۳۸ء کے موسم سرما میں شروع ہوا اور سال بھر کے بعد آخر جان ہی
لے کر گیا۔ مگر اس مہلک مرض میں مبتلا ہو کر بھی مہاراج سلطنت کے
ضروری فرائض انجام دیتے رہے۔ اُس شیر کا جس کی للکار سے پنجاب اور افغانستان
کانپ اُٹھتا تھا۔ اب ایک سکھپال میں سوار ہو کر فوجوں کے قواعد دیکھنے کے لئے
جانا نہایت دردناک نظارہ تھا۔ ہزاروں آدمی اُن کے دیدار کے لئے دورویہ
سڑکوں پر جمع ہو جاتے۔ اور انھیں اِس حالت میں دیکھ کر غم اور مایوسی کے
اشک بہاتے آخر پیغام مرگ آ پہنچا۔ ۲۷ جون ۱۸۳۹ء کو مہاراج نے شہزادہ
کھڑک سنگھ کو بلا کر اپنا جانشین اور راجہ دھیان سنگھ کو وزیر قرار دیا۔ ۲۵ لاکھ

روپیہ غربا اور مساکین کو تقسیم کیا۔ اور شام کے وقت جب رنواس میں
چراغ روشن ہو رہے تھے۔ مہاراج کی شمع حیات بجھ گئی۔ دھیان سنگھ
کو وزارت پر مامور کرنا ان کی آخری اور زبردست غلطی تھی۔ شاید اس وقت
دیگر جسمانی قویٰ کی طرح قوت تمیز بھی ضعیف ہو گئی تھی۔ مہاراج کی وفات
کے بعد چھ سال تک طوفان اور طوائف الملوکی کا زمانہ تھا۔ کھڑک سنگھ اور
اُس کا لڑکا نونہال سنگھ دونوں قتل کر دئے گئے۔ پھر شیر سنگھ گدی پر آیا۔
اُس کا بھی یہی حشر ہوا۔ اور آخری سکھ فرمانروا انگریزی سرکار کا وظیفہ خوار
ہو گیا اور وہ عالیشان عمارت جو رنجیت سنگھ نے کھڑی کی تھی چھ ہی سالوں
میں منہدم و منتشر ہو گئی۔

## ۹۳

# رانا جنگ بہادر

نیپال کے رانا جنگ بہادر اُن موقع شناس، دوراندیش اور عالی دماغ آدمیوں میں تھے جو ملکوں اور قوموں کو باہمی تنازعات اور مناقشات سے نکالکر اُس کے عروج کی بنیاد ڈالتے ہیں۔ وہ اُنیسویں صدی کے آغاز میں پیدا ہوئے اور یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں برطانوی طاقت بڑی سُرعت سے پھیلتی جاتی تھی۔ دہلی کی سلطنت کا چراغ گُل ہو چکا تھا۔ مرہٹے اُس کا لوہا مان چکے تھے۔ صرف پنجاب کا وہ حصّہ جو رنجیت سنگھ کے زیرنگیں تھا ابھی تک اُس کے اثر سے خالی تھا۔ نیپال بھی انگریزی تلوار کا مزہ چکھ چُکا تھا اور سگولی کے معاہدے کے مطابق اپنی سلطنت کا ایک حصّہ انگریزی سرکار کے نذر کرچکا تھا۔ وہی حصّہ جو اب نینی تال کی قسمت کہلاتا ہے۔ ایسے نازک وقت میں جبکہ ہندوستانی ریاستیں کچھ تو اپنی خانہ جنگیوں اور کچھ اپنی کمزوریوں کا شکار ہوتی جاتی تھیں۔ نیپال کا بھی وہی حشر ہوتا۔ کیونکہ نیپال کی اندرونی حالتیں اُس وقت کچھ ویسی ہی تھیں جیسی دہلی کی سیّد برادروں کے زمانہ میں یا پنجاب کی رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد ہوئی تھی۔ مگر رانا جنگ بہادر نے

ایسے نازک وقت میں نیپال کا انصرام اپنے ہاتھوں میں لیا۔ اور بدنظمیوں وخانہ جنگیوں کو مٹا کر ایک منضبط، باقاعدہ حکومت قائم کی۔ اس میں شک نہیں کہ اس کام میں وہ ہمیشہ حق اور صداقت کے پابند نہیں رہ سکے۔ بسا اوقات اُنھیں خفیہ ریشہ دوانیوں، سازشوں، حتّٰی کہ خفیہ قتل وخون سے بھی اپنا دامن سیاہ کرنا پڑا مگر غالباً اُن حالات میں وہی پالیسی موزوں تھی۔ نیپال کی حالت اس وقت ایسی ہوگئی تھی جبکہ انسانیت یا تحمّل یا درگذر کمزوری سے منسوب کی جاتی ہے اور جبکہ خوف اور ہراس ہی ایک ایسا آلہ رہ جاتا ہے جو شورش پسند اور شوریدہ سر آدمیوں کو قابو میں رکھے۔ اگر پنجاب کے آخری دور میں جنگ بہادر جیسا با تدبیر جوان ہمت شخص ہوتا تو شاید اُسکا اتنی آسانی سے خاتمہ نہ ہو سکتا۔ جنگ بہادر کو نیپال کا بسمارک کہہ سکتے ہیں۔

نیپال راج کی بنیاد سولھویں صدی میں پڑی۔ اکبر کے ہاتھوں چتّور تباہ ہونے کے بعد رانا چتّور کے خاندان کے کچھ لوگ امن کی تلاش میں یہاں آئے اور یہاں کے کمزور راجہ کو اُن کے لئے جگہ خالی کرنا پڑی۔ تب سے وہی خاندان حکمراں تھا۔ مگر رفتہ رفتہ معاملات نے کچھ ایسی صورتیں اور تبدیلیاں اختیار کیں کہ وہاں سلطنت کا سیاہ وسفید وزیر یا اُمرا کے ہاتھوں میں ہوگیا تھا۔ وزرا جو چاہتے تھے کرتے تھے۔ راجہ صرف منتشر قوتوں کو یکجا رکھنے کا ایک ذریعہ تھا۔ طبقۂ وزرا کے بھی دو فرقے تھے۔ ایک پانڈے کا دوسرا

تھاپا کا۔ اِن دونوں فریق میں آئے دن کشمکش رہتی تھی۔ جسونت پانڈے لوگ برسرِ اقتدار ہوتے تو تھاپا خاندان کو مٹانے میں کوئی دقیقہ نہیں اُٹھا رکھا جاتا تھا۔ علیٰ ہذا تھاپا لوگ برسرِ اختیار ہوتے تو پانڈے کے جان کے لالے پڑ جاتے۔ رانا جنگ بہادر یوں تو شاہی خاندان سے تھے۔ مگر ان کی رشتہ داریاں زیادہ تر تھاپا خاندان میں تھیں۔ جب جنگ بہادر اس وقت کی مروج تعلیم ختم کر چکے تو اُنھیں ایک معزز عہدہ عطا ہوا۔ اُس وقت تھاپا فریق برسرِ اقتدار تھا اور بھیم سین تھاپا وزیر تھے مگر راجہ نے وزیر کی بڑھتی ہوئی طاقت سے ڈر کر اُنھیں ایک جھوٹے الزام میں قید کر دیا اور بھیم سین نے زندان خانہ میں خودکشی کر لی۔ اِن کے مرتے ہی اِن کے عزیز و اقارب پر آفت نازل ہوئی۔ اُن کا بھتیجا جنرل معتبر سنگھ بھاگ کر ہندوستان چلا آیا۔ جنگ بہادر اور اُن کے باپ بھی معزول کئے گئے۔ یہ ۱۸۳۷ء کا واقعہ ہے۔ اُس وقت جنگ بہادر کی عمر ۲۱ سال کی تھی۔ وہ عہدہ سے سبکدوش کئے جانے کے بعد بھاگ کر بنارس آئے۔ اور یہاں دو سال تک اِدھر اُدھر تباہ حال پھرتے رہے۔ بالآخر کہیں امن نظر نہ آیا تو پھر ۱۸۳۹ء میں نیپال گئے۔ تھاپا فریق کے خلاف اُس وقت تک جوش ٹھنڈا ہو گیا تھا اور جنگ بہادر کی کسی نے مزاحمت نہ کی۔ یہاں اُنھیں اپنی دلیری اور جانبازی کے اظہار کے چند ایسے موقع ملے کہ راجہ نے خوش ہو کر اُنھیں بحال کر دیا اور وہ ولیعہد سریندر بکرم کی مصاحبی

میں تعینات ہوئے مگر یہ ملازمت نہایت خوفناک ثابت ہوئی۔کیونکہ ولیعہد ایک شوریدہ سر ضعیف الحواس نوجوان تھا اور اُسے بیرحمانہ مناظر کا ایک خبط سا تھا۔ اپنے مصاحبوں سے ایسے ایسے کاموں کے انجام دینے کی فرمائش کرتا کہ اُن کی جان ہی پر گذر جاتی۔جنگ بہادر کو بھی کئی بار اِن مہلک امتحانوں میں پڑنا پڑا مگر ہر بار وہ کچھ تو اپنی سپہگرانہ مشّاقی اور کچھ اپنی حُسن تدبیر سے جاں بر ہوگئے۔ ایک بار اُنھیں ایک پُل سے نیچے پُرشور پہاڑی ندی میں کودنا پڑا۔اسی طرح ایک بار اُنھیں ایک ایسے عمیق کنوئیں میں کودنے کی فرمائش ہوئی جس میں اُن بھینسوں کی ہڈیاں جمع کی جاتی تھیں جو خاص تقریبوں میں وہاں قربان کی جاتی تھیں۔ اِن دونوں آزمائشوں سے جنگ بہادر اپنی جانبازانہ ہمت کی بدولت سرخرو نکلے۔خیریت یہ ہوئی کہ اُنھیں اِس ملازمت پر صرف ایک سال رہنا پڑا۔ ۱۸۴۱ء میں اِن کے والد کا انتقال ہوا اور وہ مہاراجہ راجندر بکرم کے باڈی گارڈ مامور ہوئے۔

ولیعہد سریندر بکرم کا یہ سنگدلانہ جنون روزافزوں ہوتا گیا۔دوسروں کو ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دیتے دیکھ کر اُسے خط ہوتا تھا۔یہاں تک کہ کئی بار اُس نے اپنی ہی رانیوں کو پالکی سمیت ندی میں ڈبوا دیا۔مہاراجہ صاحب خود ایک کمزور کم اندیش کج فہم آدمی تھے۔راج کا انتظام بڑی رانی کیا کرتی تھیں۔اور اُن کا دباؤ کچھ نہ کچھ ولیعہد کو بھی ماننا پڑتا تھا۔مگر اکتوبر ۱۸۴۱ء میں اس عاقلہ

رانی کا انتقال ہوگیا اور اُن کے مرتے ہی نیپال میں بدنظمیوں کا دور شروع ہوا۔ سریندر بکرم کو اب کسی کا خوف نہ رہا۔ اُس نے دل کھول کر مظالم کرنا شروع کئے۔ راجہ صاحب اِن حرکات کے انسداد کے ناقابل تھے۔ اراکینِ سلطنت اور رعایا سب کا ناک میں دم ہوگیا۔ آخر یہ کوشش ہونے لگی کہ مہاراجہ کو اپنے اختیارات سے دست بردار ہونے پر مجبور کیا جائے اور چھوٹی رانی لکشمی دیوی کے ہاتھوں میں عنانِ سلطنت دی جائے۔ لکشمی دیوی ولیعہد کی سوتیلی ماں تھیں اور خود اپنے لڑکے رن بکرم کو گدی پر بٹھانے کے منصوبے سوچ رہی تھیں۔ اس لئے انصرام سلطنت اِن کے ہاتھوں میں آنے سے یہ اُمید کی جاتی تھی کہ ولیعہد کے اِس قاتلانہ میلان کا انسداد ہو جائیگا۔ چنانچہ دسمبر ۴۲ء میں سلطنت کے سب اراکین اور رعایا کے خاص ممتاز لوگ جنکی تعداد سات سو کے قریب تھی یکجا ہوئے اور فوجوں کے ساتھ بینڈ بجاتے ہوئے مہاراجہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوکر اُن سے ایک فرمان پر دستخط کرنے کی استدعا کی جس کے مطابق سلطنت کا نظم و نسق لکشمی دیوی کے ہاتھوں میں دیدیا جائے۔ مہاراجہ صاحب نے پہلے تو لیت و لعل سے کام لینا چاہا اور ایک ماہ تک وعدوں پر ٹالتے رہے۔ بالآخر اُنہیں اس فرمان کو تسلیم کرنے کے سوا کوئی مفر نظر نہ آیا۔

رانی لکشمی دیوی کو پانڈے لوگوں سے کدورت تھی۔ وہ تھاپا فریق کی طرفدار تھیں۔ اس لئے اختیار پاتے ہی اُنھوں نے جنرل معتبر سنگھ کو نیپال بُلایا جنھیں

انگریزی سرکار نے شملہ میں نظر بند کر رکھا تھا۔ معتبر سنگھ جب نیپال میں آئے تو اُن کا بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا گیا۔ اُن کے استقبال کے لئے شاہی فوجیں روانہ کی گئیں۔ جنگ بہادر بھی اِس استقبال میں شریک تھے۔ معتبر سنگھ کو وزارت کا عہدہ ملا اور پانڈے وزیر کو جان کے خوف سے ہندوستان بھاگنا پڑا۔ رانی لکشمی دیوی کا اس تبادلہ سے یہ منشا تھا کہ معتبر سنگھ کو اپنے لڑکے رن بکرم سنگھ کا طرفدار بنائے اور ولیعہد سریندر بکرم کو برطرف کر دے۔ مگر معتبر سنگھ اتنے کمزور اور بے اصول آدمی نہ تھے کہ اپنی وزارت یا حُسن سلوک کے صلہ میں حق کا خون کر دیں۔ فرزند اکبر کی موجودگی میں چھوٹے لڑکے کا ولیعہد قرار پا جانا بالکل خاندانی روایات اور رواج کے خلاف تھا۔ اور وہ باوجودیکہ رانی کو صاف صاف جواب نہ دے سکے۔ مگر کوشش کرنے لگے کہ سریندر بکرم کے مزاج میں ایسی اصلاح کر دی جائے جس سے مہاراجہ صاحب کو اُن کے ہاتھوں میں اختیار سلطنت دینے میں تامّل کرنے کی کوئی گنجائش نہ باقی رہے۔ مگر خود مہاراجہ صاحب معتبر سنگھ سے بدظن تھے۔ اِدھر رفتہ رفتہ رانی کو بھی معلوم ہو گیا کہ معتبر سنگھ سے کوئی اُمید رکھنا فضول ہے۔ چنانچہ وہ بھی درپردہ اُن کے خون کی پیاسی بن بیٹھیں۔ غریب معتبر سنگھ اب بڑے مخمصے میں پڑے ہوئے تھے۔ راجہ بھی دشمن رانی بھی دشمن مگر وہ اپنے دھن کے پکے تھے۔ ایک طرف ولیعہد کی تربیت اور تہذیب اور دوسری طرف مہاراجہ صاحب پر ولیعہد کو مختار کل بنانے کی تدبیر کوشش میں

منہمک تھے۔ مگر یہ دونوں منزلیں کٹھن تھیں۔ بیرحمی جس شخص کی طبیعت ثانی ہوگئی ہو اُس کی اصلاح دشوار تھی اور مہاراجہ صاحب جیسے ارادوں کے کمزور نا عاقبت اندیش اور اختیارات کے دلدادہ شخص کی تالیف قلب بھی آن ہونی۔ مگر بالآخر معتبر سنگھ کی دونوں کوششیں بارآور ہوئیں اور ۱۳ دسمبر سنہ ۴۲ء کو مہاراجہ صاحب نے اپنے سارے اختیارات ولیعہد کو عطا کئے اور معتبر سنگھ نے یہ فرمان پڑھ کر رعایا کو سُنایا۔

رفتہ رفتہ معتبر سنگھ کا اختیار اور دباؤ اتنا بڑھا کہ ریاست کے اور سردار گھبرانے لگے۔ خود رانی جس کا اختیار سے چولی دامن کا ساتھ ہے، یہاں بھی نمایاں ہوئی۔ معتبر سنگھ اپنے سامنے کسی کی نہیں سُنتے تھے۔ جنگ بہادر اُن کے حقیقی بھانجے تھے۔ اس لئے کبھی کبھی دربار میں بھی اُن کی مخالفت کی جرأت کر بیٹھتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ماموں بھانجے میں چشمک ہوگئی۔ ایک بار کسی معاملے میں جنگ بہادر کے چچیرے بھائی دیوی بہادر نے معتبر سنگھ کی سخت مخالفت کی۔ اور غصّہ کی رو میں رانی صاحب کے اطوار پر بھی حرف زنی کی۔ یہ گناہ کبیرہ تھا اُسے قتل کی سزا دی گئی۔ جنگ بہادر نے معتبر سنگھ سے اپنے چچیرے بھائی کی جان بخشی کی سعی سفارش کے لئے بہت کچھ منت سماجت کی مگر معتبر سنگھ نے رانی کے حکم میں مداخلت کرنا مناسب نہ سمجھا۔ دیوی بہادر قتل کر دیا گیا۔

رانی لکشمی دیوی کے اطوار پر دیوی بہادر نے جو حملہ کیا تھا وہ ایک کھلا ہوا

راز تھا۔ زنانے درباروں کی جو خصوصیات ہیں اُن سے اِن کا دربار بھی عاری نہ تھا۔ رنواس کیا تھا پرستان تھا۔ بوڑھی لونڈیاں سب نکال دی گئی تھیں اِن کے بجائے حسین عورتیں سب رکھی گئی تھیں۔ ان میں سے اکثر رانی صاحبہ کے مُنہ لگی تھیں اور ریاست کے معاملات میں بھی اکثر رانی صاحبہ انھیں کے مشورے پر چلتی تھیں۔ اس لئے اِن لونڈیوں کا دربار میں بہت دخل تھا۔ اور ریاست کے چھوٹے بڑے سبھی سردار حق و ناحق کی طرف سے آنکھ موند کر ان پریوں میں سے کسی ایک کو شیشہ میں اُتارنا ضروری سمجھتے تھے۔ اِس سے اِن کے بڑے بڑے کام نکلتے تھے۔ مہارانی کی گگن سنگھ نام کے ایک سردار پر خاص نظر عنایت تھی۔ یہ امر سب پر روشن تھا مگر کسی کو اتنی جرارت نہ تھی کہ اس پر ایک حرف زبان سے نکال سکے۔ رانی صاحبہ بیشتر معاملات میں گگن سنگھ ہی سے مشورہ لیتی تھیں۔ اِن کا منشا تھا کہ اُسے وزارت کے عہدے پر ممتاز کریں۔ معتبر سنگھ سے وہ پہلے ہی بدظن ہو گئی تھیں۔ گگن سنگھ نے معتبر سنگھ کے خلاف اِن کے کان خوب بھرے۔ یہاں تک کہ رانی صاحبہ اِن کی جان کی خواہاں ہو گئیں۔ جنگ بہادر کو گگن سنگھ نے ملا لیا۔ اور آخر انھیں کے ہاتھوں رنواس میں معتبر سنگھ قتل ہوئے۔

جنگ بہادر کے نام سے اس سیاہ داغ کو مٹانا غیر ممکن ہے۔ اس شرمناک اور بزدلانہ گناہ میں بجز خود غرضی کے اور کوئی مصلحت نہیں تھی۔ طیش یا اشتعال۔ انتقام یا مصالح ملکی جس کی بنا پر ایسے قتل کی تاویل کی جا سکتی ہے،

یہاں لا پتہ تھے۔ اِسے انگریزی محاورہ میں ٹھنڈے خون کا قتل کہنا چاہیے۔ اختیار اور عہدہ کی آرزو میں اپنے حقیقی ماموں کے قتل سے بھی دریغ نہیں کیا گیا۔ معتبر سنگھ کے قتل سے ملک میں ایک ہلچل مچ گئی مگر قاتل کا سُراغ نہ مل سکا۔ ادھر رانی کی منشا بھی نہ پوری ہوئی۔ وزارت کے دعویدار صرف گگن سنگھ ہی نہیں اور لوگ بھی تھے۔ جنگ بہادر اس وقت ایک معزز فوجی خدمت پر مامور تھے تین رجمنٹ فوجیں خاص انھیں کی بھرتی کی ہوئی تھیں جو اِن کے سوا کسی کا حکم ماننا جانتی ہی نہ تھیں۔ اِن کے متعدد بھائیوں کو بھی فوجی عہدے مل گئے تھے اس لئے دربار میں انھیں خاصا اقتدار حاصل ہوگیا تھا۔ اس پر معتبر سنگھ کے قتل کا معاوضہ اُن کے نزدیک وزارت کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گگن سنگھ کو ایک فوجی عہدے پر قناعت کرنا پڑی اور وزارت کا کام پانڈے سردار فتح جنگ کے سپرد ہوا۔

یہ حالت عرصہ تک نہ رہ سکی۔ گگن سنگھ مہاراجہ صاحب کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا۔ وہ کسی طرح اُسے جہنم رسید کرنا چاہتے تھے۔ مگر رانی کے خوف سے بے بس تھے۔ آخر یہ جلن نہ سہی گئی اور انھیں کے ایما سے ایک سازش ہوئی جس میں گگن سنگھ کو قتل کرنا قرار پایا۔ وہ اپنے مکان پر گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔

گگن سنگھ کا قتل ہونا دربار میں قیامت برپا ہونے کا پیش خیمہ تھا۔

رانی اِس سانحہ کی خبر پاتے ہی بپھری ہوئی شیرنی کی طرح شمشیر برہنہ ہاتھ میں لئے رنواس سے نکلیں اور گگن سنگھ کے مکان پر جا پہنچیں۔ انتقام کا شعلہ اُن کے دل میں بھڑکا۔ رات کو فوجی بگل بجا۔ رانی صاحبہ کا منشار تھا کہ سب سرداروں کو جمع کر کے اُن میں قاتل کو ڈھونڈھ نکالیں۔ جنگ بہادر نے بگل سنتے ہی کسی آنے والے حادثہ کے اندیشہ سے اپنی فوج کو تیار ہونے کا حکم دیا اور اُسے لئے وہ سب سے پہلے شاہی محل میں داخل ہو گئے۔ اُن کی فوج نے محلسرا کو گھیر لیا۔ رانی صاحبہ گھبرائیں۔ مگر جنگ بہادر نے اُن کی تشفی کی۔ رفتہ رفتہ اور سردار بھی جمع ہوئے اور سارا صحن سرداروں سے بھر گیا۔ رانی نے ایک سردار پر قتل کا الزام لگا کر اُسے قتل کرنے کا حکم دیا۔ اِس میں اور سرداروں میں کانا پھوسی ہونے لگی۔ ایک دوسرے کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھتا تھا۔ دوسرے جنرلوں نے بھی اپنی فوجوں کو محل کے قریب بلانا چاہا۔ آپس میں درشت کلامیاں ہونے لگیں۔ جنگ بہادر کے ایک فوجی پہرہ دار نے ایک جنرل کو جو اپنی فوج سے ملنے محل کے باہر جانا چاہتے تھے قتل کر دیا۔ اب کیا تھا کشت و خون کا بازار گرم ہو گیا۔ کتنے ہی سردار اُسی صحن میں قتل ہو گئے۔ وزیر اعظم بھی جانبر نہ ہو سکے۔ بالآخر جنگ بہادر کی فوج نے امن قائم کیا۔ اور سردار لوگ اپنے اپنے مقام کو لوٹے۔ اِن خانہ جنگیوں نے جنگ بہادر کے لئے میدان صاف کر دیا۔ اُن کے رقیبوں میں سے کوئی باقی نہ رہا۔ ۱۵ ستمبر ۱۸۴۶ء کا یہ واقعہ ہے۔ دوسرے

دن مہارانی صاحبہ نے وزارت کا قلمدان اُن کے سپرد کردیا اور اُس طرح اِس تاریکی کے بعد اِن کی تقدیر کا آفتاب نمودار ہوا۔

مگر اس نازک وقت میں یہ عہدہ جتنا ہی اونچا تھا اُتنا ہی خطرناک تھا۔ مہارا جہ صاحب کو جنگ بہادر کا وزیر ہونا ناگوار تھا۔ اُن کو شبہہ تھا کہ اس کُشت وخون کا ذمہ دار جنگ بہادر ہی ہے۔ رانی صاحبہ بھی غرض سے خالی نہ تھیں۔ وہ نئے وزیر کی مدد سے اپنے لڑکے کو راج پر بٹھانے کی فکر میں تھیں۔ اِدھر گگن سنگھ کے بہی خواہ اِن کی جان کے گاہک ہو رہے تھے۔ اُنھوں نے کئی ماہ تک رانی کے احکام کی بے عذر تعمیل کی یہاں تک کہ ولیعہد اور اُن کے بھائی کو زندان خانے میں ڈال دیا۔ حالانکہ اس میں اِن کی منشا یہ تھی کہ دونوں بھائی رانی صاحبہ کی خُفیہ سازشوں سے مامون رہیں۔ رانی ولیعہد کو قتل کرانا چاہتی تھیں۔ کیونکہ اس کے بغیر اِن کے اپنے لڑکے کے لئے کوئی اُمید نہ تھی۔ اُنھوں نے جنگ بہادر سے کنایتہً اِس کا ذکر بھی کیا۔ مگر جنگ بہادر نے ہمیشہ تجاہل سے کام لیا۔ اشاروں سے کام نہ چلتے دیکھ کر رانی نے اُن کے پاس اِس مضمون کا ایک خط لکھا۔ اِسے جنگ بہادر نے اپنے پاس رکھ لیا اور اُس کا نہایت دلیرانہ دنداں شکن جواب لکھا۔ جس سے رانی صاحبہ اُن سے مایوس ہی نہیں ہوئیں بلکہ اُن کی جان کی بھی دشمن ہوگئیں۔ اور اُن کے قتل کی سازش کرنے لگیں۔ گگن سنگھ کا لڑکا وزیر سنگھ اِس کام میں

رانی صاحبہ کا دست راست تھا۔ سازش پوری ہوگئی۔ اس کا ہر ایک رکن اپنے اپنے کام انجام دینے پر مستعد ہوگیا۔ عہد و پیمان بھی ہوگئے۔ صرف اتنی کسر تھی کہ جنگ بہادر رانی صاحبہ کے محل میں بلالئے جاویں مگر عین موقع پر جنگ بہادر کی قیافہ شناسی نے بھانڈا پھوڑ دیا۔ راز آشکارا ہوگیا۔ انھوں نے فوراً فوج طلب کی اور اسے لئے رانی صاحبہ کے جائے قیام پر جا دھمکے۔ قاتل اپنی گھات میں بیٹھے ہوئے تھے کہ جنگ بہادر نے انھیں گھیر لیا۔ انھیں جان بچانے کا موقع بھی نہ ملا۔ کتنے ہی وہیں قتل کر دئے گئے۔ رانی صاحبہ خون بدامن پکڑ لی گئیں۔ اُن پر ولیعہد اور وزیر کے قتل کرنے کی سازش کا الزام لگایا گیا۔ ثبوت موجود تھے۔ رانی کو بریت کا کوئی موقع نہ تھا۔ مجلس وزرا میں یہ معاملہ پیش ہوا اور رانی صاحبہ کو ہمیشہ کے لئے نیپال سے جلاوطن کر دیا گیا۔ اُن کے دونوں لڑکوں نے اُن کے ساتھ رہنے ہی میں اپنی جان کی خیر سمجھی۔ جنگ بہادر نے اس کی مزاحمت نہ کی بلکہ نہایت فیاضی سے اٹھارہ لاکھ روپیہ رانی صاحبہ کے اخراجات کے لئے خزانہ سے دیکر انھیں رخصت کیا۔ اس واقعہ سے واضح ہوتا ہے کہ جنگ بہادر کیسے چھوٹ اور جھگڑے کے تھے اور حالات کو کس طرح اپنے موافق بنا لیتے تھے۔ رانی صاحبہ کے شاہانہ وقار اور اقتدار کو دم زدن میں مٹا دینا کوئی آسان کام نہ تھا۔ جس رانی کے خوف سے سارا نیپال تھر تھر کانپتا تھا اُس کی طاقت کو اُن کے تدبر اور کارروائی نے دیکھتے دیکھتے خاک میں ملا دیا۔

مہاراجہ صاحب عرصہ سے کاشی جاترا کی تیاریاں کر رہے تھے رانی صاحبہ کا دیس نکالا ہوا تو وہ بھی اُن کے ہمراہ بنارس روانہ ہوئے۔ جنگ بہادر نے بہت سمجھایا کہ اِس وقت رانی صاحبہ کے ساتھ آپ کا جانا زیبا نہیں۔ آپ کے بدخواہ لوگ کچھ اور ہی معنی نکال سکتے ہیں۔ مگر راجہ صاحب جانے پر مُصر ہوئے۔ ولی عہد اُن کے جانشین قرار دئے گئے۔ مگر جنگ بہادر نے ایک ہوشیاری یہ کی کہ اپنے چند معتمد آدمیوں کو راجہ صاحب کی ہمراہی میں روانہ کیا۔ تاکہ وہ راجہ صاحب کے حرکات و سکنات کا پتہ دیتے رہیں۔ اُنھیں راجہ صاحب کی تلوّن طبعی اور ہوس اختیار کے باعث اندیشہ تھا کہ کہیں وہ بدخواہوں کے بہکانے میں نہ پڑ جائیں اور اُن کا اندیشہ حق بجانب ثابت ہوا۔ بنارس میں نیپال کے کتنے ہی فتنہ پرداز جلا وطن سرداروں نے مہاراجہ صاحب کو اُکسانا شروع کیا کہ وہ نیپال پر حملہ کرکے جنگ بہادر کی حکومت کا خاتمہ کر دیں۔ مہاراجہ صاحب پہلے تو اِس دام تزویر میں نہ پھنسے مگر شب و روز کی ہم نشینی اور تحریک نے بالآخر اپنا اثر دکھایا۔ مہاراجہ صاحب کو یقین ہو گیا کہ جنگ بہادر فی الواقع ولیعہد کے نام سے نیپال پر خود راج کر رہا ہے۔ وہ جب نیپال کی طرف لوٹے تو بدخواہوں کی ایک جمعیت جن کی تعداد دو سو سے کم نہ تھی اُن کے ساتھ چلی۔ مہاراجہ صاحب نیپال کی سرحد پر پہنچکر سوچنے لگے کہ اب کیا کرنا مناسب ہے۔ رانی صاحبہ سے خط و کتابت ہو رہی تھی اور حملہ کی تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ باغیوں میں

وزیر - جنرل - خزانچی سب مقرر ہو گئے - باقاعدہ فوج بھرتی ہونے لگی جنگ بہادر کے معتمد آدمیوں نے مہاراجہ صاحب کو بہت سمجھایا کہ آپ اس حرکت سے باز آئیں مگر مہاراجہ صاحب اپنی دُھن میں کب کسی کی سُنتے تھے - دو بدو تو یہی کہتے تھے کہ یہ سب افواہیں غلط ہیں مگر در پردہ تیاریوں سے غافل نہ تھے - اُدھر یہاں کے روزانہ حالات مو بہ مو جنگ بہادر کے پاس پہنچتے رہے - جنگ بہادر کو اندیشہ ہوا کہ کہیں اِس فتنہ کی آگ سارے ملک میں نہ پھیل جائے اِس کا انسداد ضروری سمجھا - اُنھوں نے کُل فوجوں اور سرداروں کو طلب کیا - اور مہاراجہ صاحب کی در پردہ تیاریوں کا مفصّل حال کہہ کر اُنھیں معزول کرنے کی تجویز پیش کی - فوجوں نے وفاداری کا عہد کیا - مہاراجہ صاحب کے پاس ایک خط روانہ کیا گیا - جس میں اُن پر باغیانہ فوج کشی کا الزام لگایا گیا - اور اُن کے بجائے ولیعہد کے تخت نشین ہونے کی اطلاع دی گئی - مہاراجہ صاحب یہ خط پاتے ہی آپے سے باہر ہو گئے - مشیروں نے اور بھی اشتعال دیا - دو ہزار جوان بھرتی ہو چکے تھے - اُنھیں کاٹھ مانڈو پر دھاوا کرنے کا حکم دیا گیا - جنگ بہادر نے چند رجمنٹیں مقابلے کے لئے بھیجیں - باغی بھگا دئے گئے - مہاراجہ صاحب نظر بند کر لئے گئے اور اُن پر سخت نگاہ رکھے جانے کا انتظام کیا گیا - اپنی وزارت کے دوسرے ہی سال میں جنگ بہادر ایسے ہر دلعزیز ہو گئے اور رعایا کو اُن پر اِتنا اعتماد ہو گیا کہ اُن کے مقابلہ میں راجہ صاحب کو

بھی ہار ماننا پڑی۔ اِس کشمکش سے نجات پاکر اُنھوں نے فوجی اور آئینی صلاحیں کیں اور رعایا کی کتنی ہی دیرینہ شکایات دور کیں۔ اُنھیں خود اوائل عمر میں سرکاری ملازموں سے بھگتنا پڑا تھا اور عام تکلیفوں کا اُنھیں ذاتی تجربہ تھا۔
اپنی وزارت کے تین ہی چار سال میں وہ اِتنے مقبول ہوگئے کہ لوگ راجہ کو بھول گئے اور اُنھیں کو اپنا سب کچھ سمجھنے لگے۔ بالخصوص فوجی سپاہی اُن پر جان دیتے تھے۔ اِس اثنا میں چند پُرانے حاسدوں نے اُنھیں قتل کرنے کی سازشیں کیں مگر جنگ بہادر ہمیشہ کسی نہ کسی طرح پہلے ہی سے خبردار ہو جاتے تھے۔ مہاراجہ سُریندر بکرم نے ریاست کے کُل اختیارات اُنھیں کے ہاتھ میں دے رکھے تھے اور خود بہت کم دخل دیتے تھے۔ وہی فاترالعقل ولیعہد اب نہایت مصلحت اندیش انصاف پرور راجہ ہوگیا تھا۔
جنگ بہادر انگریزوں کی دلیری، موقع شناسی اور حُسنِ انتظام کے بڑے مدّاح تھے۔ اور اُنھیں اُس سرزمین کی سیر کی خواہش تھی جہاں ایسی قوم پیدا ہوسکتی ہے۔ وہ مارچ ۱۸۵۰ء میں اپنے کئی عزیزوں اور معتمد سرداروں کے ساتھ ولایت کو روانہ ہوئے۔ اور انگلستان، فرانس گھومتے ہوئے فروری ۱۸۵۱ء میں لوٹ آئے۔ انگلستان میں اُن کی خوب آؤ بھگت ہوئی اور اُنھیں انگریزی سوسائیٹی کو دیکھنے کا بہت موقع ہاتھ آیا۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ وہ انگلستان سے بیدار مغزی اور وسعت نگاہ اور حُسنِ انتظام کے بیش بہا

نتائج اخذ کرکے لوٹے۔ انگریزی قوم کے ساتھ نیپال کی دوستی اور وفاداری اُسی وقت پیدا ہوئی۔ اور وہ آج تک قائم ہے۔

ولایت سے واپسی کے تھوڑے ہی دنوں بعد نیپال کو تبّت سے لڑنا پڑا۔ اس موقع پر جنگ بہادر کی مستعدی اور حُسنِ انتظام سے تبّت پر متواتر فتوحات حاصل ہوئیں۔ بالآخر ۱۸۵۵ء میں تبّت نے مجبور ہوکر نیپال سے صلح کرلی۔ اس معاہدہ سے نیپال کو تجارتی رعایتیں حاصل ہوگئیں۔ مہاراجہ صاحب نے ایسے جوان باتدبیر وزیر کے ساتھ تعلّقات زیادہ مضبوط کرنے کے لئے اپنی راج کماری کی شادی جنگ بہادر کے لڑکے سے کردی۔

متواتر کئی سال یک لخت محنت کرنے کے باعث جنگ بہادر کی صحت کچھ خراب ہوگئی تھی چنانچہ اُنھوں نے ۱۸۵۶ء میں وزارت سے استعفا دیدیا لیکن قوم اُنھیں اتنی آسانی سے جُدا نہ کرسکتی تھی۔ سارے نیپال کے ذی اثر لوگ جمع ہوکر جنگ بہادر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اُن سے اپنا استعفا واپس لینے کے لئے استدعا کی۔ یہاں تک کہ وہ اُنھیں مہاراجہ صاحب کے بجائے گدّی پر بٹھانے کے لئے بھی آمادہ تھے مگر جنگ بہادر نے کہا کہ جس شخص کو میں نے اپنے ہی ہاتھ سے راج سنگھاسن پر بٹھایا ہے اُس کے مقابلہ میں اب کسی طرح نہیں آنا چاہتا۔ مہاراجہ صاحب نے اُن کے ایثار کا یہ تذکرہ سُن کر دو خوشحال اضلاع اُنھیں سپرد کردیئے اور مہاراجہ

کا خطاب بھی عطا کیا۔ جنگ بہادر اِن اضلاع کے مختارِ کُل بنا دیے گئے۔ اس کے علاوہ وزارت کا عہدہ اُن کے خاندان میں موروثی قرار دیا گیا۔ اِن عام تقاضوں سے مجبور ہو کر جنگ بہادر نے صحت پاتے ہی پھر وزارت کا قلمدان ہاتھ میں لیا۔

اِسی زمانہ میں ہندوستان میں بغاوت کی آگ بھڑک اُٹھی۔ باغیوں کا غلبہ دیکھ کر لارڈ کیننگ نے جنگ بہادر سے مدد مانگی۔ جنگ بہادر نے فوراً چھ رجمنٹیں روانہ کیں۔ اور کچھ عرصہ بعد خود ایک بڑی فوج لے کر آئے۔ گورکھپور۔ اعظم گڑھ۔ بستی۔ گونڈہ وغیرہ مقامات سے باغیوں کی بڑی بڑی جماعتوں کا قلع قمع کرتے ہوئے وہ لکھنؤ داخل ہوئے اور لکھنؤ سے باغیوں کے نکالنے میں بڑی سرگرمی اور مستعدی سے انگریزی افسروں کی مدد کی۔ اِن کی دھاک ایسی بیٹھی کہ باغی اِن کا نام سُن کر تھرّا جاتے تھے۔ بغاوت کو اس طرح فرو کرکے وہ نیپال واپس گئے۔ مگر جب باغیوں کی ایک کثیر جماعت نیپال میں پناہ گزین ہوئی تو جنگ بہادر نے اُن کے گذارے کے لئے زمین کا مناسب انتظام کر دیا۔ اُن کی اولاد آج بھی ترائی میں آباد ہے۔

جنگ بہادر نے ۱۸۷۷ء تک انتظامِ سلطنت کا بار سنبھالا۔ اور ملک میں متعدد اصلاحیں کیں۔ زمین کا بندوبست۔ قانون وراثت کی ترمیم اُنھیں کی بیدار مغزی کا نتیجہ ہیں۔ یہ اُنھیں کی خوش انتظامی تھی جس نے فتنہ اور نفاق

مثلاً ملک میں فارغ البالی اور سرسبزی قائم کی اور جہاں حکام کی مرضی ہی قانون کا کام دیتی رہتی تھی۔ انھوں نے ہر ایک صیغہ کو اصول اور ضوابط میں پابند کر دیا۔

جنگ بہادر ایک مستقل مزاج اور با اصول مدبّر تھے۔ اس میں شک نہیں کہ عہدۂ وزارت پر آنے سے پہلے انھوں نے ہمیشہ حق اور انصاف کو اپنا مسلک نہیں بنایا مگر اُن کی وزارت کا زمانہ نیپال کی روشن تاریخ ہے۔ وہ راجپوت تھے اور راجپوتی دھرم کے نبھانے میں انھیں فخر تھا پنجاب کے انتزاع کے بعد رانی چندر کنور چنار کے قلعہ میں نظر بند کی گئی تھیں مگر وہ اس قید کی متحمل نہ ہو سکیں اور ایک کنیز کے لباس میں قلعہ سے نکلکر سفر کی تکلیفیں جھیلتی ہوئی نیپال پہنچیں اور جنگ بہادر کے پاس اپنی اس پریشان حالت میں آنے کی اطلاع کی۔ جنگ بہادر نے خندہ پیشانی سے انکا خیر مقدم کیا۔ پچیس ہزار روپیہ اُن کے محل کی تعمیر کے لئے دئے اور ڈھائی ہزار روپیہ ماہوار وثیقہ مقرر کیا۔ حالانکہ انگریزی پولٹیکل رزیڈنٹ نے انھیں انگریزی گورنمنٹ کی ناراضگی کا خوف دلایا۔ مگر انھوں نے صاف جواب دیا کہ میں راجپوت ہوں اور راجپوت لوگ اپنے پناہ میں آئے ہوؤں کی دستگیری کرنا اپنا دھرم سمجھتے ہیں۔ ہاں انھوں نے یہ یقین دلایا کہ رانی چندر کنور انگریزی گورنمنٹ کے خلاف کسی قسم کی کوشش نہ کرنے پائیں گی۔ رانی صاحبہ کا محل ابھی تک قائم ہے۔

شکار کا اُنھیں بیحد شوق تھا اور اِسی شکار کی بدولت وہ ایک بار مرنے سے بچے۔ اُن کا نشانہ کبھی خطا نہ کرتا تھا۔ سپہگری کے فن میں اُنھیں کامل دستگاہ تھی۔ وہ سپاہیوں کی دلیری کی قدر کرتے تھے۔ اِس وجہ سے نیپال کی ساری فوج اُن پر نثار ہونے کے لئے تیار رہتی تھی۔

حالانکہ وہ اُس زمانہ میں پیدا ہوئے جب ہندو قوم مہمل رسم و رواج کی غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی۔ مگر وہ بیدار مغز آزاد خیال آدمی تھے۔ نیپال میں ایک نیچ ذات ہے جسے کوچی موچی کہتے ہیں۔ اُن سے بہت پرہیز کیا جاتا ہے۔ اُنھیں کنوؤں سے پانی بھی نہیں بھرنے دیا جاتا۔ جب اِس قوم کے مکھیاؤں نے جنگ بہادر سے فریاد کی تو اُنھوں نے ایک بڑا جلسہ کیا۔ اُس میں کوچی موچی کے آدمیوں کو بھی شریک کیا اور بھری سبھا میں اُن کے ہاتھ سے پانی پی کر اُنھیں ہمیشہ کے لئے شُدھ کرکے اس سوشل غلامی اور ذلت سے آزاد کر دیا۔ ہندوستان کے شُدھی کے دلدادہ آدمیوں میں کتنے ایسے ہیں جو نصف صدی گذر جانے پر بھی ایک اچھوت ہندو کے ہاتھ کا پانی پینے کی جرأت کر سکیں۔ تاہم جنگ بہادر مغربی روشنی سے بے بہرہ تھے۔ جس پر ہم تعلیم یافتہ ہندوؤں کو اس قدر ناز ہے۔

مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ خورد و نوش کے معاملہ میں بھی ایسے ہی آزاد تھے۔ انگلستان کے دورانِ قیام میں وہ کسی دعوت میں عملاً شریک نہیں ہوئے۔

وہ ضروری اور غیر ضروری اصلاحوں میں تمیز کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ وہ بے خوف ایسے تھے کہ حق کے معاملہ میں انھیں مہاراجہ صاحب سے بھی اختلاف کرنے میں مطلق دریغ نہ ہوتا تھا۔ وہ رعایا کو عمّال کے دستِ تظلّم سے بچانے کی کوشش کرتے تھے اور جب کسی کو پکڑ پاتے تھے تو سخت سزا دیتے تھے۔

الغرض اُس زمانہ میں راجہ جنگ بہادر کی ذات مغتنمات سے تھی۔ اگر ایسے مدبر ہندوستان کی دوسری ریاستوں میں ہوتے تو ممکن تھا کہ اُن میں سے بعض اب بھی زندہ ہوتیں۔ پنجاب۔ ستارہ۔ ناگپور۔ اودھ۔ برما وغیرہ ممالک اُسی زمانہ میں انگریزی عملداری میں آئے اور ممکن ہے۔ انگریزی گورنمنٹ زیادہ متحمّل ہوتی تو شاید اُن کا وجود قائم رہتا۔ مگر خود ان ریاستوں میں ایسے مدبر فرمانروا نہ تھے جو انھیں گردابِ ہلاکت سے صحیح و سالم نکال لیجاتے باوجود اس کے کہ سارا نیپال جنگ بہادر پر فدا تھا اور اُن کے زور اور اثر کے مقابلہ میں راجہ صاحب بھی دب گئے تھے۔ تاہم مُلک کے سرداروں کے اصرار کرنے پر بھی وہ ہمیشہ ہوسِ تاج سے محترز رہے۔ اُس زمانہ میں ہندوستان کی دوسری ریاستوں کے اربابِ حل و عقد کی کشمکش کو دیکھتے ہوئے اُسے رانا جنگ بہادر کی مُلکی قربانی کہہ سکتے ہیں۔

۱۸۷۷ء کے فروری کے مہینے میں وہ شکار کھیلنے گئے تھے۔ بخار میں مبتلا ہوئے اور ایک خفیف علالت کے بعد ۲۵ر فروری کو اس دارِ فانی سے رحلت کی۔

# رینالڈس

جوشوا رینالڈس سموئیل رینالڈس کا لڑکا تھا۔ ۱۶۔ جولائی ۱۷۲۳ء کو پیدا ہوا۔ اور اپنے دورانِ حیات میں انگریزی مصوّری کو سطحِ زمین سے اُٹھا کر عرشِ معلّیٰ تک پہنچا گیا۔ ہوگارتھ اُس وقت مُلک میں مشہور ہو رہا تھا۔ مگر اُس کی تصویروں کے قدر کرنے والے بہت تھوڑے تھے۔ اُس نے اساتذہ سلف سے سبق نہ لیا تھا۔ اُس کے برعکس رینالڈ پُرانے اسکول کا شاگرد اور میکائیل انجیلو۔ رفائیل۔ کریجیو کا معتقد تھا۔ اُس کی تصاویر کی ہر کس وناکس نے قدر کی۔

سموئیل رینالڈس ایک موضع کے پادری تھے۔ مگر کثیر اولاد۔ ہونہار رینالڈ اُن کا دسواں لڑکا تھا۔ اُس کی تعلیم کیا ہو سکتی تھی۔ دیہاتی مدرسے میں تھوڑی بہت انگریزی اور حساب سیکھنے کا موقع ملا۔ اور گویا تحصیل سے فراغت ہوگئی۔ اِس مختصر زمانے میں رینالڈ ایسا ذکی وذہین لڑکا چاہتا تو بہت کچھ سیکھ لیتا۔ مگر اُس کی طبیعت بجائے حساب کی مشق اور گریمر کے مطالعہ کے ڈرائنگ کھینچنے میں زیادہ لگتی تھی۔ گھر میں بیٹھا تصویریں بنایا کرتا۔ پادری صاحب جب کبھی اُس کی تصویریں دیکھ لیتے تو ناراض ہوتے۔ اور

اِس تضیع اوقات پر لڑکے کو مارتے ۔ بہر حال رینالڈ کی طالب علمی کا زمانہ بہت مختصر تھا ۔ مگر جب اُس نے ہوش سنبھالا ۔ ذرا شہرت ہوئی۔ڈاکٹر جانسن، گولڈ اسمتھ، برک، ایسے ایسے مشہور آدمیوں سے ملنے جُلنے کا موقع ملا تو اُس نے یہ کمی بہت تھوڑی مدت میں رفع کر لی۔اِن فاضلانہ صحبتوں میں نیم تعلیم یافتہ آدمی بھکوا بنا کر نکال دیا جاتا ۔ مگر رینالڈ کی بڑی عزت ہوتی تھی۔اُس نے فن تصویر پر جو تقریریں کی ہیں ۔ وہ اپنے حُسنِ بیان ۔ وسعت معلومات اور عالمانہ رنگ کے لئے انگریزی ادب میں نہایت ممتاز درجہ رکھتی ہیں ۔

اُس زمانے میں طبابت بہت آسان پیشہ تھا جس نے چند انگریزی اور لاطینی کتابیں پڑھ لیں اور کسی طبیب کی دوکان میں رہ کر دواؤں اور امراض کے نام سیکھ لئے وہ مطب کرنے کا مستحق ہو جاتا تھا ۔ پادری صاحب نے رینالڈ کے لئے یہی پیشہ تجویز کیا ۔ اور اگر وہ حکمت کی طرف جُھکتا تو ضرور اپنے زمانے کا حکیم حاذق بن جاتا ۔ اُس کا قول تھا کہ ریاضت اور استقلال اور محویت ۔ ذہانت اور ذکاوت کے دوسرے نام ہیں ۔

مصوّری کا پہلا سبق رینالڈ کو اپنی دو بہنوں سے ملا جنھیں اس شغلہ سے ذرا دلچسپی تھی ۔ جو کچھ وہ کھینچتیں رینالڈ فوراً نقل کر لیتا ۔ اس کے علاوہ دوسری باتصویر کتابوں کی نقلیں بھی کیا کرتا ۔ اس طرح بچپنے ہی سے اُس کی نگاہوں میں قوت جذب اور ہاتھوں میں صفائی آنے لگی ۔ ابھی آٹھ ہی برس کا تھا کہ کہیں سے ایک مصوّری

کی کتاب اُس کے ہاتھ لگ گئی - پھر کیا تھا - اُس کو اُس نے بڑے شوق سے ختم کیا - اُس مطالعہ کا یہ اثر ہوا کہ اُس نے مدرسے کا ایک نقشہ کھینچا۔ پادری صاحب نے یہ نقشہ دیکھا تو بیٹے کی پیٹھ ٹھونکی - اور جب رینالڈ کو معلوم ہو گیا کہ ابّا جان بھی میرے مشاغل کو پسند کرتے ہیں تو وہ تصویر نگاری میں جی جان سے محو ہو گیا - رفتہ رفتہ خاندان کے تمام آدمیوں کی شبیہیں کھینچ لیں - دوستوں نے یہ تصویریں دیکھیں تو بڑھاوے دینے لگے - بیسویں سال نے اُسے پختہ کار مصوّر بنا دیا۔

جس قصبہ میں وہ رہتا تھا وہ بالکل گمنام مقام تھا - وہاں خیالات کو وسعت دینے - اساتذۂ فن سے ملنے اُن کے سبق سے فائدہ اُٹھانے اور نام و نمود پیدا کرنے کے ذرائع بالکل مفقود تھے - اس لئے ضرورت ہوئی کہ وہ لندن آئے اور کسب فن کرے - ہڈسن اُس زمانے میں ایک رونگار تھا - اُس کا شاگرد ہو گیا - مگر ہڈسن میں بجز چہرہ نگاری کے اور کوئی قابلیت نہ تھی - رینالڈ ایسا طبّاع نوجوان جس کے سینے میں حوصلوں اور اُمنگوں کا دریا جوش مارتا تھا - اُس کی تعلیم سے کیا فائدہ اُٹھا سکتا تھا - ہڈسن نے اس کی طبعی مناسبت کا اندازہ نہ پایا - ایک اوسط درجے کے اطالین مصوّر کی تصاویر اُس سے نقل کرانے لگا - رینالڈ نے اُسے ایسی خوبی سے نقل کیا کہ اُس میں اور اصل میں سرمو تفاوت نہ رہا - تاہم یہاں جوں توں کر کے اُس نے دو برس کاٹے - اِس مدت میں اُس نے بہت سی تصویریں بنائیں - کہتے ہیں کہ اُن میں اُس کی آنے والی شہرت کی جھلک موجود ہے - شاگرد

کا کمال دیکھ کر اُستاد کے دل میں رقابت کا جوش پیدا ہوا۔ آخر ایک تصویر جس پر رینالڈ نے اپنی تمام ہنرمندی صرف کر دی تھی دونوں آدمیوں میں علیحدگی کا باعث ہوئی۔ اُس نے بھی سمجھ لیا کہ حضرت اُستاد کو جو کچھ پڑھانا تھا پڑھا چکے۔ اپنے وطن کو لوٹ آیا۔ اس علیحدگی کو وہ ہمیشہ فال نیک سمجھا کرتا تھا۔ کیونکہ اگر وہ اور کچھ عرصے تک ہڈسن کی شاگردی میں رہتا تو اُس کی طبیعت میں بھی وہی نقالی کی عادت پڑ جاتی جو سچی مصوری کی جان لیوا ہے۔ اس بیکاری میں اُس نے تین سال کاٹے۔ مگر حق یہ ہے کہ اسی مشق نے اُسے رینالڈ بنا دیا۔ اس عرصے میں تصویر بنانے کے سوا اُسے اور کوئی کام نہ تھا۔ اسی زمانے میں اُس نے کتاب فطرت کی بھی تلاوت کی جو بعد کو اُس کی شہرت و نمود کا بڑا سبب ہوئی۔

ایک روز جبکہ وہ ہڈسن کے حلقۂ ارادت میں تھا۔ بازار میں نیلام دیکھنے گیا۔ بہت سے آدمی حلقہ باندھے کھڑے تھے یکایک "پوپ! پوپ!" کا غل مچا اور مشہور و مقبول شاعر پوپ آتا دکھائی دیا۔ لوگ تعظیماً اِدھر اُدھر ہٹنے اور جھک جھک کر سلام کرنے لگے۔ جس کے پاس سے وہ ہو کر گذرتا وہ اُس کا ہاتھ چھو لیتا۔ جب رینالڈ کی باری آئی تو پوپ نے خود اُس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر ہلا دئے۔ رینالڈ ہمیشہ اس واقعہ کو فخریہ بیان کیا کرتا تھا۔ اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عالموں کی اُس کے دل میں کتنی عزت تھی اور اُس زمانے کے عوام علما و شعرا سے کیسی محبت اور عزت سے پیش آتے تھے۔

شہر روم ہمیشہ سے مصوروں کا زیارت گاہ رہا ہے۔ یہی شہر ہے جہاں یوروپین فن مصوری کی داغ بیل ڈالی گئی تھی۔ پوپ لیو کے عہد مبارک سے یہ سرزمین ہمیشہ نامی مصوروں کا مسکن رہی ہے۔ رفیلی۔ میکائیل۔ انجیلو کریجیو جن کو اس فن کا خدا کہہ سکتے ہیں۔ اسی پاک خطے سے اُٹھے تھے۔ لیونارڈ اور ٹیشین اسی بستی کے رہنے والے تھے۔ اُنھوں نے جو تصویریں بنا کر وہاں کے نگارخانوں میں رکھدیں وہ آج تک لاثانی اور انتہائے فن سمجھی گئی ہیں۔ جیسے کالیداس ہومر اور فردوسی کی شاعری تقلید سے بلند تر ہے۔ اسی طرح یہ تصویریں بھی تقلید کی دستبرد سے محفوظ ہیں۔ سارے یوروپ کے شائقین فن ان تصاویر کو دیکھنے جاتے ہیں کوئی مصور اُس وقت تک مصور نہیں بن سکتا جب تک ان تصاویر کا اچھی طرح مطالعہ نہ کرلے۔ اگرچہ اُن پر چار چار صدیوں کی گرد و غبار پڑی ہوئی ہے۔ مگر اُن کی رنگت کی تازگی میں ذرہ بھر بھی فرق نہیں آیا۔ نہیں معلوم کہاں سے ایسے رنگ ملائے کہ مدھم ہونا نہیں جانتے۔

رینالڈ نے روم کی بہت تعریف سُنی تھی اور اُس کے دل سے لگی تھی کہ کسی طرح وہاں کی سیر کرے۔ مگر تہیدستی سے لاچار تھا۔ آخر اُس کے ایک جہازی دوست نے اُسے سیر روم کی دعوت دی اور دونوں دوست چل کھڑے ہوئے۔ پہلے پرتگال کے دارالخلافہ لسبن کی سیر کی بعد ازاں جبل الطارق پہنچے اور یہاں سے روم میں داخل ہوئے۔

اس شہر نے پہلے پہل اُس کے دل پر جو اثرات کئے اُس کا مفصل تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے "ایسا اکثر واقع ہوتا ہے کہ لوگ نگار خانۂ ویٹکن (یہ نگار خانہ پوپ لیو نے قائم کیا تھا اور اُس میں اُٹلی کے باکمال مصوروں کی تصویریں رکھی ہوئی ہیں) کی سیر کے بعد جب رخصت ہونے لگتے ہیں تو رہنما سے پوچھتے ہیں۔ یہاں رفیلی کی تصاویر کہاں ہیں۔ وہ ان حیرت انگیز تصویروں کو سرسری طور پر دیکھ جاتے ہیں۔ ان کا اثر اُن پر مطلق نہیں ہوتا۔ مَیں نے جب پہلے پہل اس نگار خانہ کی سیر کی تو سخت مایوسی ہوئی۔ یہی کیفیت میرے ایک مصوّر دوست کی بھی تھی۔ مگر گو مجھے ان تصاویر کے دیکھنے سے وہ لطف نہ آیا جس کی اُمید تھی۔ تاہم مجھے ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال نہ آیا کہ رفیلی کی شہرت دور کے ڈھول ہیں۔ میں نے اس معاملے میں اپنے ہی کو خطاوار ٹھہرایا۔ ایسی عجائب روزگار چیزوں سے اثر نہ لینا ایک نہایت شرمناک بات تھی مگر اس کا سبب یہ تھا کہ نہ تو میں اُن اُصولوں سے واقف تھا جن پر وہ نادر تصویریں بنائی گئی تھیں اور نہ کبھی کاملانِ فن کی تصاویر دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ مجھے اب معلوم ہوا کہ مصوّری کے متعلق جو خیالات میں انگلستان سے لایا ہوں وہ بالکل غلط اور بہکانے والے ہیں۔ ضرورت ہوئی کہ وہ سب خیالاتِ باطل دل سے نکال ڈالوں۔ آخر میں نے ایسا ہی کیا۔ اور باوجود مایوسی کے ایک تصویر کی نقل کرنے لگا۔ میں نے اُسے بار بار دیکھا۔ اُس کی نزاکتوں اور باریکیوں پر دیر تک غور کیا۔ تھوڑے ہی عرصہ

میں میرے دل میں ایک نیا مذاق اور نیا احساس پیدا ہو گیا"، کسی فن کے محاسن پہچاننے۔ سمجھنے اور اُن سے محظوظ ہونے کی لیاقت ایک ایسی چیز ہے جو بلا سخت محنت۔ توجہ اور تربیت کے کسی طرح نہیں حاصل ہو سکتی۔ صحیح شاعرانہ مذاق۔ یا دقیق اور اک موسیقی حاصل کرنے کے لئے انھیں باتوں کی ضرورت ہے۔ کون نہیں جانتا کہ غیر تربیت یافتہ نگاہیں سچے اور جھوٹے موتی، شیشہ کے ٹکڑے اور ہیرے میں بمشکل تمیز کر سکتی ہیں۔ یہ معمولی بات ہے کہ ایک گنوار بد مذاق شخص خوبصورت سی خوبصورت جھیل۔ اونچے سے اونچے پہاڑ۔ نادر سے نادر باغوں سے اُسی طرح بے خبر رہتا ہے جیسے روکھی روکھی اور جھونپڑے سے۔ طلوع آفتاب کی رنگ آمیزیاں۔ چاندنی رات کی دلفریبیاں۔ کنار دریا کی جاں بخش ہوا اور سبزہ کی مخملی سبزی اُس کے لئے معمولی باتیں ہیں۔ اُس کو ان خوبیوں کا ادراک ہی نہیں۔ حالانکہ یہی چیزیں ہیں جو ایک تربیت یافتہ مذاق پر وجد کا عالم طاری کر دیتی ہیں۔

رینالڈ نے ان تصاویر کی خوبیوں پر بڑی شرح و بسط سے محاکمہ کیا ہے۔ کہیں اُن کی رنگ آمیزیوں کے اسرار سربستہ کھولے ہیں کہیں مختلف اساتذۂ فن کے کمالات کا موازنہ کیا ہے۔ اٹلی میں مصوّروں کے کئی رنگ ہیں۔ روم وینس۔ فلورنس۔ میلان۔ ہر ایک جدا جدا رنگ کے مرکز ہیں۔ رینالڈ نے ہر رنگ کی خوبیوں اور باریکیوں کی مفصّل تشریح کی ہے لیکن خود اپنی تصویروں

میں کسی خاص اسکول کی تقلید نہیں کی۔ مصوّر کو اپنے موازنہ اور مشاہدہ کی قوتوں پر خوب زور ڈالنا چاہیئے۔ یہ لازم نہیں ہے کہ وہ اپنی تصاویر کے لیئے دوسروں کی کتابوں میں قواعد ڈھونڈھے۔ اُسے تصاویر کے مطالعے سے اپنے قاعدے آپ نکالنا چاہیئے۔ قاعدے تصاویر سے وضع ہوئے ہیں۔ نہ کہ تصویریں قواعد سے۔ رینالڈ کہتا ہے "چونکہ نقالی میں دماغ کو کوئی تکلیف نہیں ہوتی وہ رفتہ رفتہ مضمحل ہو جاتا ہے۔ اور وہ ایجاد و اختراع کے قوے جن کو خاص طور پر کام میں لانا چاہیئے۔ اِس نامشقی سے ضعیف ہو جاتے ہیں"
وہ تین سال اٹلی میں رہا۔ اور ہر رنگ اور ہر صنعت کی تصاویر و مرقعوں کا مطالعہ کیا مگر انگلستان پہنچکر اُس نے جس صنعت کو اپنی شہرت کا ذریعہ بنایا وہ شبیہہ نگاری تھی۔ اِس کی ایک وجہ تو غالباً یہ ہوگی کہ اُس وقت انگلستان میں اگر کچھ قدر تھی تو اِسی صنعت کی۔ جیسا کہ ہوگارتھ کی ایک تصویر سے ظاہر ہوتا ہے۔
دوسری وجہ یہ تھی کہ رینالڈ نے طبعاً وہ بلند پروازی اور مضمون آفرینی نہ پائی تھی جس کے بغیر تاریخی یا مذہبی تصاویر کا بنانا غیر ممکن ہے۔ روم سے واپس آنے پر اُس نے کچھ دنوں وطن کی سیر کی۔ بعد ازاں لندن میں سکونت پذیر ہوا۔ مگر جب اُس نے دو ایک تصویریں بنائیں تو مصوّروں نے غُل مچانا شروع کیا کیونکہ ان تصاویر میں مروّجہ رنگ اور انداز کی پابندی نہ کی گئی تھی تاہم یہ شور و غل عرصہ تک قائم نہ رہ سکا۔ جب خریدار سودا اچھا

دیکھتا ہے تو خود مول لیتا ہے۔ اُسے پھر اس کی پروا نہیں ہوتی کہ دوسرے اہل فن اُس کی نسبت کیا کہتے ہیں۔ معزز رؤسا اور شریف لیڈیاں جوق جوق آنے لگیں۔ ہر رئیس کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ مصوّر مجھے ہیرو یا فلاسفر بنا کر دکھائے۔ ہر ایک لیڈی چاہتی تھی کہ میں حور بہشتی بنادی جاؤں۔ میرے چہرے کی جھرّیاں مطلق نظر نہ آئیں۔ رینالڈ بلا کا تیز نگاہ تھا۔ ہر شخص کی خواہشیں پوری کر دیتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ شبیہہ نگاروں کے لئے ایسے مزاج کی ضرورت ہے جیسا ڈاکٹروں کا ہوتا ہے۔ انھیں ہر ایک بات میں اپنے خریداروں کی نازبرداری کرنا پڑتی ہے۔

۱۷۵۴ء میں رینالڈ کی ڈاکٹر جانسن سے دوستی ہوگئی۔ رینالڈ ڈیون شائر گیا ہوا تھا۔ وہاں اُسے ایک دوست کے یہاں ڈاکٹر ممدوح کی لکھی ہوئی واٹر سیوج شاعر کی سوانح عمری نظر آئی۔ اُس میں ایسا جی لگا کہ اس نے کھڑے کھڑے ختم کر کے دم لیا۔ اُس وقت سے اُسے اس دلچسپ کتاب کے مُصنّف سے نیاز حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوگیا۔ اتفاق سے ایک رئیس کی مرگ ناگہانی کے موقع پر دونوں آدمیوں سے ملاقات ہوگئی۔ اُس شخص کی ذات سے بہت سے آدمیوں کو فیض پہنچتا تھا اور لوگ اُس کے دل و دماغ کے اوصاف حسنہ کی تعریفیں کر رہے تھے۔ رینالڈ کی زبان سے نکلا۔ بیشک یہ سانحہ دردناک تو ہے مگر اب بہت سے لوگ احسان کے بوجھ

سے سبکدوش ہوگئے۔ حاضرین کو یہ ریمارک ناگوار معلوم ہوا۔ مگر ڈاکٹر جانسن بہت خوش ہوئے۔ اور لوگوں سے کہا کہ یہ شخص ذی خیال معلوم ہوتا ہے۔ جب رینالڈ گھر لوٹا تو ڈاکٹر صاحب اُس کے ساتھ ساتھ آئے۔ اِس طرح اُس دوستی کا آغاز ہوا جو دونوں بزرگوں کے بیننے جی بڑے اخلاص سے رنبھی۔ ڈاکٹر صاحب کا مزاج روکھا۔ پُر نخوت اور کسی قدر کھُرّا تھا۔ اُن کی زندگی کا بڑا حصہ اب تک ناقدری۔ عُسرت اور تنہائی میں کٹا تھا۔ اونچے طبقے سے غیر مانوس رہنے کے باعث نشست و برخاست۔ رفتار و گفتار کے مراسم سے بھی وہ واقف نہ تھے۔ اس لئے رُوسا کے طبقے میں اُن کی بہت قدرو منزلت نہ ہوتی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ اُن کے علم و فضیلت کا رُعب سب کے دلوں پر چھایا ہوا تھا۔ مگر اس کے ساتھ ہی اُن کا بھونڈا طور وطریق۔ بدنما چہرہ۔ بےنخوت حاضر جوابی اور بےلاگ صاف گوئی اُنھیں رُوسا کے دلوں میں جگہ نہ پانے دیتی تھی۔ اہلِ زر خواہ عقل و دانش میں صفر ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ نہیں بھولتے کہ ہم رئیس ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ علم یا فضیلت کوئی ہو جب سائل بنکر آئے تو خوشامد اور نازبرداری کا سامان ساتھ لیتا آئے۔ ڈاکٹر کی خلقت میں یہ بات نہ تھی۔ وہ جب اُن کے حلقے میں آتا تو مسکرا کر اور سر جھکا کر اعزاز کا طالب نہ ہوتا تھا بلکہ مسندِ افتخار کو وہ اپنی قابلیت کا صلہ سمجھتا تھا۔ اور جوں جوں زمانہ گذرتا گیا اور ڈاکٹر

کی روشن دماغی کے جوہر کھلتے گئے توں توں باوجود جھلّے پن اور ترش بیانی کے اعلیٰ و ادنیٰ سبھی اُن کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے پر مجبور ہوئے۔ برعکس اِس کے رینالڈ خلقتہً ہنس مکھ اور خوش اخلاق تھا اور ضرورتاً اعلیٰ طبقہ کی معاشرت کی پیروی کرتا تھا۔

رینالڈ کو اساتذۂ سلف سے سچّی عقیدت تھی۔ رفائیل اور میکائیل انجیلو کو وہ کسی ولی اللہ یا پیغمبر سے کم نہ سمجھتا تھا۔ کہتا ہے "تصاویر میں بے تکلّفی کا ہونا کمال فن ہے اور اُس کی کمی خواہ رنگ میں ہو یا اصل تصویر میں نقص فن ہے۔ رنگ دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک پاکیزہ۔ صبیح اور مدّھم۔ دوسرا شوخ بھڑکیلا اور آنکھوں میں کھُپ جانے والا۔ اہل کمال پہلے رنگ کا استعمال کرتے ہیں۔ اور معمولی پیشہ ور دوسرے رنگ کا۔ بعض مصوّروں کا خیال ہے کہ ایسی سادگی تصویر کو بے رونق اور اندھا چراغ بنا دیتی ہے مگر یہ نقص فن ہے۔ اِس سے تصویر کی سکون بخشنے والی قوت میں فرق آجاتا ہے"۔

رینالڈ کو علما کی صحبت کا بڑا شوق تھا۔ شام کو چار بجتے ہی اُس کی میز آراستہ کر دی جاتی اور اُس کے گرد اہلِ کمال جمع ہونے لگتے بشعرا اپنے اشعار وہاں سناتے اور قدر دانوں سے داد سخن پاتے۔ جانسن اُس جماعت کے سرغنہ تھے۔ گولڈ اسمتھ بھی کبھی کبھی آنکلتے اور اپنی بے تکلف سادہ باتوں اور طفلانہ حرکتوں سے مجلس کی زندہ دلی میں اضافہ کرتے۔ زبردست مدبّر اور مقرّر اڈمنڈ برک بھی اکثر نظر آتے

تھے مگر وہ طبیعت کے بہت شوخ اور چلبلے نہ تھے۔ رینالڈ نہ صرف علما کی عزت کرتا تھا بلکہ اکثر اُن کی مالی اعانت بھی کرتا رہتا تھا۔ جس شخص کی تعریف جانسن اور برک کے قلم سے نکلی ہو اُس کی حیات جاوید میں زمانہ کب مخل ہو سکتا ہے۔

۱۷۶۸ء میں رائل اکاڈمی کی بنیاد پڑی۔ یہ انگلستان میں فن مصوری کی باقاعدہ تعلیم کی پہلی کوشش تھی جس کی آب و تاب میں کئی صدیاں گذر جانے پر بھی کوئی فرق نہیں آیا۔ رینالڈ اِس تعلیم گاہ کا آخر وقت تک پریسیڈنٹ رہا۔ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ رینالڈ کے دل میں شاعر پوپ کی بہت عزت تھی۔ پوپ کو جب فکر سخن سے فرصت ملتی تو مصوری کیا کرتے تھے۔ ایک دستی پنکھے پر اُنھوں نے ایک یونانی قصے کی تصویر بنائی تھی۔ یہ پنکھا بازار میں نیلام کے لئے آیا۔ رینالڈ کو جب خبر ملی تو اُس نے ایک آدمی بھیجا کہ وہ تیس پونڈ تک بولی بول کر اِس تحفہ کو خرید لے۔ مگر یہ حضرت تیس ہی شلنگ سے آگے نہ بڑھے۔ آخر ایک خریدار نے اُسے دو پونڈ پر لے لیا۔ رینالڈ کو اِس پنکھے کا اتنا شوق تھا کہ اُس نے دوگنی قیمت دے کر اُسے نئے خریدار سے لے لیا۔

ایک دعوت کے موقع پر جانسن۔ برک۔ گیرک۔ گولڈ اسمتھ سب جمع تھے۔ آپس میں خوش گپیاں ہو رہی تھیں۔ یکایک کسی نے کہا آؤ ایک

دوسرے کی موت کا کتبہ کہیں مگر شرط یہ ہے کہ فی البدیہہ ہو۔ اِس پر لوگوں نے طبع آزمائی شروع کی۔ گیرک کو شرارت جو سوجھی تو آپ نے دو تین شعر ہزلیات کے طور پر کہے۔ جن میں گولڈاسمتھ کی خبر لی گئی تھی۔ گولڈاسمتھ کو یہ شرارت بہت ناگوار معلوم ہوئی۔ اس کے جواب میں اُس نے "انتقام" کے نام سے ایک پُرزور نظم لکھی۔ افسوس ہے کہ اِس مادر زاد شاعر کی یہ آخری نظم تھی۔ ایسا بے فکر ایسا رندانہ مزاج اور اِس کے ساتھ ہی ایسا خوش فکر شاعر انگریزی زبان میں پھر پیدا نہ ہوا۔ یہ ذہانت جس قالب میں پنہاں تھی وہ بہت خوبصورت نہ تھا۔ رینالڈ نے گولڈاسمتھ کی جو تصویر کھینچی ہے۔ اُس میں وہ نہایت کمزور نظر آتا ہے۔ مگر مصوّر کی بہن کا قول تھا کہ رینالڈ نے کسی تصویر میں اِتنی خوشامد نہیں صرف کی جتنی کہ اس تصویر میں۔ صورت اور معنی میں تفاوت ہونا غیر معمولی بات نہیں ہے۔

۱۷۷۳ء میں رینالڈ نے Uglino کی تصویر کھینچی۔ یہ اٹلی کے مشہور شاعر ڈینٹی کی ایک تصنیف کا ہیرو ہے۔ مگر رینالڈ ایسا مصوّر جو لیڈیوں کے ہونٹ اور گردن آراستہ کرنے میں اپنا کمال صرف کرتا ہو رنج و مصیبت کی داستان کیونکر بیان کر سکتا۔ ڈینٹی کا مستقل مزاج ہیرو رینالڈ کی تصویر میں قحط زدہ اور خستہ حال نظر آتا ہے۔ اُس کے آہنی استقلال اور نفس عالی کا بالکل اظہار نہیں ہوتا مگر رینالڈ کی پنسل سے جو کچھ نکلتا تھا اُس کی قدر دانی یقینی تھی۔ ایک رئیس نے

اس تصویر کو چار سو پونڈ میں خریدا۔ اُسی سال جولائی کے مہینے میں رینالڈز آکسفورڈ کی سیر کو گیا۔ جہاں اُس کی بڑی تواضع و تکریم ہوئی اور ڈاکٹر آف لا کا اعزازی لقب ملا۔ یہاں اُس کی ملاقات ڈاکٹر بیٹی سے ہوئی۔ جس کا شمار اُن دنوں اصحاب فضیلت میں تھا۔ بیٹی نے "صداقت کی ناتبدیل پذیری" پر ایک کتاب لکھی تھی جس میں اُس نے گبن۔ والٹیر اور ہیوم ایسے آزاد خیال علما کو نشانۂ ملامت بنایا تھا۔ رینالڈز چونکہ خود فلسفہ سے مانوس نہ تھا اُس کے دل میں ڈاکٹر بیٹی کی بہت زیادہ وقعت ہو گئی۔ جب وہ لندن آیا تو اُس نے بیٹی کی ایک شبیہہ کھینچی۔ جو اُس کی بہترین تصاویر میں ہے۔ بیٹی آکسفورڈ کے علما کا لباس پہنے بیٹھا ہے۔ "صداقت کی ناتبدیل پذیری" اُس کے بغل میں ہے۔ اُس کے پہلو میں سچائی کا فرشتہ کھڑا ہے جو کفر۔ الحاد اور نافرمانی پر غالب آ رہا ہے۔ اِن مغلوب صورتوں میں سے ایک بہت لاغر اور عیش پرست نظر آتی ہے۔ یہ کفر کی صورت ہے اور والٹیر سے ملتی ہے۔ دوسری فربہ اور تخیم شخیم ہے۔ یہ الحاد کی تصویر ہے۔ اور ہیوم سے مشابہ ہے۔ تیسری صورت نافرمانی کی ہے۔ جو گبن کا عکس معلوم ہوتی ہے۔ گولڈ اسمتھ نے جب یہ تصویر دیکھی تو اُس کے غصے کی کوئی انتہا نہ رہی۔ بولا "آپ ایسے باکمال آدمی کے لئے اس حد تک خوشامد پر اُتر آنا نہایت مذموم ہے۔ آپ کو والٹیر جیسے عالی دماغ آدمی کو بیٹی جیسے پوچ گو کے مقابلے میں ذلیل کرنے کی کیونکر جرأت ہوئی۔ بیٹی اور اُس کی کتاب دس

برس میں طاق نسیان پر رکھ دی جائے گی۔ مگر آپ کی تصویر اور والٹیر کی شہرت ہمیشہ زندہ رہے گی۔" گولڈ اسمتھ نے بہت صحیح کہا تھا۔ بیٹی کا اب کوئی نام بھی نہیں جانتا۔ والٹیر، ہیوم اور گبن کے نام آفتاب کی طرح روشن ہیں۔

رینالڈ کی تصویروں کا رنگ دیرپا نہ ہوتا تھا۔ شوخ اور بھڑکیلے رنگوں کو وہ خود ناپسند کرتا تھا۔ مگر اُس کی بیشتر تصویریں شوخ ہی نظر آتی ہیں۔ اس کا باعث غالباً یہ ہے کہ اُسے اپنے خریداروں کی خاطر داری منظور تھی اور اُس زمانے کا مذاق شوخ تصویروں کو زیادہ پسند کرتا تھا۔ وہ اپنے رنگ سازی کے اُصولوں اور قاعدوں کو سب سے پوشیدہ رکھتا تھا۔ عزیز سے عزیز شاگردوں کو بھی اُس نے اپنی ترکیبوں کے اجزا نہ بتلائے۔ اُس کا یہ بُخل بالکل ہندوستانی صناعوں کی طرح تھا۔ جو اپنے گُر اور کرتب اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ ہاں وہ خود اساتذۂ سلف کے رنگ وروغن کے اُصولوں کی تحقیقات و دریافت کیا کرتا تھا۔ اُس نے اپنی کمائی کا بہت بڑا حصّہ فنِ مصوری کے اعلیٰ نمونوں کے خریدنے میں صرف کیا۔ اگر اُس کا ذخیرہ آج تک موجود ہوتا تو آج اِس فنِ لطیف کا بیش بہا خزانہ سمجھا جاتا۔ مگر رینالڈ نے اُنھیں زینت کے لئے نہ خریدا تھا۔ بلکہ تحقیق وجستجو کے لئے وہ ایک ایک تصویر کی جرّاحوں کی طرح تشریح کرتا تھا۔ تاکہ اُسے معلوم ہو جائے کہ استر کس رنگ کا ہے۔ اس پر کون رنگ دیا گیا اور کون کون سے رنگ یکجا ملائے گئے۔ اس امتحان کے

بعد تصویریں کسی کام کی نہ رہ جاتی تھیں۔

رینالڈ کی تصویروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ فطرت کا مطالعہ بڑی غائر نگاہ سے کرتا تھا۔ اپنے کمال کے ہیرے مختلف مخازن سے نکالتا۔ کیسی ہی حقیر رائے کیوں نہ ہو اُس پر توجہ ضرور کرتا۔ بچّے تو گویا اُس کے اتالیق تھے۔ اُس کا قول تھا کہ بچّوں کے اشارے اور کنائے۔ انداز اور طریق بناوٹ سے خالی ہونے کے باعث دل پسند ہوتے ہیں۔ جب بچّے اُس کے نگارخانہ میں آتے تو وہ اُن کی حرکتوں کو بڑے غور سے دیکھا کرتا۔ اور وہ جب مارے خوشی کے پھول اُٹھتے اور تصویروں کے وضع اور انداز کی نقل کرنے لگتے تو وہ اس نظارے سے بہت محظوظ ہوتا۔ اپنی ایک یادداشت میں لکھتا ہے۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کسی غیر واقف کار شخص کی رائے نقاد پر کے بارے میں کیوں نہ تسلیم کی جائے۔ مثلاً اگر کوئی معمولی آدمی کسی تصویر کو دیکھ کر کہے کہ اس کا آدھا چہرہ کیوں سیاہ ہے۔ یا ناک کے نیچے سیاہ دھبّہ کیوں ہے۔ تو میں یہ نتیجہ نکالوں گا کہ رنگ گہرا ہو گیا ہے۔ یا اچھی طرح صاف نہیں کیا گیا۔ اگر یہ رنگ فطرت کے مطابق ہوتے تو اُن کی طرف کسی کی توجہ نہ ہوتی۔"

اُس کی شہرت روز بروز عالمگیر ہوتی جاتی تھی۔ ۱۷۸۶ء میں رُوس کی نامور ملکہ کیتھرائن نے اُس سے ایک تصویر کی فرمائش کی۔ رینالڈ نے مہینوں کے غور و خوض کے بعد ایک ایسا مضمون پسند کیا جو جدّت اور دلچسپی کے لحاظ سے

معمولی ہے۔ ملکہ کیتھرائن استقلال اور زور دماغ میں اپنا نظیر نہ رکھتی تھی۔ تاریخ اُس کی شاہد ہے۔ اس لیے رینالڈ نے شیر خوار ہرکیولیس کو دو سانپوں کا گلا گھونٹتے دکھایا۔ اگرچہ کیتھرائن کو ایسی پیچیدہ تصویروں کے سمجھنے کا دماغ نہ تھا۔ تاہم اُس نے خوب دل کھول کر قدر دانی کی۔ ۱۵۰۰ پونڈ معاوضہ کے طور پر اور ایک سونے کی صندوقچی جس میں اُس کی شبیہہ بند تھی بطور تحفہ کے بھیجی۔

اُنھیں دنوں انگلستان کے ایک اولوالعزم پبلشر نے شکسپیر کے باتصویر ایڈیشن نکالنے کا قصد کیا۔ رینالڈ نے اُس کے لیے تین تصویریں بنائیں۔ پہلی تصویر اُس ظرافت کے جان کی ہے جس کا نام انگریزی ادب میں ضرب المثل ہوگیا ہے۔ پک ایک نہایت شوخ اور چُلبلی طبیعت کا مسخرہ ہے جو رنگیلے شاہ ہنری ہشتم کا جلیس و انیس ہے۔ رینالڈ نے اُس تصویر میں اعجاز کر دکھایا۔ اُس کا ہاتھ کوئی شرارت آمیز شوخی کرنے کے لیے آمادہ نظر آرہا ہے اور آنکھوں سے کسی کو چھیڑنے۔ کسی سے کوسے جانے اور کسی سے گالیاں سُننے کی خواہش ٹپک رہی ہے۔ دوسری تصویر میکبتھ کی ہے جس میں حوض اور چڑیلوں کا نظارہ دکھایا گیا ہے۔ اور اِسی صنف میں اُس کی بہترین تصویریں موجود ہیں۔

سرجوشوا اب ۶۶ برس کا ہوگیا تھا۔ اور اگرچہ دولت وجاہ میں کوئی کمی

نہ واقع ہوئی تھی۔ مگر دوستوں کے اُٹھ جانے کا صدمہ دنیا وی نعمتوں کی خوشی سے بہت زیادہ تھا۔ گولڈاسمتھ۔ جانسن۔ برک۔ گیرک۔ سب ایک ایک کرکے اُس کا ساتھ چھوڑتے گئے۔ یہاں تک کہ ۱۷۸۹ء میں اُس کے نام بھی پیامِ مرگ آپہنچا۔ آنکھوں کی بینائی جاتی رہی۔ ۱۷۹۲ء میں اُس نے اِس دارِ فانی سے عالمِ جاودانی کی طرف کوچ کیا۔

رینالڈس سے نہ صرف متعدد اعلیٰ درجے کی شبیہیں یادگار ہیں۔ بلکہ اُس کی فاضلانہ تقریریں اور اُس کی شاعرانہ و تاریخی تصاویر بھی اُس کے کمال کا سکہ ہمیشہ دلوں پر بٹھاتی رہیں گی۔ تقریروں سے اُس کا منشا، حوصلہ مند نوجوان مصوّروں کے دلوں پر اس فن کی عظمت قائم کرنا۔ اُن میں ریاضت اور مطالعہ کی عادت پیدا کرنا اور اُن پر تصویر نگاری کے برگزیدہ اُصولوں کا روشن کرنا تھا۔ کیا کیا ترکیبیں کی جائیں۔ کن کن اُصولوں کی پابندی کی جائے۔ دھوپ چھاؤں کا کیونکر استعمال کیا جائے کہ تصویروں میں وہ جادو کا سا اثر پیدا ہو جائے جو اساتذۂ سلف کی تصاویر میں پایا جاتا ہے۔ وہ محض ذہن اور مناسبت طبعی کا قائل نہ تھا۔ اُس کی تلقین یہ تھی کہ اِس فن میں کمال حاصل کرنے کے لئے شبانہ روز کی مشقت۔ مسلسل غور و خوض اور کمالِ فن کی تصاویر سے سچّی عقیدت درکار ہے۔

# ٹامس گینس برو

فن مصوری کے مختلف اصناف میں قدرت نگاری کو سب سے زیادہ ادق اور مشکل قرار دیا گیا ہے۔ اور چہرہ کشی کو سب سے آسان۔ اگر رینالڈ جو انگریزی فن مصوری کا خدا سمجھا جاتا ہے، شبیہہ نگاری کو انتہائے عروج پر لے گیا تو گینس برو نے قدرت نگاری کو کمال کے مرتبہ تک پہنچایا۔ رینالڈ کے قبل انگلستان میں وینڈائک اور وینس جیسے جیسے اہل کمال شبیہہ نگاری کا رواج ڈال چکے تھے۔ اور عام مذاق بھی اسی صنف کی جانب مائل تھا۔ گینس برو کے قبل انگلستان میں منظر نگاری کی کسی نے جرأت نہ کی تھی اور اس لحاظ سے وہ اپنے ملک میں اس صنف کا بانی اور موجد کہا جا سکتا ہے۔

ٹامس گینس برو ۱۷۲۷ء میں صوبہ سفک کے ایک مقام میں پیدا ہوا اس کا باپ بزاز تھا اور اپنی دیانت، خوش معاملگی اور جفاکشی کے لئے اطراف میں مشہور تھا۔ اس کی ماں عام ماؤں کی طرح محبتی، سنجیدہ مزاج اور اپنے لڑکوں پر نازاں تھی۔ یہ خاندان وہاں بہت اعزاز سے دیکھا جاتا تھا۔ ٹامس اپنے تین بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ لیکن ذہانت اور مزاج کی تیزی میں سب سے بڑھکر تھا۔

فن مصوری کا شوق وہ ماں کے پیٹ سے لیکر آیا تھا۔ اُسے اس سے نظرتی مناسبت تھی۔ اس کے مکان کے قریب ایک نہایت خوبصورت چار میل کے وسعت کی جھیل تھی اُس کے کنارے کنارے بڑے بڑے پراتم چھتنار سایہ دار درخت لگے ہوئے تھے۔ جھیل کے پیچیدہ نالے بڑی دلربایانہ ادا سے خوش خرامی کیا کرتے تھے۔ ٹامس اسکول جاتا تو انھیں دلفریب مقاموں کے سیر سپاٹے کیا کرتا۔ اس پُر بہار چشم فریب منظر کو دیکھتے دیکھتے اُسے مناظر قدرت سے عشق سا ہوگیا اور آخر وہ منظر نگاری میں کمال کو پہنچا۔ اب بھی وہ گوشے۔ وہ درخت موجود ہیں ہے۔ جہاں بیٹھ کر وہ پھولوں۔ پتوں۔ درختوں اور دلفریب منظروں کی تصویریں کھینچا کرتا تھا اور کہا جاتا ہے کہ اُن میں آئندہ زمانے کے کمال کے آثار موجود ہیں۔ صرف مشق کی کمی ہے۔ دس ہی برس کی عمر میں اُس کے ہاتھوں کی تیزی اور آنکھوں کی صفائی کے جوہر کھلنے لگے اور بارہ برس کی عمر میں تو وہ مصور پُرفن بن گیا۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ اُس کی علمی تحصیلات برائے نام ہونگی۔ مگر جو لوگ قدرت سے طبّاع پیدا ہوتے ہیں۔ وہ اپنی کتابی معلومات کی کمی کو اپنے ذاتی تجربہ اور عینی مشاہدات سے بہت جلد پورا کر لیا کرتے ہیں۔

کچھ عرصہ تک تو ٹامس اپنے مشغلات کو اپنے والدین سے چھپاتا رہا مگر کبتک چھپاتا۔ ایک روز اُس کے جی میں آیا کہ جھیل کے کنارے بیٹھ کر خوب سیر قدرت کیجئے۔ مگر اسکول بند نہ تھا۔ آخر اپنے والد کی طرف سے ایک خط ماسٹر کے پاس لکھا۔

کہ ٹامس کو آج کی چھٹی دیدیجئے۔ اس وقت تو چکما چل گیا۔ مگر بعد کو جب راز کھُلا اور ماسٹر نے ٹامس کے باپ کے پاس وہ خط اس لئے بھیجا کہ بیٹے کی تنبیہہ کی جائے تو باپ نے بڑی حسرت سے کہا یہ چھوکرا تو ایک ہی شاطر نکلا یہ کبھی نہ کبھی ضرور پھانسی پر چڑھے گا۔ مگر جب گاؤں والوں نے کہا کہ اُس دن تو ٹامس جھیل کے کنارے بیٹھ کر تصویریں بنا رہا تھا اور باپ نے اُن تصویروں کو دیکھا تو حسرت کی جگہ دلی مسرت پیدا ہوئی۔ بول اُٹھا " ٹامس تم تو مصوّر ہو گئے"۔

ایک بار وہ اپنے باپ کے باغیچہ میں بیٹھا ہوا ایک پُرانے ٹھونٹھے لیکن نظر فریب درخت کی تصویر اُتار رہا تھا کہ اُس نے گاؤں کے ایک آدمی کو چہار دیواری کے اوپر سے چند سُرخ، پکّے ہوئے شفتالوؤں کی طرف للچائی نگاہوں سے تاکتے دیکھا۔ آفتاب کی آڑی کرنیں اُس کے خواہشمند چہرے پر کچھ اس طرح پڑ رہی تھیں کہ اُس پر دھوپ چھاؤں کی نہایت دلفریب کیفیت پیدا ہو رہی تھی۔ ٹامس نے اُسی وقت اُس کا چہرہ بھی اتار لیا۔ بعد ازاں جب اُس کے باپ نے یہ تصویر دیکھی تو بہت خوش ہوا، اور کسان کو بُلا کر کہا ذرا اپنی صورت دیکھو۔ بیچارہ کسان بہت نادم ہوا۔ یہ تصویر ٹامس کو خود ایسی بھلی معلوم ہوتی تھی کہ اُس نے بہت عرصہ کے بعد اُسے رنگ و روغن سے آراستہ کیا اور اہل فن نے اُس کی بڑی تعریف کی ایسی عجلت کے ساتھ اُس نے جو تصویریں بنائی ہیں اُن میں آزادی اور بے تکلّفی ایسی ہے کہ

وہ اُس کی بہترین تصویریں ہیں۔
اُس کے زمانۂ طفولیت کے خاکوں میں اب کوئی باقی نہیں مگر کسی وقت وہ سینکڑوں کی تعداد میں تھے۔ چرتی ہوئی گائیں۔ شاخوں پر چہچہاتی چڑیاں۔ پانی پیتی ہوئی بھیڑیں بانسری بجاتا ہوا کسان، اگاٹے کو دانہ کھلاتی ہوئی اہیرن۔ دریا کے کنارے کی فضا خوشنما گھاٹیاں کوئی ایسی نہ تھیں کہ جو اُس کی پنسل کے زیرِ مشق نہ ہوئی ہوں۔ وہ اُن کے خاکے کھینچ کھینچ کر رکھتا جاتا کہ آگے چلکر اُن کی تصویریں بناؤں گا۔ مگر جب اُسے اُس فن میں کمال ہوا تو یہ خاکے نگاہ میں نہ جچے۔ اُنھیں یار دوستوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک نقادِ فن نے اُن خاکوں میں سے ایک کو دیکھا تھا۔ جس میں ایک درخت کا کُنج بنا ہوا تھا۔ اُس کی رائے تھی کہ وہ اپنی قسم میں بے نظیر تھا۔

گینز برو جب چودہ برس کا ہو گیا اور فنِ تصویر کی طرف اُس کے رُجحان کی کافی سے زیادہ شہادت مل چکی تو لوگوں کی صلاح ہوئی کہ اُسے اِس فن سے زیادہ واقفیت حاصل کرنے کے لئے کسی مصوّر کی خدمت میں بھیجا جائے۔ ہوگارتھ کے احباب میں ایک شخص ہے مین نامی تھا۔ اُس کی اتالیقی میں ٹامس سپرد کیا گیا۔ اُس کی ذہانت، جدّت اُس کی منکسر مزاجی اور چابکدستی نے اُسے احباب کی نگاہوں میں بڑا وقار دے رکھا تھا۔ مگر ابھی تک اُس کے کسی جوہر شناس کو یہ خیال نہ ہوا تھا کہ وہ اس فن میں اعلیٰ ترین مدارج پر پہنچ سکے گا۔ وہ سمجھتے تھے کہ کسی چھوٹے موٹے شہر میں وہ اس پیشہ سے اپنے گذارے بھر کو کما لیگا۔ ٹامس

کو شروع ہی سے چہرہ نگاری سے رغبت نہ تھی اور تاریخی تصاویر میں دماغ ریزی بہت اور نفع قلیل تھا۔ غالباً وہ اِن دونوں اصناف میں طبع آزمائی کرنے کے لئے بنایا ہی نہیں گیا تھا۔ منظر نگاری سے اُسے فطری مناسبت تھی اور اسی صنف کو چمکانے اور اِسی کی بدولت خود چمکنے کا اُس نے تہیہ کر لیا تھا۔ انگریزی مصوری کے میدان میں اب تک اِس کرتب کا جاننے والا کوئی نہ نکلا تھا۔ بلاشک وِلسن کی طبیعت اس جانب بہت مائل اور موزوں تھی۔ مگر وہ کسب معاش کی ضرورتوں سے مجبور ہو کر چہرہ نگاری کرنے لگا تھا۔ ٹامس چار برس تک لندن میں رہا اور روغن آمیزی و رنگ سازی کے فن سے ماہر ہو کر اپنے وطن لوٹ آیا۔

وہ اب اپنے اٹھارہویں سال میں تھا۔ اُس کی شہرت اب احباب کے حلقہ سے نکلکر اطراف میں پھیلنے لگی تھی۔ اُس کی خوش مزاجی اُس کی مردانہ وجاہت اور اُس کی بُذلہ سنجی ایسی سندیں تھیں جو اُسے ہر ایک حلقہ میں ممتاز جگہ دلا سکتی تھیں۔ ایک روز وہ شام کو سیر کر رہا تھا کہ حُسن اتفاق سے ایک درخت کی خوبصورتی نے اُسے اپنی جانب متوجہ کیا۔ اس کے نیچے بھیڑیں خاموش آرام کر رہی تھیں اور اوپر فاختائیں اور کبوتر بسیرا لے رہے تھے۔ وہ وہیں زمین پر بیٹھ گیا اور اِس منظر کا خاکہ اُتارنے لگا کہ ایک نوجوان حسینہ بھی گھومتی ہوئی آپہنچی۔ نوجوان مصور نے اُسی وقت اُس کو اس تصویر میں اور نیز اپنے دل میں جگہ دیدی۔ تھوڑے دنوں کے بعد دونوں کی شادی ہوگئی۔ اور وہ دونوں اسپیوک کے

مقام پر ایک چھوٹا سا مکان ۶ پونڈ سالانہ کے کرایہ پر لے کر بسر کرنے لگے۔ میاں بیوی ایک دوسرے کے شیدا تھے۔ اور گو ابھی پیشہ سے بہت قلیل آمدنی ہوتی تھی مگر یہ کفایت شعار سلیقہ مند عورت دلوں میں بدمزگیاں نہیں پیدا ہونے دیتی تھی۔

یہاں ٹامس کی ملاقات مسٹر فلپ سے ہوئی جو ایک قلعہ کے گورنر تھے مسٹر فلپ طبیعت کے رئیس تھے اور صحبت و مجلس کے شیدا۔ وہاں بہتر مقام میں صحبت آرائیوں کا کوئی موقع نہ تھا اور نہ ایسے لوگ تھے جو صحبت کو گرما سکیں۔ ایسے لوگوں کو تو کچھ شہروں ہی سے خصوصیت ہے۔ اُس نے جب ٹامس کو ایسا خلیق ظریف طبع اور پُرفن پایا تو اُس سے راہ و رسم پیدا کی۔ ٹامس بھی اُسی دیار میں ابھی تک گمنام تھا اور اس کی ضرورت تھی کہ رؤسا کے حلقہ میں اُس کی رسائی ہو، لوگ اُس کو جانیں۔ چنانچہ اُس گورنر کی سرپرستی اُس نے قبول کرلی۔

فلپ اگرچہ نیک مزاج تھا۔ مگر اُس کے مزاج میں رعونت بہت زیادہ تھی جس قدر کرتا اُس سے زیادہ کہتا۔ وہ ایسا آدمی نہ تھا کہ کسی کے ساتھ احسان کرے اور بھول جائے بلکہ ایک مرتبہ بھی کسی کے ساتھ کوئی سلوک کر لیتا تو بار بار کہا کرتا۔ یہ بات ٹامس جیسے خود دار آدمی کو کیونکر پسند آسکتی تھی۔ تاہم وہ بہت عرصہ تک محض اس خیال سے کہ کہیں یہ احسان فراموشی کا خطا وار نہ ٹھہروں گورنر صاحب کی اس رعونت آمیز باتوں کا متحمل ہوا کیا۔ مگر جب اُس کی شہرت پھیلی۔ اور اِدھر دلوں میں بھی گانٹھ پڑی تو فلپ ٹامس کا کینہ جو دشمن ہوگیا۔ دُنیا میں

ایسے آدمی بہت ملیں گے جو آپ کے ساتھ اُس وقت تک ہر طرح سے سلوک کرتے رہیں گے جب تک آپ اُن کو اپنا دیوتا اپنا بزرگ اور محترم تسلیم کرتے رہیں مگر جوں ہی وہ آپ کے طور وطریق میں آزادی کی ذرا بھی بُو پائیں گے آپ کے دشمن ہو جائیں گے۔ کیونکہ ایسے لوگوں کی نگاہ میں احسان فراموشی کا اِس سے بڑھ کر اور کوئی اظہار نہیں ہو سکتا۔

فلپ نے ٹامس سے فرمائش کی کہ میرے قلعہ اور اُس کے اطراف وجوانب کے منظر کھینچو۔ معاوضہ تیس پونڈ ٹھہرا۔ ٹامس نے اِس تصویر میں کمال صرف کیا۔ ایک نامی نقّاش نے اُسے لوح پر کھودا۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں اِس تصویر کی بہت سی کاپیاں فروخت ہو گئیں۔ اصلی تصویر اب زمانہ کے ہاتھوں تباہ ہو گئی۔ اس تصویر کے علاوہ ٹامس نے اسپیوک کے تمام دلفریب نظاروں کی تصویریں لیں اور اس محدود حلقہ میں اُس کی شہرت قائم ہو گئی اور ضرورت ہوئی کہ وہ اب اُس مقام سے نقل مکان کر کے کسی زیادہ آباد اور بارونق مقام پر قیام اختیار کرے۔

باتھ انگلستان کا شملہ یا نینی تال ہے۔ یہاں پچاس پونڈ سالانہ کا مکان کرایہ پر لے کر اُٹھ آیا۔ گورنر فلپ اُس مقام کے فیشن ایبل حلقوں میں بہت مشہور تھا۔ پس اُس نے ٹامس گینس برو سے اپنی تصویر کھینچنے کی فرمائش کی تاکہ اس کی تصویر دیکھکر دوسرے رؤسا کی توجہ بھی اُس کی طرف مبذول ہو۔ مگر ٹامس اُس وقت تک اِس خود پسند شخص کی نازبرداری کرتے کرتے جان سے تنگ آ گیا تھا۔ اُس نے

اُس کی تصویر شروع تو کی مگر پوری نہ کر سکا اور یہی گویا گورنر صاحب کے برانگیختہ ہونے کا پہلا سبب تھا۔

مگر ٹامس کو گورنر صاحب کی برانگیختگی کی کیا پروا تھی۔ وہ اپنا وقت منظر نگاری، شبیہہ نگاری اور ترنّم پردازی میں صرف کرتا تھا۔ پہلے اُس کی ایک شبیہہ کی اُجرت پانچ پونڈ تھی۔ پھر آٹھ پونڈ ہوئی اور جوں جوں شہرت بڑھتی گئی۔ معاوضہ بھی بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ اُسے نصف قد کی تصویر کے چالیس اور پورے قد کی تصویر کے سو پونڈ ملنے لگے۔ اب چوطرفہ سے دولت برسنے لگی۔ اُس کے ہاتھ میں تیزی اور طبیعت مشقّت پسند تھی۔ اب اُس کو اُن مشاغل میں روپیہ صرف کرنے کا موقع ملا، جو اب تک تنگدستی کی وجہ سے دبے ہوئے تھے۔ کتابوں سے اُس کو رغبت نہ تھی۔ اور نہ اُسے مصنّفین سے عقیدت تھی بلکہ ابنائے شہر اُس کی صحبت کے جتنے خواہشمند تھے ٹامس اُن سے اُتنا ہی گھبراتا تھا۔ وہ کہا کرتا کہ میں نے کتابِ قدرت کا مطالعہ کیا ہے اور میری ضروریات کے لئے یہی کافی ہے۔ ہاں اُسے موسیقی جاننے والوں سے کمال عقیدت تھی اُن کی صُحبت میں بیٹھنے سے اُس کی رُوح کو حظ حاصل ہوتا تھا۔ وہ ایک اچھے گوئیے کو نہایت معزز اور ایک اچھے آلۂ موسیقی کو زمانہ کی بہترین ایجاد خیال کرتا تھا۔ تصویر کھینچنے سے جو وقت اُسے فاضل بچتا وہ تحصیل موسیقی میں صرف کرتا تھا۔ ایک سوانح نگار کہتا ہے کہ اگرچہ ٹامس گینس برو کا پیشہ مصوّری تھا اور موسیقی ایک مشغلۂ بیکاری تھا۔ مگر اس فن میں وہ جس قدر

ریاضت کرتا تھا۔ اُس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ موسیقی کو کسب معاش کا ذریعہ اور مصوری کو تفنن طبع خیال کرتا ہے۔

گانے سے اُسے کس قدر شوق تھا۔ وہ اس حکایت سے ظاہر ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ اُس نے وینڈائک کی کسی تصویر میں ایک بانسری کی تصویر دیکھی اور اُس سے سمجھا کہ بانسری کوئی بہت اچھا آلہ ہو گا۔ پھر اُسے یاد آیا کہ میں نے ایک جرمنی کے پروفیسر کو بانسری بجاتے دیکھا ہے۔ اُس کے پاس پہنچا۔ پروفیسر صاحب میز پر بیٹھے ہوئے بھُنے سیب چکھ رہے تھے اور بانسری بغل میں رکھی ہوئی تھی۔ ٹامس نے علیک سلیک کے بعد کہا "جناب من میں آپ کی بانسری خریدنے آیا ہوں۔ دام کہئے اور یہ نقد حاضر ہے"، پروفیسر نے کہا "جناب من میں اپنی بانسری نہیں بیچتا"۔

ٹامس "دام پر مت آیئے جس قدر کہئے حاضر ہے"۔

پروفیسر "اس کا دام بہت ہے۔ آپ کے دیئے نہ دیا جائیگا۔ دس پونڈ"۔

ٹامس "بس! یہ دس پونڈ لیجئے۔ اس کو آپ بہت کہتے تھے"۔

یہ کہکر بانسری لے لی روپئے گنے۔ تھوڑی دُور چلا تھا کہ پھر لوٹا۔

ٹامس "جناب من ادھورا کام کرکے چلا جاتا تھا۔ یہ بانسری میرے کس کام کی ہے جب تک آپ کی کتاب بھی نہ ہو"۔

پروفیسر "کیسی کتاب"۔

ٹامس "اجی وہی جو آپ نے اس بانسری کے بجانے کے لئے بنائی ہے۔"

پروفیسر "وہ کتاب میں نہیں بیچ سکتا۔"

ٹامس "لائیے لائیے۔ دل لگی نہ کیجئے۔ آپ جب چاہیں ایسی کتاب بنا سکتے ہیں۔ لیجئے دس پونڈ۔ آداب عرض۔"

چند قدم چلا تھا کہ پھر لوٹا۔

ٹامس "آپ نے مجھے اچھا پھانسا۔ بھلا یہ خالی خولی کتاب لے کر میں کیا کرونگا۔ اِسے سمجھائیگا کون؟ اور بانسری کیسے بجے گی! اُٹھئے تشریف لے چلئے اور مجھے سکھا دیجئے۔"

پروفیسر "آپ چلئے میں کل آؤنگا۔"

ٹامس "نہیں آپ کو ابھی چلنا ہوگا۔"

پروفیسر "ذرا کپڑے تو پہن لوں۔"

ٹامس "کپڑے پہن کر کیا کیجئے گا۔ آپ یوں ہی ہزاروں میں ایک ہیں۔"

پروفیسر "ذرا ڈاڑھی تو صاف کر لوں۔"

ٹامس "واہ! تب تو آپ کا نقشہ ہی بگڑ جائے گا۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ وینڈائک آپ کی تصویر کھینچتا تو ڈاڑھی صفا چٹ کرنے دیتا۔

الغرض اِتنی سر مغزنی کے بعد وہ پروفیسر صاحب کو کھینچ کھانچ کر اپنے گھر لے گیا۔ اُسے اِس فن سے ایسا عشق تھا کہ اُس کا مکان گانے کے بیسوں ہی

آلوں سے بھرا رہتا تھا اور اُس کے میز دسترخوان پر ہمیشہ موسیقی کے پروفیسر بیٹھے نظر آتے تھے۔ وہ اُٹھتے بیٹھتے گانے کا ہی چرچا کیا کرتا۔ تصویر بناتے وقت بھی یہی چرچا رہتا اور جوں ہی فرصت مِلتی ایک نہ ایک باجے پر گانے لگتا۔

باتھ میں ایک گاڑی والا رہتا تھا جو سرکاری ڈاک کا مہتمم تھا۔ اُس سے اور ٹامس سے دوستی ہو گئی۔ گاڑی والے کے پاس ایک اچھا گھوڑا تھا۔ ٹامس نے دو تین دن کے لئے اُسے عاریتاً مانگا کہ اُسے تصویر میں لائے۔ گاڑی والا مصوّری کی قدر کرتا تھا۔ اُس نے گھوڑے کو ساز و سامان سے درست کر کے ٹامس کے نذر کر دیا۔ ٹامس نے بھی اس دریا دلی کا جواب دیا۔ اُس نے اُس کے گھوڑے اور گاڑی کی تصویر اُتاری اور اُس کے کُنبہ کو مع اپنے اُس گاڑی میں بٹھا دیا۔ کہتے ہیں کہ یہ تصویر اُس کی بہترین تصاویر میں سے ہے۔

اب گینس برو کی آمدنی۔ شہرت اور عزّت اتنی ہو گئی کہ اُسے باتھ سے لندن میں آکر مقیم ہونے کی جرأت ہوئی۔ یہاں وہ گورنر فلپ کی نازبرداری سے آزاد ہو گیا اور شبیہہ سازی اور منظر نگاری میں روز افزوں ترقی دکھانے لگا۔ اُس کا مکان بہت وسیع اور اُس کا نگار خانہ بہت خوبی و نداق سے آراستہ تھا اور چونکہ اُس نے اِس کے پہلے بہت سی شبیہیں بنائی تھیں اُسے لندن میں زیادہ دنوں بیکار نہ بیٹھنا پڑا۔ اس میں شک نہیں کہ اُن دنوں رینالڈ کی خوب گرم بازاری تھی مگر شائقین کی تعداد اِتنی زیادہ تھی کہ وہ تنہا

سب کی فرمائشیں پوری نہ کر سکتا تھا اور ایک ایسے شخص کے لئے کافی گنجائش تھی جو زور آزادی اور مزاج نگاری میں بعض اوقات وینڈائک سے ٹکر کھاتا تھا۔
خاندان شاہی نے بھی قدر دانی فرمائی۔ بادشاہ۔ ملکہ اور تین شہزادوں نے چھوٹے چھوٹے پیمانے پر اُس سے تصویریں بنوائیں۔ اس میں شک نہیں کہ اگر اُس کے مزاج میں ذرا زیادہ تحمّل، ذرا زیادہ صبر، اور ذرا زیادہ اخلاق ہوتا تو وہ رینالڈ سے بھی بازی لیجاتا۔ اُس کے رنگوں میں قائم رہنے والی شوخی تھی اور جس چیز پر وہ پنسل اُٹھاتا اُس میں جان اور تازگی ڈالدیتا تھا۔
اُس کی شہرت نے جن شائقین کو اُس تک پہنچایا اُن میں ڈیون شائر کی بیگم بھی تھی۔ وہ حسن و رعنائی کے لحاظ سے اپنے زمانہ کے کل حسینانِ روزگار کا سرتاج سمجھی جاتی تھی۔ مگر جب ٹامس تصویر لینے بیٹھا تو اُس کے زاہد فریب حسن اور اُس کی دلفریب گفتگو کا اُس کے دل پر اتنا اثر ہوا کہ اُس کے ہاتھوں سے شوخی آزادی اور بے تکلّفی جاتی رہی۔ اُس نے کئی بار کوشش کی۔ اپنا انتہائی کمال صرف کر دیا مگر بیگم کے حسن کا جو معیار اُس کے ذہن میں قائم ہوگیا تھا وہ ادا نہ کر سکا۔ آخر کئی بار ناکام کوشش کرنے کے بعد اُس نے یہ کہکر کہ "یہ شکل میری قابلیت سے بالاتر ہے" اُسے چھوڑ دیا۔ اُس کے مرنے کے بعد اُس تصویر کے دو تین مسودے ملے جو بہت ہی خوبصورت تھے۔
اسی طرح ایک رئیس اُس کے یہاں تصویر کھچوانے آئے۔ کپڑے بالکل

نئے اور بھڑکیلے تھے۔ طرز نشست بھی ایسا تھا جس سے رتبہ وحکومت کا اظہار ہوتا تھا۔ جب گینس برو نے ہاتھ میں پنسل لی تو آپ نے فرمایا۔ "جناب من۔ میری ٹھوڈی پر ایک گڑھا ہے اُسے بھول نہ جائیے گا۔" ٹامس آپ کی وضع قطع دیکھ دیکھ کر ہنس رہا تھا۔ خوشامد سے اُس کی طبیعت کو کامل عار تھا۔ نہ زبان سے نہ پنسل سے وہ کسی کی خوشامد کرنا پسند کرتا تھا۔ بول اُٹھا۔ جناب آپ تشریف لیجائیے۔ میں آپ کی تصویر کھینچنے سے باز آیا۔"

ایک مرتبہ مشہور ایکٹر ڈیوڈ گیرک ٹامس کے یہاں تصویر کھنچوانے آیا مگر جب جب مصوّر نے اُس کے چہرہ پر نگاہ ڈالی اُس نے ایک نئے انداز اور انوکھی قطع کا چہرہ بنایا۔ کبھی آنکھیں چھوٹی کر دیں۔ کبھی ہونٹ موٹے کر دیئے۔ آخر گینس برو ان شرارتوں سے گھبرا گیا۔ گیرک خوش ہوتے ہوئے لوٹے اور رینالڈ سے اپنی اُس شرارت کو فخریہ بیان کیا۔ اُس حلقہ میں اُس پر خوب قہقہے رہے۔

لیکن بہت کم ایسے لوگ ہیں جو کسی فن کے ہر صنف میں کمال رکھنے کا دعویٰ کر سکتے ہوں۔ شبیہہ نگاری میں ٹامس ضرور مشّاق تھا۔ مگر رینالڈ اُس سے بڑھا ہوا تھا۔ اُس کو مناسبت طبعی قدرت نگاری سے تھی اور اُس صنف میں وہ لاثانی اور بےنظیر تھا۔ نیچر کی اُس نے بیشمار دلچسپ صورتوں میں تصویر کھینچی اور اُسکی پنسل نے بےنظیر بےتکلفی سے نیچر کے نازک ترین جذبات قلمبند کیے۔ کبھی ایک تناور درخت کی۔ کبھی بیلوں سے لپٹی ہوئی جھاڑی۔ کبھی اپنی ہنسیا تیز

کرتا ہوا گھسیارہ۔ کبھی سیٹی بجاتا ہوا ہلواہا۔ کبھی بانسری بجاتا ہوا چرواہا۔ یہ تمام مناظر قدرت اُس نے ایسی صفائی۔ خوبی اور نزاکت سے دکھائے ہیں کہ کوئی دوسرا دکھا نہیں سکتا۔

ٹامس کو شعرا اور مصنّفین سے بہت ارتباط تھا۔ تاہم اڈمنڈ برک مشہور مقرّر اور شیریڈن مشہور ڈراما نویس وغیرہ جیسے بزرگوں سے اُسے خاص عقیدت تھی سر جارج بومانٹ اُس زمانہ کے شوقین مزاج رئیس تھے۔ اکثر شعرا اور اہلِ فن اُسکے خوانِ کرم سے بہرہ یاب ہوا کرتے تھے۔ برک شیریڈن گینس برو اُسکے یہاں تفریح طبع کے لئے جمع ہوا کرتے تھے۔ جارج بومانٹ اپنی ایک روایت میں بیان کرتے ہیں کہ "ایک بار گینس برو کی میں نے دعوت کی۔ برک وغیرہ بھی شامل تھے۔ اُس روز ٹامس نے خوب بذلہ سنجی کی۔ خوب حاضر جوابی دکھائی۔ ہم سب اُسکی تیز دماغی کے قائل ہو گئے۔ اور دس بجے رات تک خوب چہل پہل رہی۔ آخر چلتے وقت یہ وعدہ ہوا کہ دوسرے دن پھر لوگ جمع ہوں۔ اُس دن پھر لوگ آئے۔ مگر ٹامس کی حاضر جوابی رخصت ہو گئی تھی۔ وہ خاموش ایک طرف بیٹھا رہا۔ لوگوں نے بہت چاہا کہ اُس کی طبیعت کو گرمائیں۔ مگر ناکام رہے آخر اُس نے شیریڈن کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور تخلیہ میں لیجاکر بڑی متانت سے بولا اب میرے مرنے کے دن قریب آگئے ہیں دیکھنے میں گو جوان نظر آتا ہوں مگر میری موت کے دن دُور نہیں۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ کم سے کم اپنے ایک دوست

کو ہمدردی کے لیے اپنے ساتھ لے چلوں۔ تم چلوگے یا نہیں؟ صاف بولو۔ ہاں یا نہیں۔ شیرڈین نے ہنسکر کہا ضرور چلونگا۔ اِتنا سنتے ہی ٹامس کی بذلہ سنجی پھر واپس آگئی۔ وہ پھر بلبل کی طرح چہکنے لگا۔ اور باقی وقت عیش وطرب میں کٹا۔

اہلِ کمال میں اور اوصاف کے ساتھ حسد کا مادّہ بھی بالعموم زیادہ ہوتا ہے۔ ایک شخص دوسرے کے کمال کو ناچیز سمجھتا ہے اور اپنے تئیں اُس سے برتر ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ رینالڈ اور گینیس برو میں برابر چشمکیں رہا کرتی تھیں۔ رینالڈ شبیہہ نگار تھا۔ اور شبیہہ نگاری کی اُس زمانہ میں جتنی قدر تھی اُتنی قُدرت نگاری کی نہیں ہو سکتی تھی۔ اِسی وجہ سے اُس سے سب مصوّر خار کھاتے تھے، گینیس برو کھلم کھلا برملا اُس کی غیبت کیا کرتا تھا۔ ایک بار باہمی مصالحت کا زور یہاں تک ہوا تھا کہ دونوں شخص ایک دوسرے کی تصویر کھینچنے کے لیے آمادہ ہو گئے تھے۔ مگر پھر بگاڑ ہو گیا اور پھر دونوں آدمی الگ ہو گئے۔ گینیس برو نے بسترِ مرگ پر اپنے رقیب کو یاد کیا۔ رینالڈ کی صاف دلی دیکھئے کہ اُسی وقت حاضر ہو گیا۔ دونوں اصحابِ فن بغلگیر ہوئے اور دلوں میں جو دونوں کے حسد کے کانٹے چُبھے ہوئے تھے وہ آنسو بن کر نکل گئے۔ چشمکیں اور عداوتیں اُسی وقت تک رہتی ہیں جب تک اُن سے طبیعت کو کوئی حظ حاصل ہوتا ہے۔ جب دُنیا کی طرف سے دل افسردہ اور برگشتہ ہو جاتے ہیں تو فطرتی طور پر افسوس ہوتا ہے کہ ہم کیوں اِتنے دنوں تک ایک دوسرے کی بدگوئی اور ضرر رسانی کے ساعی و داعی رہے۔

گینس برو اپنی تصاویر پر دستخط یا تاریخ نہیں دیا کرتا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ کسی تصویر کی وقعت اس لئے نہیں ہوتی کہ وہ کس مصوّر کی بنائی ہوئی ہے۔ بلکہ اس لئے کہ اُس میں خود کیا اوصاف ہیں۔ اُس کو یقین تھا کہ میری تصاویر میں ایسے محاسن موجود ہیں جو میری خصوصیات ہیں اور اُن خصوصیات کی بدولت ہمیشہ میری تصویریں ممتاز رہیں گی۔ اپنی تصویروں میں "لکڑ ہارا اور اُس کا کتّا آندھی میں" اُسے بہت مقبول تھا۔ لکڑ ہارے کی نگاہیں جو آسمان کی طرف اُٹھی ہوئی ہیں، گویا خدا سے التجا کر رہی ہیں کہ مجھے اس آندھی بجلی پانی سے نجات دے۔ دہقانی جذبہ کی بے نظیر تصویر کھینچ گئی ہے۔ اسی طرح "گڑریئے کا لڑکا اور برکھا" بھی دہقانی زندگی کی ایک بڑے دلچسپ پہلو کی تصویر ہے۔ دونوں تصویروں کے بھیگنے والوں کے چہرے سے ایسی حسرت اور بے بسی ٹپک رہی ہے جس کا اظہار کسی طرح نہیں کیا جا سکتا۔ پہلی تصویر ضائع ہو گئی ہے۔ لیکن اُس کا خاکہ ابھی تک موجود ہے اور ظاہر کرتا ہے کہ تصویر نہایت اعلےٰ پایہ کی ہوگی۔ ٹامس اُس کی قیمت ایک سو گنی خیال کرتا تھا۔ مگر اُس کی حین حیات میں ایسا کوئی قدر دان نہ ملا جو سو پونڈ بھی اُس کے معاوضہ میں دے سکے۔ اُسکے مرنے کے بعد مسز گینس برو نے وہی تصویر پانچ سو پونڈ پر فروخت کی۔ ٹامس کی اور مقبول تصویروں میں "گھر الئے پن بھری اور اُس کا کتّا" ہے۔ ہمارے ملک میں ابھی تک کسی نے ان روزمرّہ کے واقعات کی تصویریں کھینچنے کی کوشش نہیں کی۔ راجا راوی ورما

مرحوم شاعرانہ اور خیالی مضامین کی طرف جھک گئے۔ ہاں اب بنگال کے مصوّروں کی توجہ اس طرف ہوئی ہے اور بعض اچھّی تصویریں بنائی گئی ہیں۔

رینالڈ کی طرح گینس برو بھی کھڑے کھڑے رنگ آمیزی کیا کرتا تھا اور جو پنسلیں وہ استعمال کرتا تھا اُن میں لمبے لمبے نیزے لگے ہوتے تھے جو بعض اوقات دو گز سے بھی لمبے ہوتے تھے۔ وہ اپنے نمونۂ تصویر سے اُتنے فاصلہ پر کھڑا ہوتا تھا جتنا کہ تصویر زیر نظر تاکہ دونوں کے رنگوں میں نگاہ کے پھیر سے کوئی تفاوت نہ پیدا ہو جائے۔ وہ بہت سویرے اُٹھتا اور سویرے ہی سے کام میں لگ جاتا تھا۔ بارہ ایک بجے تک کام کرنے کے بعد وہ تفریح طبع کے مشاغل میں لگ جاتا تھا۔ اُسے شام کے وقت اپنی بیوی کے ساتھ بیٹھکر متفرّق خاکے کھینچنے میں بہت مزہ آتا تھا۔ خاکے کھینچ کھینچ کر وہ میز کے نیچے پھینکتا جاتا تھا۔ اُن میں سے جو طبیعت کے موافق ہو جاتے اُن پر زیادہ توجّہ کرکے تصویر کی صورت میں لایا کرتا تھا۔ گرمی میں وہ دیہات کے ہرے میدانوں اور صاف ہواہیں گھوما کرتا تھا۔ اور جاڑے میں جب کام کرکے تھک جاتا تو اپنی کھڑکی سے سر نکال کر دھوپ کھایا کرتا۔

اِس مصوّر میں کسی قدر مجذوبیت کا مادّہ موجود تھا۔ ایک سوانح نگار لکھتا ہے کہ ٹامس کو بین بجانے کا بہت شوق تھا۔ ایک روز ایک شخص کرنل ہملٹن نامی نے اِس کے روبرو بین بجانا شروع کی۔ ٹامس پر اِس لُطف

کا ایسا سرور ہوا کہ اُس نے کرنل سے کہا "گا ئیے جائیں تمھیں" لڑکا پچھیرہو"
والی تصویر دونگا جس کے خریدنے کی تم کئی بار درخواست کرچکے ہو۔ کرنل
نے خوب دل لگا کر گایا اور ٹامس ہمہ تن گوش بنا حظ اُٹھاتا رہا۔ خوشی کے
آنسو آنکھوں سے جاری تھے اور سچا حظ نفس چہرے سے جھلک رہا تھا۔
کرنل ہملٹن نے اُسی وقت گاڑی کرایہ کی اور اُس تصویر کو گھر لے گیا۔

جس دعوت کا سر جارج بومانٹ نے تذکرہ کیا ہے اُسے مشکل سے
ایک سال گذرا ہوگا کہ گینس برو کے نام واقعی موت کا پیغام آگیا۔ وارن ہیسٹنگز
اُس زمانہ میں ہندوستان سے تازہ تازہ واپس گئے تھے اور اُن بےعنوانیوں
کے پاداش میں جو یہاں اُنھوں نے دیسی ریاستوں پر کی تھیں اُن کی سرزنش
ہو رہی تھی۔ ایڈمنڈ برک اپنی قوت تقریر کی لاثانی مثالیں پیش کر رہے تھے۔
ہر روز ہاؤس آف کامنس کے سامنے ہجوم لگا رہتا تھا۔ گینس برو بھی شیریڈن
کے ساتھ برک کی تقریر سُننے گیا۔ اور ایک کھڑکی کے سامنے پُشت کرکے بیٹھ گیا۔
تھوڑی دیر کے بعد یکایک اُسے ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے میری گردن پر برف
رکھ دی۔ پھر رگیں تن گئیں اور درد ہونے لگا۔ مکان پر آکر اُس نے فلالین
وغیرہ باندھا۔ مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ آخر جراحوں اور ڈاکٹروں کو دکھایا سب نے
کہا یہ معمولی سردی ہے کوئی خطرہ کی بات نہیں۔ مگر گینس برو کے دل میں
کوئی بیٹھا ہوا کہہ رہا تھا کہ تمھارا وقت قریب ہے۔ آخر وقت آہی گیا۔ دوسری

اگست ۱۷۸۸ء کو اکسٹھویں سال میں اُس کی روح جسم فانی سے پرواز کر گئی۔ مرنے کے پہلے اُس نے رینالڈ کو یاد کیا تھا۔ اور دونوں میں میل ہو گیا تھا۔ رینالڈ اور شیریڈن لاش کے ہمراہ دروازۂ قبر تک گئے تھے۔

گینس برو کے انتقال کے بعد اُس کی بیوہ نے تمام تصاویر فروخت کے لئے پیش کیں جن میں ۵۶ تصویریں اور سو سے زائد خاکے تھے بہت اُس موقع پر فروخت ہو گئیں کچھ نیلام کر دی گئیں۔ اُن میں دو تصویریں دستبردِ روزگار سے بچتے بچتے بچ رہی ہیں۔ ایک کا نام ہے "نیلا لڑکا" اور دوسرے کا "جھونپڑے کا دروازہ" پہلی تصویر رینالڈ کی ضد میں کھینچی گئی تھی۔ رینالڈ نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا کہ نیلا رنگ لباس وغیرہ کے لئے ناموزوں ہے۔ گینس برو نے "نیلا لڑکا" بنا کر اس دعوے کی تردید کی۔ بہت سے نکتہ چینوں کا قول ہے کہ انگریزی مصوّری میں کسی لڑکے کی تصویر ایسی اعلیٰ پایہ کی نہیں۔ نیلے رنگ کا استعمال بہت مشکل ہے اور اس لحاظ سے وہ ٹامس وینڈائک سے بہت ملتا ہے جو اس خوبی کے لئے مشہور روزگار ہے۔ اس لڑکے کے چہرہ سے ایسا قدرتی حسن ظاہر ہوتا ہے اور اُس کا انداز ایسی بے تکلّفی سے معمور ہے کہ دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی ہے۔ دوسری تصویر میں ایک خوبصورت سا جھونپڑا ہے جس کے دروازے پر ایک عورت ایک بچہ کو گود میں لئے بیٹھی ہے اور اُسکے اِدھر اُدھر کئی بچے کھیل کود رہے ہیں۔ یہ جھونپڑا بہت گنجان درختوں کے سایہ

میں بنایا گیا ہے اور درختوں کی آڑ سے چشموں اور سبز لہلہاتے ہوئے میدانوں کا منظر دکھائی دیتا ہے۔ اُس کے رنگ نہایت شوخ ہیں اُس میں ایک قسم کا بھولا پن پایا جاتا ہے جو اس مصوّر کی خصوصیات میں سے ہے۔ عورت خود ایک تندرست گدرائی ہوئی دہقانی عورت کی بہترین مثال ہے۔ جس کے چہرے کا حسن اور ملاحت اُس کی آنکھوں کی سادگی اور ہونٹوں کی مسکراہٹ سے اور بھی دوبالا ہو جاتا ہے۔ شکل و شباہت میں گینس برو بہت وجیہہ کہا جاتا ہے۔ اُس نے بھی ہوگارتھ کی طرح یونیورسٹی کی تعلیم نہ پائی تھی مگر اُس کے خطوط میں (جو دستیاب ہوئے ہیں) جو ظرافت اور سلاست ہے وہ بہت کم انگریزی مصنّفوں کی تحریر میں پائی جاتی ہے۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ وہ ذرا ہنسوڑ شخص تھا اور اس وجہ سے اپنی تحریر میں بھی وہ متانت نہیں برت سکتا تھا جو کسی فلاسفر کی تحریر میں ہونی چاہیئے۔ اُس کے ارادے بہت مضبوط ہوا کرتے تھے۔ جس بات سے ایک مرتبہ بھی ہٹ گیا پھر نہیں جمتا تھا۔ ۱۷۸۴ء میں اُس نے جب ایک تصویر رائل اکاڈمی میں نمائش کے لئے بھیجی تو یہ تاکید کر دی کہ جس قدر ہو سکے اِسے نیچا لٹکایا جائے۔ مگر اکاڈمی میں کوئی شرط اس کے خلاف تھی۔ لوگوں نے اختلاف کیا۔ گینس برو نے تصویر واپس لے لی اور پھر کبھی نہ بھیجی۔

اُس کے خاکے متعدّد ہیں اور کوئی ایسا نہیں جس سے حال کا اظہار نہ ہو۔ شاید کسی مصوّر نے بھی اتنے خاکے نہیں چھوڑے۔ اِن میں سے بعض اُس کی

بہترین تصویروں کے مقابلے کے ہیں۔ اُن سبھوں میں نفاست و غرابت موجود ہے۔ ایک نقّاد لکھتا ہے کہ" لیڈیوں کے جو خاکے میں نے اُن کے دیکھے ویسے اور کہیں دیکھنے میں نہیں آئے۔ اِن میں بہت سے خاکوں کے نام مٹ گئے ہیں مگر حال میں اسی مصوّر کے ایک پرپوتے رچرڈ لین نے جو خود بھی اعلیٰ پایہ کے مصوّر ہیں ان خاکوں کو شائع کرنا شروع کیا ہے۔ اب تک دو ڈھائی درجن نکل چکے ہیں اور شاید یہ سلسلہ عرصہ تک قائم رہیگا۔

مگر ٹامس گینس برو محض منظر نگار نہ تھا۔ ایسے مصوّروں کا قاعدہ ہے کہ اپنے باغوں کو جنّت کا باغچہ بنا دیں گے۔ اُن کی ندیاں نہر طوبیٰ کو شرمائیں گی اُن کے میدان۔ اُن کے کوہسار۔ اُن کے آبشار سبھی ایسے نظر آئیں گے۔ گویا وہ انسان کے لئے نہیں بنے ہیں۔ بلکہ فرشتے اور دیوتے اُن کی سیر و کیفیت کا مزہ اُٹھاتے ہیں۔ اُن تصویروں میں انسان کا نام نہیں ہوتا۔ باغچے سجے رکھے ہوئے ہیں۔ مگر سجانے والے نظروں سے پوشیدہ ہیں۔ آبشاروں سے پانی بڑی خوبصورتی سے گر رہا ہے۔ مگر اس سین کا لُطف اُٹھانے والا کوئی تصویر میں نہیں ہے۔ برعکس اِس کے گینس برو جب کسی منظر کی تصویر لیتا ہے تو اُس میں انسان کا پارٹ بھی بڑی خوبی سے دکھاتا ہے اُس کے باغچے فرشتوں سے بسنے کے لئے نہیں بلکہ انسان کے سیر و تفریح کے لئے بنے ہوتے ہیں۔ اور اُس میں انسان چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ اُس کی ندیاں اُس کے جھرنے سبھی مواقع

پرحضرت انسان موجود نظر آتے ہیں وہ کسی خاص اصول یا کسی خاص اسکول کا پابند نہ تھا۔ وہ فلورنس۔ یا وینس یا ڈنمارک کا مقلّد نہ تھا وہ وینڈائک یا شین یا رفیلی کا مقلّد نہ تھا۔ وہ انگلستان میں پیدا ہوا تھا اور وہیں اپنے فن کی تحصیل کی چنانچہ اُس کے منظر سب انگریزی مناظر ہیں۔ اُس کے مرد و عورت سب انگریز ہیں۔ اُس کی ندیاں اور جھونپڑے سب انگریزی ہیں۔ وہ رینالڈز کی طرح اساتذہ سے اپنی تصویروں کے نمونے نہیں طلب کرتا اور نہ ولسن کی طرح سوئٹزرلینڈ اور اٹلی کی سینری کھینچتا ہے۔ کسی اسکول۔ کسی روش۔ اور کسی طرز سے وہ مانوس نہیں۔ اُس نے قدرت کے مدرسہ میں تعلیم پائی اور اُسی تعلیم کی بدولت صفحۂ دنیا پر اپنا نام ثبت کر گیا۔

بعض اوقات اُس کی تصاویر عجلت یا کم توجہی سے خراب ہو گئی ہیں جیسا بالعموم طباع آدمیوں کا قاعدہ ہے کہ وہ کسی ایک امر پر طبیعت کو بہت دیر تک نہیں لگا سکتے۔ اسی طرح گینس برو بھی ایک تصویر کو بناتے بناتے جب گھبرا جاتا تھا تو اُسے جلدی جلدی ختم کر دیتا اور پھر اُس پر نظر ثانی نہ کرتا۔ دماغ میں خیالات بجلی کی دمک کی طرح آتے ہیں۔ یکایک کوئی تازہ قابل تصویر خیال آیا اور فوراً پنسل سے اُس کا خاکہ کھینچ لیا۔ اب جب تک اُس خاکہ کو تصویر کی صورت میں لائے، اُس پر رنگ بھرے اور اُس میں بہت سی ایسی چھوٹی موٹی خوبیاں پیدا کرے جو مشق اور غور سے پیدا ہوتی ہیں۔ تب تک خیال کی وہ تازگی رخصت

ہو گئی۔ اس لئے وہ بعجلت تمام کام کیا کرتا تھا تاکہ جہاں تک جلد ممکن ہو خیال ادا ہو جائے۔ اس عجلت کی بدولت اُس کی بعض بیش بہا تصویریں ناقص ہو گئی ہیں۔ رینالڈ اپنے ہمعصروں کے عیوب و محاسن پر کبھی زبان نہیں کھولا کرتے تھے مگر جب گینس برو کے انتقال نے اُس کو ہمعصروں کی فہرست سے خارج کر دیا تو کبھی کبھی اُس کے کمال کا اعتراف کرنے لگے۔ فرماتے ہیں "گینس برو کی تصاویر کو جب نزدیک جاکر خوب نظر غور سے دیکھیے تو بیشمار چھوٹے چھوٹے نشانات اور لکیریں نظر آتی ہیں جو نکتہ فہم مصوّروں کی نگاہ میں بھی اُس وقت ایسی معلوم ہوتی ہیں گویا اتفاق سے رہ گئی ہیں اور اُن سے مصوّر کی کوئی خاص منشا نہیں ہے لیکن جب کچھ فاصلہ پر چلے جائیے تو یہی لکیریں۔ یہی بے جوڑ غیر ضروری نشانات گویا جادو کے زور سے متشکل نظر آنے لگتے ہیں۔ اور جو کام اِن کے سپرد کیا گیا ہے اُسے انجام دینے لگتے ہیں۔ اس لئے یہ مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ گینس برو میں عجلت اور کم توجہی کے پردہ میں محنت اور عرق ریزی چھپی ہوئی ہے۔ گینس برو خود اپنی تصویروں کی اس خوبی سے واقف تھا جو اس کی اس تاکید سے واضح ہوتا ہے کہ نمایش گاہ میں ہمیشہ میری تصاویر پہلے نزدیک اور تب ذرا فاصلہ سے دیکھی جایا کریں۔"

گینس برو کے منظروں میں چھوٹے چھوٹے خوش و خرّم بچّوں کا ادھر اُدھر آزادی سے دوڑنا بہت پیارا معلوم ہوتا ہے۔ خصوصاً جب انھیں

رینالڈ کے بچوں سے موازنہ کر کے دیکھیے۔ اس میں شک نہیں رینالڈ کے بچے بھی بڑی پیاری چیزیں ہیں۔ بے تکلف۔ آزاد اور خوبصورت لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مخملی گدّوں پر سونے اور سنہرے چمچوں سے کھلائے جانے کے عادی ہیں۔ گینس برو کے بچوں میں ایک قسم کی دہقانی خوبصورتی۔ ایک آزادانہ ادا۔ ایک صحت آمیز بے خبری پائی جاتی ہے جس سے اُن کے دیہاتی اور اکھڑ ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ وہ قدرت کے بچے معلوم ہوتے ہیں جو باغ قدرت میں آزادی و خرّمی کے ساتھ دوڑ رہے ہیں۔ اُن کو اس بات کی پروا یا ضرورت نہیں کہ میرے ساٹن کے کوٹ خراب ہو جائیں گے۔ یا نرم نرم جوتے بھیگ جائیں گے۔ وہ ہری ہری گھاس پر لوٹتے۔ خرگوش کی طرح جھاڑیوں میں پھدکتے اور نالوں اور چشموں میں مچھلیوں کی طرح تیرتے پھرتے ہیں۔

# سوامی وویکانند

بھگوان کرشن نے بھگوت گیتا میں کہا ہے کہ جب کبھی نیکی مغلوب ہوجاتی ہے اور بداعمالیوں کا زور ہوتا ہے تو میں بنی نوع انسان کی امداد کے لیے نازل ہوتا ہوں۔ اس دھرنا پائدار میں عموماً اور ہند میں خصوصاً جب کبھی گناہوں کی زیادتی یا کسی اور وجہ سے از سرِ نو ترمیم اور اصلاح کی ضرورت ہوئی ہے تو ایسے ہادیان برحق ظہور پذیر ہوئے ہیں جنکی روحانی طاقت حالات موجودہ پر غالب آئی ہے۔ زمانۂ قدیم میں جب شر و فساد نے زور پکڑا تو سری کرشن بھگوان آئے اور ظلم و بدی کی آگ بجھائی۔ اس کے بہت دنوں بعد جب پھر حیوانیت و نفسانیت کا غلبہ ہوا تو بھگوان گوتم بدھ نے جنم لیا اور انکی تعلیم و تلقین نے روحانیت کی ایک موج پیدا کردی جس نے کئی صدیوں تک مادیت کو سر نہ اُٹھانے دیا۔ مگر جب مرورِ ایام نے اِس روحانی تعلیم کی بنیاد بھی کمزور کردی اور اُس کے پردے میں نفسانیت اور بداخلاقیوں کا پھر زور ہوا تو سری شنکر آچارج سوامی نے اوتار لیا اور اُن تمام بُرائیوں کو جو مذہب کے پردے میں رائج ہو رہی تھیں اپنے زور تقریر اور یوگ بل سے

یک قلم مٹا دیا۔ بعد ازاں کبیر صاحب اور سری چیتن سوامی اپنی روحانیت کا سکہ دلوں پر بٹھا گئے۔

گزشتہ صدی عیسوی کی ابتدا میں مادیت نے پھر سر اُٹھایا اور اس دفعہ اُس کا حملہ ایسا پُرزور تھا اور اُس کے آلات حرب ایسے کارگر اور اُس کے معاونین ایسے دلیر اور طاقتور تھے کہ ہندوستان کی روحانیت کو اُس کے مقابل میں سر تسلیم خم کرنا پڑا اور تھوڑے ہی دنوں میں اُس نے کوہ ہمالیہ سے راس کماری تک اپنا سکہ بٹھا دیا۔ ہماری نگاہیں اُس مادی روشنی کے سامنے خیرہ ہو گئیں۔ ہم نے اپنے قدیم فلسفہ۔ اپنے قدیم علم۔ اپنے قدیم معاشرت۔ اپنے قدیم مذہب اور اپنے قدیم معیاروں کو ترک کرنا شروع کیا۔ ہم میں یہ خیال راسخ ہو گیا کہ ہم مدتہائے دراز سے گمراہ تھے اور روحانیت کی تعلیم محض ڈھکوسلا ہے۔

خواہ زمانۂ قدیم میں اس سے مفید نتائج پیدا ہوئے ہوں مگر زمانۂ موجودہ کے لئے وہ کسی طرح موزوں نہیں ہے اور اگر اس راستے سے ہٹکر یہ نئی شاہراہ اختیار نہ کریں گے تو کچھ دنوں میں صفحۂ ہستی سے معدوم ہو جائینگے۔ ایسی حالت میں ہندوستان کے خاک پاک سے پھر ایک بزرگ اٹھا جو روحانیت کے جوش سے معمور تھا۔ جس کا حوصلہ بلند اور نظر وسیع تھی جس کا دل جوش محبت سے لبریز تھا۔ اُس کی صداقت آمیز للکار نے دم زدن میں مادی دنیا میں

ایک تہلکہ سا ڈال دیا۔ اُس نے مادّیت کے قلعہ میں گھُس کر ثابت کر دیا کہ یہ روشنی جسے تم روشنی سمجھے ہو تاریکی ہے اور یہ تہذیب جس پر تمھیں اس قدر ناز ہے اصلی تہذیب نہیں۔ اس جوش صداقت سے مالا مال تقریر نے ہندوستان پر بھی جادو کا اثر پیدا کیا اور مادّیت کی موج درموج رفتار نے اپنے مقابل ایک رفیع دیوار کھڑی دیکھی جس کی جڑ کو ہلانا جس کے اوپر سے ہو کر گذر جانا اس کے لیے غیر ممکن تھا آج اپنے طرز معاشرت اپنے علم و دین اپنے رسم و رواج اور اپنے مذہب کو ہم فخر اور اعزاز کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ یہ اس نفس پاک کی تعلیم کی برکت ہے کہ آج ہم اپنے قدیم معیاروں کی پرستش کرنے کے لیے تیار ہیں اور یورپ کے ہیرو اور ولاور عالم اور فلاسفر ہم کو اپنے علما اور فضلا کے مقابل بالکل ناتوان بچے نظر آتے ہیں۔ آج ہم کسی امر کو خواہ وہ مذہب، معاشرت، یا علم و فن سے تعلق رکھتا ہو محض اس دعوے پر ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ یورپ میں اس کا رواج ہے۔ بلکہ ہم اُس کے لئے اپنے مذہبی کُتب اور اپنے قدیم بزرگوں سے مشورہ لیتے ہیں اور اُن کے فیصلے کو قول فیصل سمجھتے ہیں۔ یہ سب سری سوامی وویکانند مرحوم کی تعلیم روحانیت کی کرامات ہے۔

سوامی وویکانند جی کے سوانح زندگی بہت مختصر ہیں۔ افسوس! آپ عین عالم شباب میں اس دار فانی سے رحلت فرما گئے اور ملک و قوم کو جتنا فیض اُن کی ذات قدسی صفات سے پہنچ سکتا تھا نہ پہنچ سکا۔ ۱۸۶۳ء میں وہ ایک معزز

کائستھ خاندان میں پیدا ہوئے۔ آثارِ نیک بچپن ہی سے ظاہر تھے انگریزی مدارس میں تعلیم پائی اور ۱۸۸۴ء میں بی۔اے کی سند حاصل کی۔ اُس وقت اُن کا نام نریندر ناتھ دت تھا۔ برائے چندے اُنھوں نے برھمو سماج کی پیروی کی۔ روزانہ عبادت میں شریک ہوتے اور چونکہ انتہا درجے کے خوش گلو تھے۔ کیرتن سماج میں بھی شریک ہوا کرتے تھے مگر برھمو سماج کی تلقینات اُن کی پیاس کو نہ بجھا سکیں۔ مذہب اُن کے نزدیک محض کسی کتاب سے اشلوک پڑھنے، چند رسمیات ادا کرنے اور گیت گانے کا نام نہیں ہو سکتا تھا۔ کچھ دنوں تک وہ تلاشِ حقیقت میں سرگرداں رہے۔ اُن دنوں شری سوامی رام کرشن پرم ہنس سے لوگوں کو بہت عقیدت تھی۔ نوجوان نریندر ناتھ نے اُن کی صحبت سے فیض اُٹھانا شروع کیا اور رفتہ رفتہ پرم ہنس جی کی تعلیم کا اُن پر اتنا اثر ہوا کہ وہ اُن کے زمرۂ معتقدین میں شامل ہو گئے اور اس مرشدِ کامل سے اسرارِ حقیقت اور نکاتِ معرفت کے خاطر خواہ سبق سیکھے۔ پرم ہنس جی کے پرلوک سدھارنے کے بعد نریندر نے کوٹ پتلون اُتار پھینکا اور یوگ دھارن کر لیا۔ اُس وقت سے آپ وویکانند مشہور ہوئے۔ اپنے مرشد پر اُنھیں پرستش کی حد تک اعتقاد تھا۔ جب کبھی آپ اُن کا تذکرہ کرتے ہیں تو ایک ایک لفظ سے ادب و احترام کا اظہار ہوتا ہے "میرے مرشد" کے نام سے اُنھوں نے نیو یارک میں ایک اُستادانہ تقریر کی جس میں سری پرم ہنس جی کے اوصاف و فضائل کا ایک نہایت پُرجوش اور معتقدانہ لہجہ میں ذکر کیا گیا ہے۔

سوامی ودیکانند نے اپنے مرشد کامل کی خدمت میں پہلی بار نیاز حاصل کرنے کا تذکرہ یوں لکھا ہے۔

وہ ظاہرا بالکل معمولی آدمی معلوم ہوتے تھے۔ اُن کی صورت میں کوئی خاص بات نہ تھی۔ اُن کی زبان بہت سادی تھی۔ میں نے اپنے دل میں خیال کیا کہ ممکن ہے یہ درویش کامل ہوں۔ میں آہستہ آہستہ اُن کے قریب گیا اور اُن سے وہ سوالات پوچھے جو میں اکثر اوروں سے پوچھا کرتا تھا" مہاراج کیا آپ خدا پر اعتقاد رکھتے ہیں"؟ انھوں نے جواب دیا "ہاں"۔ پھر میں نے پوچھا۔ "کیا آپ اُس کا وجود ثابت بھی کر سکتے ہیں"؟ جواب ملا "ہاں"۔ میں نے پوچھا۔ "کیونکر" جواب ملا۔ "کیونکہ میں اُسے بجنسہٖ اسی طرح دیکھتا ہوں جیسے تم کو"۔

پرم ہنس جی کے کلام اور انداز بیان میں ایک برقی تاثیر تھی جو اہل شک کو فوراً راہِ راست پر پہنچا دیتی تھی اور یہی تاثیر سوامی ودیکانند جی کے کلام اور نگاہ میں بھی تھی۔ یہ ہم کہہ چکے ہیں کہ پرم ہنس جی رحلت گزائے جاودانی ہوئے تو ودیکانند نے یوگ دھارن کر لیا۔ اُن کی والدۂ محترمہ بڑی حوصلہ مند عورت تھیں۔ انھیں ارمان تھا کہ میرا لڑکا وکیل ہو اچھے خاندان میں شادی کرے اور عیش و آرام سے بسر کرے۔ جب اُس کے سنیاسی ہونے کی خبر پائی تو فوراً پرم ہنس جی کی خدمت میں حاضر ہو کر بہت التجا کی کہ میرے بیٹے کو یوگ نہ دیجئے مگر جس دل نے محبت لافانی اور روحانیت کا مزہ چکھ لیا۔ اُسے دُنیائے دوں

کی نعمتیں اور خوشیاں کب اپنی طرف کھینچ سکتی ہیں۔ پرم ہنس جی کا قول تھا کہ جو دوسروں کو روحانی تعلیم دینے کا ادّعا کرے اُسے پہلے خود عرفان کے رنگ میں ڈوبنا چاہیئے۔ اس ارشاد کے موافق سوامی جی ہمالیہ پہاڑ پر چلے گئے اور وہاں وہ کامل چھ برس تک ریاضت و تزکیہ نفس میں مصروف رہے۔ بالکل برہنہ تن۔ بے خواب و خور یکہ و تنہا وہ ارباب طریقت کی تلاش میں گھومتے اور اُن کی صحبت سے فیض اُٹھاتے رہتے تھے۔ کہتے ہیں کہ تلاش حقیقت اُنھیں تبّت کھینچ لے گئی۔ جہاں اُنھوں نے بُدھ مذہب کے اُصول و طریق کا بہت محققانہ مطالعہ کیا۔ سوامی جی خود فرماتے ہیں کہ مجھے دو دو تین تین دن کھانا میّسر نہ ہوتا تھا۔ بسا اوقات ایسے مقام پر برہنہ سویا ہوں جہاں کی سردی کا اندازہ لگانے سے مقیاس الحرارت بھی قاصر ہے۔ بار ہا شیروں اور شکاری جانوروں سے سامنا ہوا۔ مگر رام کے پیارے کو اِن باتوں کا کیا ڈر!

سوامی دویکانند ہمالیہ میں تھے جب اُنھیں القا ہوا کہ اب اپنے مرشد کامل کے ارشاد کی تعمیل کرنی چاہیئے۔ چنانچہ وہ پہاڑ سے اُترے اور بنگال۔ ممالک متحدہ راجپوتانہ۔ بمبئی۔ مدراس وغیرہ مقامات میں کبھی ریل پر اور اکثر پیادہ سفر کرتے رہے۔ اُس وقت وہ عام جلسوں میں تقریر نہ فرماتے تھے بلکہ نجی طور پر شائقین کو جو اُن کی خدمت میں ازراہِ عقیدت حاضر ہو جاتے۔ اخلاق و مذہب کے مسائل سمجھاتے جسے مصیبت میں دیکھتے اُس کی تشفّی فرماتے۔ مدراس

اُس وقت دہریوں اور مادہ پرستوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ انگریزی یونیورسٹیوں کے نئے نئے جوان جو اپنے مذہب و معاشرت سے بالکل بے خبر تھے علانیہ خدا کے وجود سے منکر ہوتے تھے۔ سوامی جی نے یہاں عرصہ تک قیام کیا اور کتنے ہی ہونہار نوجوانوں کو تبدیل مذہب سے روکا اور دہریت کے دام سے بچایا۔ بارہا لوگوں نے اُن سے مباحثے کئے۔ بارہا اُن کا مضحکہ اُڑایا مگر وہ اپنے رنگ عرفان میں اس قدر محو تھے کہ انھیں کسی کے تمسخر یا تضحیک کی مطلق پروا نہ تھی۔ رفتہ رفتہ اُن کی شہرت نوجوانوں کے حلقے سے نکلی اور بوئے مشک کی طرح پھیلنے لگی۔ رؤسا، امرا عقیدت مند ہو گئے اور اُن کی زبان مبارک سے اخلاق و دیانت کے سبق سیکھے۔ جسٹس سبرمینیا آیر۔ مہاراجہ رام ند (مدراس) اور مہاراجہ کھیتری (راجپوتانہ) اُن کے خاص عقیدت مندوں میں تھے۔

سوامی جی مدراس میں تھے جب امریکہ میں پارلیمنٹ مذاہب کے انعقاد کی خبر ملی۔ وہ فوراً اُس میں شریک ہونے کے لئے تیار ہوئے اور اُن سے زیادہ باخبر زیادہ جادو بیان اور تھا ہی کون؟ عقیدت مندوں نے مدد کی اور آپ اس مقدس سفر پر روانہ ہو گئے۔ امریکہ کی تاریخ میں یہ واقعہ ہمیشہ یاد رہے گا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کسی مغربی قوم نے دیگر اقوام کے مذہب کی تحقیق اور خیر مقدم کے لئے آمادگی ظاہر کی ہو۔ راستے میں سوامی جی نے چین و جاپان کی سیر کی اور جاپان کی طرز معاشرت سے بہت متاثر ہوئے۔ وہاں سے

اُنھوں نے ایک خط لکھا تھا ۔ فرماتے ہیں ۔

" آؤ! اِن لوگوں کو دیکھو اور جا کر شرم سے مُنہ چھپا لو ۔ آؤ ۔ مرد بنو ۔ اپنے تنگ سوراخوں سے باہر نکلو ۔ ذرا دُنیا کی ہوا کھاؤ ۔"

امریکہ پہنچ کر اُنھیں معلوم ہوا کہ ابھی انعقادِ پارلیمنٹ کو بہت عرصہ ہے ۔ یہ دن اُن کے بڑی تکلیف میں بسر ہوئے ۔ بے زری کا یہ حال تھا کہ پاس اوڑھنے اور بچھانے تک کو کافی نہ تھا مگر اُن کی استغنا اِن سب دقتوں پر حاوی ہوتی گئی ۔ آخر بڑے انتظار کے بعد تاریخ مقررہ آ پہنچی ۔ دُنیا کے مختلف مذاہب نے اپنے اپنے سفیر بھیجے تھے اور یورپ کے بڑے بڑے پادری اور دینیات کے پروفیسر اور بشپ ہزاروں کے شمار میں موجود تھے ۔ ایسی جماعت میں ایک بے زر بے یار و مددگار نوجوان کا کون پُرسانِ حال تھا جس کے بدن پر ثابت کپڑے بھی نہ تھے ۔ پہلے تو اُن سے کوئی مخاطب بھی نہ ہوا مگر صدرِ انجمن نے بڑی فراخ دلی سے اُن کی استدعا قبول کی اور وہ وقت آ گیا کہ سوامی جی اپنی زبانِ فیض ترجمان سے کچھ فرمائیں ۔ اُس وقت تک اُنھوں نے کسی عام مجلس میں تقریر نہ فرمائی تھی ۔ یکا یک آٹھ دس ہزار باعلم باخبر اور نکتہ رس آدمیوں کے مقابل کھڑے ہو کر تقریر کرنا کوئی آسان کام نہ تھا ۔ تقاضائے بشریت سے ایک لمحہ کے لیے سوامی جی کو بھی گھبراہٹ رہی ۔ مگر صرف ایک بار طبیعت پر زور ڈالنے کی ضرورت تھی ۔ سوامی جی نے ایسی عالمانہ اور پُر زور تقریر فرمائی کہ سامعین

نقشِ حیرت بنگئے ۔ یہ غیر مہذّب ہندو ؟ اور ایسی عالمانہ تقریر ۔ کسی کو یقین نہ آتا تھا ۔ آج بھی اس تقریر کے پڑھنے سے دل پہ وجدانی کیفیت طاری ہوجاتی ہے ۔ تقریر کیا ہے بھگوت گیتا اور اُپنشدوں کا لبِّ لُباب ہے ۔ آپ نے پہلی بار اہلِ مغرب کو سوجھایا کہ بے تعصبی کسے کہتے ہیں ۔ آپ نے برعکس اوروں کے کسی مذہب کی مذمت نہ کی ۔ اور اُن لوگوں کے دل میں جو خیال عرصہ سے جاگزیں تھا کہ ہندو تعصب کے پتلے ہیں وہ یک لخت دور ہوگیا ۔ یہ تقریر ایسی وسیع اور پُرمعنی ہے کہ اُس کا خلاصہ کرنا محال ہے مگر اس کا نچوڑ یہ تھا ۔

"ہندو مذہب کسی مسئلہ پر اعتقاد لانے یا خاص قوانین و رسمیات کی پیروی کرنے پر مبنی نہیں ۔ ہندو کا دل الفاظ و مسائل سے تسکین نہیں پاسکتا ۔ اگر کوئی ایسی دنیا ہے جو ہماری نظرِ مجازی سے پنہاں ہے تو ہندو اس دُنیا کی سیر کرنا چاہتا ہے ۔ اگر کوئی ایسی روح ہے جو مادّہ نہیں ۔ اگر کوئی عدل مجسّم ۔ رحم مجسّم قادرِ مطلق ہے تو ہندو اُسے اپنی آنکھوں اور حقیقی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہے ۔ اُس کے شکوک جب ہی دور ہوتے ہیں جب وہ اُنھیں دیکھ لیتا ہے ۔"

آپ نے اہلِ مغرب کو پہلی بار سوجھایا کہ وہ سائنس کے نتائج جن پر وہ ناز کرتے ہیں اور جن کا وہ مذہب سے کوئی تعلق نہیں سمجھتے ۔ ہندوؤں کو زمانہ قدیم

سے معلوم تھے اور ہندو مذہب کی بنیاد انھیں پر قائم ہے اور جبکہ اور مذاہب کسی خاص شخص کی شخصیت اور اُس کی ذاتی تعلیم پر مبنی ہیں۔ ہندو مذہب کی بنیاد ابدی اور ازلی اصولوں پر ہے اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ کبھی نہ کبھی دُنیا کا عام مذہب یہی ہوگا۔ فرض کو فرض سمجھ کر ادا کرنا۔ کام کو محض کام سمجھ کر کرنا ایسی باتیں تھیں جو اہلِ مغرب کو اب تک نہ معلوم تھیں۔ اُن کی پُر جوش تقریروں اور صداقت آمیز تلقینات سے لوگ اس حد تک متاثر ہوئے کہ امریکہ کے اخباروں نے سوامی جی کی بڑے معتقدانہ لہجہ میں تعریفیں کرنا شروع کیں۔ آپ کی تقریروں میں وہ جادو ہوتا تھا کہ سامعین پر محویت کا عالم طاری ہو جاتا تھا۔

ارادتمندوں کی تعداد روز افزوں ہونے لگی اور اطراف و اکناف سے متلاشیانِ حقیقت اُن کے پاس آنے اور اپنے شہروں میں آپ کو مدعو کرنے لگے۔ سوامی جی کو بسا اوقات دن دن بھر دوڑنا پڑتا تھا۔ بڑے بڑے پروفیسر علما و فضلا نے اُن کے روبرو زانوئے ادب تہ کیا اور اُن کی تلقینات کو اپنے گوشۂ جگر میں جگہ دی۔ سوامی جی کا قیام یہاں قریب تین برس کے رہا اور اس عرصے میں انھوں نے جسمانی تکالیف کو ذرا بھی خیال نہ کر کے اپنے مرشد کامل کے ارشاد کے موافق ویدانت کی اشاعت کی۔ اس کے بعد آپ انگلستان تشریف لے گئے۔ آپ کی شہرت وہاں پہلے ہی ہو گئی تھی۔ اگرچہ پہلے انگریزوں کو جو مادہ پرستی میں تمام دُنیا سے گوئے سبقت لے گئے ہیں۔ متوجہ کرنے میں آپ کو بہت تکلیف

ہوئی۔ مگر آپ کا حیرت انگیز استقلال اور آپ کی زبردست قوت ارادی آخر کار اُن مشکلات پر غالب ہوگئی۔ اور آپ کی تقریروں کا جادو انگریزوں پر بھی چل گیا۔ ایسے ایسے علما محققین کھانے کے لئے بھی لیبوریٹری سے نکلنا عار تھا۔ آپ کی تقریریں سُننے کے لئے گھنٹوں قبل سے آجاتے اور منتظر رہتے۔ آپ نے وہاں تین بڑے معرکے کی تقریریں کیں اور آپ کے زور بیان اور علمی لیاقت کا سکہ سب کے دلوں پر بیٹھ گیا۔ اب یہ سب پر روشن ہوگیا کہ مادّہ پرستی میں یورپ چاہے ہندوستان سے کتنا ہی آگے ہو مگر روحانیت اور معرفت کا میدان ہندوستانیوں کا ہے۔ آپ تقریباً ایک سال یہاں رہے۔ متعدد سوسائٹیوں اور انجمنوں اور کالجوں اور کلب گھروں سے آپ کے پاس دعوتیں آتی تھیں۔ مگر آپ ویدمقدس کے اصولوں کی اشاعت کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ آپ کی پُرجوش تقریروں کا یہ اثر ہوا کہ لشپوں اور پادریوں نے ویدانت پر اپنے کلیساؤں میں تقریریں کیں۔

ایک روز لندن کے معلّموں کا ایک خاص جلسہ ایک لیڈی کے گھر پر ہونے والا تھا۔ لیڈی صاحبہ مسئلہ تعلیم پر بہت دستگاہ رکھتی تھیں اور اُن کی تقریر سُننے اور اُس پر مباحثہ کرنے کے اشتیاق میں بہت سے علما جمع تھے۔ اتفاق سے لیڈی صاحبہ کی طبیعت اُس موقع پر ناساز ہوگئی۔ سوامی جی وہاں موجود تھے۔ لوگوں نے استدعا کی کہ آپ کچھ فرمائیں۔ سوامی جی اُٹھ کھڑے ہوئے اور

ہندوستان کے طرزِ تعلیم پر ایک اُستادانہ تقریر فرمائی۔ اُن علم فروشوں کو کتنی حیرت ہوئی جب سوامی جی نے زبانِ فیض ترجمان سے فرمایا کہ ہندوستان میں وِدّیا دان ہر قسم کی سخاوت سے افضل مانا گیا ہے۔ ہندو معلّم اپنے شاگردوں سے کچھ نہیں لیتا۔ بلکہ اُنھیں اپنے گھر پر رکھتا ہے اور دماغی ضروریات کے ساتھ اُن کی جسمانی ضروریات کا کفیل ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ یہاں بھی آپ کے ارادتمندوں کا حلقہ وسیع ہوگیا۔ بہت سے لوگ جو اپنے مزاج کے موافق روحانی غذا نہ پاکر مذہب سے بیزار ہو رہے تھے ویدانت کے والہ و شیدا ہوگئے اور سوامی جی سے اُن کی عقیدت ایسی پختہ ہوگئی کہ جب وہ چلے تو اُن کے ساتھ کئی انگریز شاگرد تھے جن میں مس نوبل (جو بعد کو سسٹر نویدیتا کے نام سے مشہور ہوئیں) بھی تھیں۔ سوامی جی نے انگریزوں کے طرزِ معاشرت اور اُن کے عادات و خصائل کا بڑی باریک بیں نگاہوں سے مشاہدہ کیا۔ اِن تجربات کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے ایک تقریر میں فرمایا ہے کہ یہ چھتریوں اور بہادروں کی قوم ہے۔

۱۶؍ دسمبر ۱۸۹۶ء کو سوامی جی اپنے چند انگریز چیلوں کے ساتھ وطنِ مالوفہ کی طرف روانہ ہوئے۔ ہندوستان کے خاص و عام آپ کے کارہائے نمایاں کی خبریں سُنکر آپ کے دیدار کے مشتاق ہو رہے تھے۔ آپ کے خیر مقدم اور استقبال کے لئے شہروں میں کمیٹیاں ہونے لگیں۔ جس وقت وہ جہاز سے کولمبو میں اُترے تو عوام نے جس جوش و خروش سے آپ کا خیر مقدم کیا وہ ایک مسرّت بخش نظارہ تھا۔ کولمبو

سے لیکر الموڑہ تک جس شہر میں آپ تشریف لے گئے۔ لوگوں نے آنکھیں آپ کے فرش راہ کیں۔ صغیر و کبیر، امیر و غریب سب کے دلوں میں آپ کا اعزاز واحترام یکساں جلوہ گزیں تھا۔ یورپ میں بڑے سے بڑے فاتح کی جو خاطر و مدارات ہو سکتی ہے اُس سے بدرجہا زیادہ ہندوستان میں سوامی جی کی ہوئی۔ آپ کے درشن کے لئے لاکھوں آدمیوں کا مجمع ہو جاتا تھا اور لوگ آپ کو ایک نظر دیکھنے کے لئے منزلیں طے کر کے آتے تھے۔ کیوں کہ گو ہندوستان لاکھ گیا گزرا ہے۔ تاہم ایک سچے درویش اور ایک عارف کامل کی عزت جیسی کچھ ہندوستانی کر سکتے ہیں کسی ملک میں ممکن نہیں۔ یہاں دلوں پر فتح پانے والے نفس پر غالب آجانے والے فاتح کی۔ ملک پر فتح کرنیوالے اور ابنائے جنس کے خون بہانے والے فاتح سے کہیں زیادہ عزت وحرمت ہوتی ہے۔

ہر شہر میں عوام نے آپ کو اپنی قدردانی اور شکرگذاری کے ایڈریس پیش کئے۔ بعض بعض بڑے شہروں میں آپ کو پندرہ پندرہ بیس بیس ایڈریس دئے گئے اور آپ نے اُن کے جواب میں اپنے ہموطنوں کو حوصلہ بخش جوش حب وطن سے معمور اور روحانی صداقت سے مالامال تقریریں سنائیں۔ مدراس میں آپ کے لئے سترہ عالیشان پھاٹک بنائے گئے تھے۔ مہاراجہ رامند نے جنکی معاونت سے سوامی جی امریکہ گئے تھے۔ اُس وقت بڑی فراخ دلی اور فیاضی سے آپ کے استقبال کا اہتمام کیا۔ صوبہ مدراس کے مختلف مقامات کی سیر کرتے اور شائقین کو اپنے کلام فیض التیام سے شادکام کرتے۔ آخرکار

۲۸ فروری کو سوامی جی کلکتہ میں تشریف لائے۔ یہاں آپ کی تعظیم و تکریم کے لیے پہلے ہی سے لوگ بیقرار ہو رہے تھے۔ جس وقت آپ کو ایڈریس پیش کیا گیا۔ پانچ ہزار آدمیوں سے زیادہ جمع تھے۔ راجہ بنے کرشن بہادر نے خود ایڈریس پڑھا جس میں سوامی جی کے کارہائے نمایاں کا جس گایا گیا تھا

کلکتہ میں سوامی جی نے ایک نہایت عالمانہ تقریر فرمائی۔ مگر درس و تدریس میں حد سے زیادہ محو ہونے کے باعث آپ کی صحت میں فرق آگیا۔ اور مجبوراً آپ تبدیل آب و ہوا کے لیے دارجلنگ تشریف لے گئے۔ وہاں سے الموڑہ گئے مگر سوامی جی وید مقدس کی اشاعت کا بیڑا اُٹھائے ہوئے تھے۔ اُن کو بیکاری میں کب چین آسکتا تھا۔ جوں ہی ذرا طبیعت سنبھلی آپ سیالکوٹ تشریف لائے اور یہاں سے باشندگان لاہور کی عقیدتمندیوں نے لاہور میں کھینچ بلایا۔ اِن دونوں مقامات میں آپ کی تکریم بڑے جوش سے ہوئی اور آپ نے اپنے گراں بہا کلمات سے سامعین کے ضمیر روشن کئے۔ لاہور سے آپ کشمیر گئے۔ اور راجپوتانہ کی سیر کرکے پھر کلکتہ واپس آگئے۔ اس اثنا میں آپ نے دو خانقاہیں قائم کر دی تھیں۔ اس کے کچھ دنوں بعد آپ نے رام کرشن مشن کی بنیاد ڈالی جس کے اغراض و مقاصد فلاح انام و بہبود عام پر مبنی ہیں اور جس کی شاخیں ہندوستان کے ہر حصہ میں موجود ہیں اور قوم کو اپنی کوششوں سے بے انتہا فائدہ پہنچا رہی ہیں۔

۱۸۹۸ء سارے ہندوستان کے لیے منحوس سال تھا۔ طاعون کی گرم بازاری تھی اور قحط کا بھی سامنا تھا۔ لوگ فاقہ کشی اور موت کے شکار ہونے لگے۔ سوامی جی

مجسّم رحم تھے۔ اپنے ہموطنوں کی یہ مصیبت دیکھ کر کیسے خاموش بیٹھ سکتے تھے۔
آپ نے اپنی لاہور والی تقریر میں فرمایا تھا۔

"عام آدمی کا مذہب یہی ہے کہ وہ فقیروں یا خستہ حال آدمیوں کو بھر پیٹ
کھانا کھلائے انسان کا دل ایشور کا سب سے بڑا مندر ہے اور اسی مندر
میں ایشور کی پرستش کرنا چاہیئے۔"

چنانچہ آپ نے بڑی سرگرمی سے محتاج خانے کھولنا شروع کیے۔
(رام) کرشن جی نے فنائی القوم سنّیاسوں کی ایک قلیل جماعت بنادی تھی۔
یہ سب اب سوامی جی کے زیر نگرانی غریب اور آزردہ حال آدمیوں کی مدد میں
دل وجان سے مصروف ہوئے۔ مرشد آباد۔ ڈھاکہ۔ کلکتہ اور مدراس وغیرہ متفرق
مقامات میں محتاج خانے کھولے گئے۔ وید پرچار کے لئے جا بجا مدرسے قائم کئے
گئے۔ کئی یتیم خانے بھی کھلے اور یہ سب سوامی جی کی مساعی جمیلہ کی برکت تھی۔ اُن کی
صحت بہت خراب ہوگئی۔ مگر وہ خود در بدر گھومتے اور آفت رسیدوں کی تشفی
کرتے تسکین دیتے اور اُنھیں ضروری امداد پہنچاتے تھے۔ طاعون زدہ لوگوں کی
مدد کرنا جن سے ڈاکٹر لوگ بھی بھاگتے تھے۔ اِنھیں ویس بھگتوں کا کام تھا۔ اِدھر
انگلستان اور امریکہ میں بھی وہ پودھا بڑھ رہا تھا جس کا بیج سوامی جی نے بویا تھا۔
دو سنّیاسی امریکہ میں اور ایک انگلستان میں ویدانت کی اشاعت میں مصروف
تھے اور شائقین کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔

جب سوامی جی کی صحت بہت خراب ہوگئی تو ناچار آپ نے ولایت کا سفر دوبارہ اختیار کیا اور وہاں چندے قیام کرکے امریکہ تشریف لے گئے وہاں آپ کا بڑے جوش سے خیر مقدم کیا گیا۔ چھ برس پہلے جن لوگوں نے آپ کی زبان مبارک سے فلسفۂ ویدانت پر پُرزور تقریریں سُنی تھیں وہ اس وقت پکّے ویدانتی ہو گئے تھے۔ سوامی جی کے درشن سے خوشی کی انتہا نہ رہی یہاں کی آب و ہوا مفید ثابت ہوئی اور محنت شاقہ کے باوجود آپ پھر توانا ہو گئے۔ آخر ہندو فلسفہ کے شیدائیوں کی تعداد اس قدر بڑھ گئی کہ سوامی جی شبانہ روز کی ریاضت کے باوجود بھی اُن کی آرزوئیں پوری نہ کر سکتے تھے۔ امریکہ جیسے تجارتی مقام میں ایک ہندو سنیاسی کی تقریر سُننے کیلئے دو دو ہزار آدمیوں کا جمع ہو جانا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ صرف سین فرانسسکو میں آپ نے ہندو فلسفہ پر پچاس لکچر دیئے۔ حاضرین کی تعداد روز بروز بڑھتی ہی گئی اور شائقین محض فلسفی تقریریں سُننے پر قانع نہ ہوئے۔ بلکہ عملی ریاضت اور یوگ سیکھنے کی تمنا بھی اُن کے دل میں موجزن ہوئی۔ سوامی جی نے اُن کی مدد سے سین فرانسسکو میں ایک "ویدانت سوسائٹی" اور "شانتی آشرم" قائم کیا اور آج تک دونوں سرسبز ہیں شانتی آشرم شہر کے شور و غل سے دور ایک نہایت پُر فضا مقام پر واقع ہے اس کا احاطہ تقریباً دو سو ایکڑ ہے اور یہ ایک فیاض لیڈی کے ایثار اور دریا دلی کی یادگار ہے۔ سوامی جی نیویارک میں تھے کہ پیرس میں ایک مختلف

مذاہب کی کانگریس کی تجویز ہوئی اور آپ بھی مدعو کیے گئے۔ اُس وقت تک اُنھوں نے فرانسیسی زبان میں کبھی تقریر نہ فرمائی تھی۔ مگر یہ نوید پاتے ہی آپ اِس نئی زبان کی تحصیل میں مصروف ہو گئے اور اپنی روحانی طاقت سے دو مہینے میں ایسی مہارت حاصل کر لی کہ دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی تھی۔ پیرس میں آپ نے ہندو فلسفہ پر دو لکچر دیے مگر چونکہ یہ صرف چند مضمون خوانوں کی جماعت تھی اور اس کا منشاء دریافت حقیقت نہیں بلکہ پیرس کے نمائش گاہ کی رونق بڑھانا تھا۔ اس لیئے فرانس میں سوامی جی کو کامیابی نہیں حاصل ہوئی۔

آخر کثرت مشاغل سے سوامی جی کی جسمانی حالت بالکل مضمحل ہو گئی۔ آپ بہت نحیف ہو گئے تھے۔ خصوصاً پیرس کانگریس کی تیاری نے آپ کو اور بھی ضعیف بنا دیا۔ جب امریکہ۔ انگلستان فرانس کی سیر کرتے ہوئے آپ وطن کو لوٹے تو جسم میں صرف ہڈیاں باقی رہ گئی تھیں اور اس قابل نہ تھے کہ عام مجلسوں میں تقریر فرما سکیں۔ ڈاکٹروں کی سخت تاکید تھی کہ آپ کم از کم دو سال تک آرام فرمائیں۔ مگر جو دل اپنے ہموطنوں کی مصیبت پر پگھل جاتا ہو اور جس میں اپنے ہموطنوں کے ساتھ بھلائی کی دھن سمائی ہو۔ جس میں یہ ارمان ہو کہ آج مفلس نادار اور کمزور قوم پھر زمانہ قدیم کی خوشحال توانا اور روحانی آریہ قوم ہو جائے اُس سے یہ کب ممکن تھا کہ ایک دم کے لئے بھی آرام کر سکے۔ کلکتہ میں پہنچتے ہی آپ چند دنوں کے بعد آسام کی طرف روانہ ہوئے اور مختلف مقامات

میں وید کی تلقین کی کچھ تو آپ کی صحت پہلے ہی سے خراب ہو رہی تھی کچھ ان اطراف کی آب و ہوا مضر ثابت ہوئی۔ آپ پھر کلکتہ لوٹے تو دو ماہ تک حالت بہت نازک رہی۔ بعد ازاں آپ بالکل تندرست ہو گئے۔ اُن دنوں آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ دُنیا میں میرا کام اب پورا ہو چکا مگر چونکہ اس کام کو جاری رکھنے کے لئے نفس کش بے غرض اور روحانی قوت سے معمور سنیاسیوں کی اشد ضرورت تھی اس لئے آپ نے اپنی مبارک زندگی کے باقی چند ماہ اپنے شاگردوں کی تعلیم و تلقین میں صرف کئے۔ آپ کا قول تھا کہ تعلیم کا منشاء سبق پڑھانا نہیں بلکہ آدمی کو انسان بنانا ہے۔ اُن دنوں آپ اکثر استغراق کی حالت میں رہتے تھے اور اپنے معتقدوں سے یہ فرمایا کرتے تھے کہ اب میرے سفرِ آخرت کا زمانہ بہت قریب آگیا ہے۔ ۴ر جولائی ۱۹۰۲ء کو آپ یکایک محو ہو گئے۔ اُس وقت آپ کی صحت بہت اچھی تھی۔ سویرے آپ دو گھنٹہ تک مراقبہ میں رہتے تھے۔ دوپہر کو آپ نے اپنے شاگردوں کو پانِنی کے سبق دیئے۔ سہ پہر کو دو گھنٹہ تک آپ وید پر لوگوں کو تلقین فرماتے رہے۔ بعد ازاں چہل قدمی کے لئے نکلے۔ شام کو لوٹے تو ذرا دیر مالا جپنے کے بعد آپ پر پھر استغراق کی کیفیت طاری ہوگئی۔ اور اُسی شب کو آپ نے قالب عنصری ترک کرکے عالم جاودانی کی راہ لی۔ یہ نحیف اور ناتواں قالب خاکی روحانیت کی موج کی تاب نہ لا سکا پہلے لوگوں نے

سمجھا یہ محض سمادھی ہے اور ایک سنیاسی نے آپ کے کان میں شری پرم ہنس جی کا نام سُنایا۔ مگر جب اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ تب لوگوں کو یقین ہو گیا کہ آپ کا وصال ہو گیا۔ آپ کا چہرہ روشن تھا اور نیم باز آنکھیں نورِ حقیقت سے منور تھیں۔ یہ حسرت ناک خبر سُنتے ہی تمام ملک میں تہلکہ مچ گیا۔ دُور دُور سے لوگ آپ کے جسمِ پاک کا دیدار حاصل کرنے کے لئے آئے اور آخر دوسرے دن دو بجے دن کو گنگا کے کنارے آپ کی داہ کریا ہوئی۔ پرم ہنس جی نے پیشین گوئی کی تھی کہ جب میرے اس شاگرد کا مشن پورا ہو جائیگا تو وہ عین شباب میں اس دارِ فانی کو خیرباد کہے گا اور پیشین گوئی لفظ بہ لفظ پوری ہوگئی۔

سوامی جی نہایت وجیہہ اور شکیل بزرگ تھے آپ کے قویٰ بہت مضبوط تھے۔ آپ کا وزن دو من سے زائد تھا۔ آپ کی نگاہ میں برقی تاثیر تھی اور آپ کا چہرہ روحانیت کے رعب و جلال سے منوّر تھا۔ آپ کی رحم دلی کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں سخت کلام شاید آپ کی زبان سے ایک مرتبہ بھی نہ نکلا ہو۔ باوجود ایسی عالمگیر شہرت کے اُن کا مزاج بہت سادہ اور روش بالکل منکسرانہ تھی۔ اُن کی علمیت لامحدود تھی۔ انگریزی کے اُستاد کامل اور انگریزی مقرروں میں سرآمدِ روزگار تھے۔ سنسکرت، ادب و فلسفہ کے عالم متبحّر۔ جرمنی۔ عبرانی۔ یونانی۔ فرانسیسی وغیرہ السنہ میں دستگاہ کافی و وافی رکھتے تھے۔ محنت شاقہ آپ کی فطرت میں داخل تھی۔ صرف چار گھنٹے سوتے۔ چار بجے سویرے اُٹھ کر جپ تپ میں مصروف

ہوجاتے۔ مناظر فطرت کے آپ والہ و شیدا تھے۔ علی الصباح جپ تپ سے فارغ ہوکر آپ میدان میں نکل جاتے اور نظارہ ہائے قدرت سے محظوظ ہوتے پالو جانوروں کو پیار کرتے اور اُن کے ساتھ کھیلتے۔ اپنے مرشد کامل کی آخر وقت تک پرستش کرتے رہے۔ آپ بہت خوش الحان تھے اور آواز نہایت مؤثر پائی تھی۔ شری پرم ہنس جی کبھی کبھی آپ سے بھجن گانے کی فرمائش کرتے تھے اور اُس سے اِس قدر متاثر ہو جاتے تھے کہ وجدانی کیفیت طاری ہوجاتی۔ میرابائی اور تان سین کے عاشقانہ زمزموں سے آپ کو عشق تھا۔ زبان میں جادو تھا۔ آپ کی تقریریں سامعین کے دلوں پر نقش کالحجر ہوجاتی تھیں۔ آپ کا طرز تقریر سادہ اور عام فہم تھا۔ مگر اُن معمولی لفظوں میں ایسا روحانی جذبہ بھرا ہوتا تھا کہ سُننے والے محو ہو جاتے تھے۔ آپ قوم کے سچّے جاں نثار تھے۔ فنائی القوم کے لقب کا مستحق شاید آپ سے زیادہ کوئی دوسرا نہ ہوگا۔ حُبّ وطن کا ہی جوش آپ کو امریکہ لے گیا تھا۔ اپنی آفت رسیدہ قوم اور اپنے قدیم فلسفہ و ادب کا وقار دوسری اقوام کی نگاہ میں جمانا۔ برہمچاریوں کو تعلیم دینا۔ اپنے ستم زدہ ہموطنوں کے لئے جابجا خیرات خانے کھلوانا۔ یہ سب آپ کے صادق حُبّ وطن کی یادگاریں ہیں۔ آپ صرف مہرشی نہیں بلکہ فنائی القوم مہرشی تھے۔ ایک تقریر میں فرماتے ہیں۔

"میرے نوجوان دوستو! مضبوط بنو۔ تمہارے لئے یہی میری صلاح ہے۔ تم بھگوت گیتا کے مطالعہ کے بہ نسبت فٹ بال کھیل کر کہیں زیادہ آسانی سے نجات

حاصل کر سکتے ہو۔جب تمھاری رگیں اور پٹھے زیادہ مضبوط ہوں گے تو تم بھگوت گیتا کی تلقینات پر زیادہ خوبی کے ساتھ عمل کر سکتے ہو۔گیتا کی تعلیم بزدلوں کو نہیں دی گئی تھی۔ بلکہ ارجن کو جو بڑا سورما بہادر اور چھتریوں کا سرتاج تھا۔ سری کرشن کی تعلیم اور اُن کے حیرت انگیز اعجاز کو تم جب ہی سمجھ سکو گے جب تمھاری رگوں میں خون کی حرکت ذرا زیادہ تیز ہوگی۔

ایک دوسری تقریر میں آپ فرماتے ہیں :۔

"یہ وقت نہیں ہے کہ عالم مسرت میں بھی روئیں۔ہم رو تو بہت چکے۔اب ہمارے لیے نرم بننے کی ضرورت نہیں۔اس نرمی نے ہمیں اس حد تک پہنچا دیا ہے کہ ہم روئی کے تودے کے مانند ہوگئے ہیں۔اب جن چیزوں کی ہمارے ملک و قوم کو ضرورت ہے وہ آہنی اعضا اور فولادی رگ و پٹھے اور وہ زبردست قوتِ ارادی ہے جسے دُنیا کی کوئی چیز نہیں روک سکتی۔ جو اسرارِ قدرت کی تہ تک پہنچ جاتی ہے اور اپنے مقصد سے مُنھ نہیں موڑتی۔ خواہ اس کوشش میں اُسے سمندر کی تہ میں جانا اور موت سے سامنا کرنا پڑے۔عظمت کا راز ہے عقیدت۔مضبوط اور پختہ عقیدت۔اپنی اور قادرِ مطلق کی ذات سے"۔

سوامی جی کو اپنے اوپر نہایت مضبوط اعتقاد تھا وہ خود کہتے ہیں :۔

پرم ہنس جی کے حلق میں ایک خوفناک پھوڑا نکل آیا تھا اور بالآخر اس نے

یہاں تک زور پکڑا کہ کلکتہ کے مشہور و معروف ڈاکٹر بابو مہندر لال سرکار طلب کئے گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے پرم ہنس جی کی حالت دیکھ کر مایوسی جتائی اور چلتے وقت اُن کے چیلوں سے کہا کہ چونکہ یہ مرض وبائی ہے اس لئے تم لوگ اِس سے بچتے رہو۔ اور گروجی کے پاس بہت دیر تک نہ ٹھہرا کرو۔ یہ سُن کر شاگردوں کے ہوش اُڑ گئے اور آپس میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔ میں اُس وقت کہیں گیا ہوا تھا جب لوٹا تو اپنے گرو بھائیوں کو صد درجہ خائف پایا۔ سبب معلوم ہوتے ہی میں سیدھے اپنے مُرشد برحق کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ پیالی جس میں پرم ہنس جی کے حلق سے مواد فاسد خارج ہوا تھا اُٹھائی۔ سب شاگردوں کے روبرو نہایت اطمینان سے پی گیا۔ اور بولا۔ "دیکھیں میرے قریب موت کیوں کر آتی ہے۔"

آپ اصلاح تمدن کے پُرجوش حامی تھے مگر اُس کی موجودہ رفتار سے آپ کو اتفاق نہ تھا۔ اِس وقت ریفارم کی جو کوششیں کی جارہی ہیں وہ زیادہ تر اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے سے تعلق رکھتی ہیں۔ رسم پردہ۔ ازدواج بیوگان۔ قیود ذات یہ آجکل کے اہم ترین تمدنی مسائل ہیں جن میں اصلاح کی سخت ضرورت ہے اور یہ سب تعلیم یافتہ طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ سوامی جی کا معیار بہت اعلیٰ تھا یعنی نیچے طبقے کو اُبھارنا۔ اُنھیں تعلیم دینا اور اپنا بھائی بنانا۔ یہ لوگ ہندو قوم کی بیخ و بُنیاد ہیں اور تعلیم یافتہ طبقے اُن کی شاخیں۔ محض شاخوں کو تراشنے سے درخت تازہ و توانا

نہیں ہو سکتا۔ اگر درخت کو سرسبز بنانا ہے تو جڑ سے اصلاح ہونی چاہئے علاوہ بریں آپ اس معاملہ میں درُشت کلامیوں کو سخت مذموم سمجھتے تھے جن کا نتیجہ صرف یہی ہوتا ہے کہ وہی لوگ جنھیں حلقۂ اصلاح میں لانا ہے سخت کلامیوں سے تنگ آکر ترکی بہ ترکی جواب دینے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں اور ریفارم کی غرض و غایت صرف یہی ہو جاتی ہے کہ لاطائل مُباحثوں اور دِل دُکھانے والی نکتہ چینیوں سے ورق کے ورق سیاہ کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ سو برس سے زائد ہوئے کہ ریفارم کا کام جاری ہے مگر ہنوز کوئی نتیجہ نہیں برآمد ہوا۔ سوامی جی نے ریفارمروں کے لئے تین شرائط مقرر فرمائے ہیں۔ اوّل یہ کہ قوم و ملک کی محبت اُنکے سرشت میں داخل ہو گئی ہو۔ اُن کا دِل وسیع ہو اور ابنائے وطن کے فلاح کی سچّی خواہش اُن کے دِل میں جاگزیں ہو۔ دوسرے یہ کہ وہ اپنی اصلاحی تجاویز پر پختہ اعتقاد رکھتے ہوں اور تیسرے مستقل مزاج اور ثابت قدم ہوں۔ اصلاح کے پردے میں کوئی ذاتی مفاد مدِّ نظر نہ رکھتے ہوں اور اپنے اصولوں کے لئے سخت سے سخت مقابلہ پیشانی اور تکلیف اُٹھانے کے لئے تیار ہوں۔ یہاں تک کہ موت کا خوف بھی اُنھیں اپنے ارادہ سے باز نہ رکھ سکے جبتک ہم میں یہ تین قابلیتیں بدرجۂ اتم پیدا نہ ہو جائیں ریفارم کے لئے ہمارا کوشش کرنا بالکل فضول اور بیکار ہے مگر ہمارے ریفارمروں میں کتنے ہیں جن میں یہ قابلیتیں ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

"کیا ہندوستان میں کبھی مصلحوں کی کمی رہی ہے؟ کیا تم کبھی ہندوستان

کی تاریخ پڑھتے ہو۔ رامانج کون تھے؟ شنکر کون تھے؟ نانک کون تھے؟
چیتن کون تھے؟ دادو کون تھے؟ کیا رامانج نیچی ذاتوں کی طرف سے بے خبر
تھے؟ کیا وہ زندگی بھر اس امر کی کوشش نہیں کرتے رہے کہ چماروں کو
بھی اپنے فرقے میں شامل کر لیں۔ کیا انھوں نے مسلمانوں کو اپنے طبقے
میں ملانے کی کوشش نہیں کی۔ کیا گرونانک نے ہندو اور مسلمان دونوں
قوموں کو باہم ملا کر ایک بنانا نہیں چاہا تھا۔ ان سب بزرگوں نے کوشش
کی اور اُن کا نام ابھی تک جاری ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ آج کل کے ریفارمروں
کی طرح وہ سخت کلامیوں کے عادی نہ تھے۔ اُن کے مُنہ سے جب نکلتے تھے
کلمات شیریں۔ وہ کبھی کسی کو گالیاں نہیں دیتے تھے کسی کو مطعون نہیں کرتے تھے
"بیشک ہم نے اصلاح تمدن کے اُن بزرگ اور اہم مسائل کو نظر انداز کر دیا
ہے اور قدما نے جو روش اختیار کی تھی اُس طرف سے منحرف ہو گئے ہیں۔
اور اب اصلاح و تمدن کی کوشش محض نمائشی رہ گئی ہے" اصلاح تمدن کے
تمام مروجہ مسائل میں سوامی جی کو صرف ایک مسئلہ سے اتفاق تھا صغیر سنی کی
شادیوں اور عوام میں متاہل زندگی بسر کرنیکے ہیجان سے انھیں نفرت تھی۔ چنانچہ
رام کرشن مشن نے جو مدرسے قائم کئے ہیں اُن میں والدین کو یہ شرط بھی منظور
کرنی پڑتی ہے کہ لڑکے کی شادی کم از کم اٹھارہ برس کے سن کے قبل نہ کی
جائیگی۔ برہمچریہ کے وہ بڑے زبردست حامی تھے اور ہندوستان کی موجودہ

پست ہمتی اور ذلت کو وہ بالخصوص اس نقص تمدن سے منسوب کرتے تھے۔
آجکل کے ہندوؤں کی بابت وہ اکثر حقارت آمیز لہجے میں فرمایا کرتے تھے کہ یہاں پر بھیک منگا بھی یہ آرزو رکھتا ہے کہ شادی کر لوں اور ملک میں دس بارہ اور غلام پیدا کر دوں۔

موجودہ طرز تعلیم کے آپ سخت خلاف تھے۔آپ کا قول تھا کہ:۔

"تعلیم اُن معلومات کا نام نہیں ہے جو ہمارے دماغ میں ٹھونس دی جاتی ہیں بلکہ تعلیم کا منشاء اعلیٰ اخلاق کو سنوارنا۔انسان کو ثابت قدم بنانا اور ہماری عادات وخصائل کو سدھارنا ہے۔۔۔۔اس لئے ہمارا معیار یہ ہونا چاہئے کہ ہمارے ملک کی تعلیم علمی اور مذہبی سب کا انتظام ہمارے ہاتھوں میں ہو اور اُسکی پیروی حتی المقدور ہماری قدیم روش اور قدیم طرز پر کی جائے۔"

سوامی جی کا تعلیمی پروگرام بہت وسیع تھا ایک ہندو یونیورسٹی قائم کرنے کا بھی آپ کا قصد تھا۔مگر بوجوہ چند در چند آپ اس پر عمل نہ فرما سکے۔ہاں اُسکی ابتدا بیشک فرما گئے ہیں۔

تعصب کا آپ کے مزاج میں کہیں لیس بھی نہ تھا۔دیگر مذاہب کی توہین و تحقیر آپ بہت مذموم خیال فرماتے تھے۔عیسائیت۔اسلام۔بودھ مت سبھی مذاہب کو آپ یکساں احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔آپ نے اپنی ایک تقریر میں حضرت عیسیٰ کو البشور کا اوتار تسلیم کیا تھا آپ اپنے ہمقوموں کو ہمیشہ یاد دلاتے رہتے تھے کہ اپنے

اور عقیدہ رکھنا ہی عظمت کا راز ہے ہم اپنے اوپر بالکل بھروسہ نہیں رکھتے۔ ہم اپنے تئیں ذلیل وخوار سمجھتے ہیں اور اس وجہ سے ہم ذلیل وخوار ہیں۔ ہر انگریز سمجھتا ہے کہ میں بہادر ہوں دلیر ہوں اور جو چاہے کر سکتا ہوں۔ ہم ہندوستانی اپنی ناتوانی کے اس حد تک قائل ہیں کہ مردانگی کا خیال بھی ہمارے دلوں میں پیدا نہیں ہوتا۔ جب کوئی کہتا ہے کہ تمہارے آباواجداد گمراہ تھے۔ وہ غلط راستے پر چلے اور اس وجہ سے ہم اس حالت کو پہنچے تو ہم کو جتنی خجالت ہوتی ہے اُس کا اندازہ کرنا محال ہے اور ہماری ہمتیں اور بھی پسپا ہو جاتی ہیں۔ سوامی جی اس نکتہ کو خوب سمجھتے تھے اور کسی مذموم رسم کو بزرگانِ سلف سے کبھی منسوب بھی نہیں کرتے تھے۔ ہر ایک رسم اپنے زمانے میں مفید تھی اور آج اُسکی مذمت کرنا تحصیل لاحاصل ہے آج ہم اس امر پر زور دے رہے ہیں کہ سادھوؤں کے وجود سے مُلک کو کچھ فائدہ نہیں۔ اور ہماری فیاضی کو اُدھر سے منتقل ہو کر اسکولوں اور کالجوں اور اصلاح تمدّن کی کوششوں کی طرف آنا چاہیئے۔ سوامی جی اُسے خود غرضی خیال فرماتے تھے اور ہے بھی ایسا ہی۔ سادھو کیسا ہی کم علم ہو۔ اپنے مذہب سے کیسا ہی بے خبر ہو مگر وہ ہمارے ناتعلیم یافتہ دیہاتی ہموطنوں کی تسکین وتشفی کے لئے کافی علم رکھتا ہے اور اُس کی موٹی موٹی مذہبی باتیں کتنے ہی دلوں میں جگہ پاتی اور کتنوں ہی کے لئے خیر وبرکت کا باعث ہوتی ہیں۔ اگر اب اُن کا وجود ضروری نہیں خیال کیا جاتا تو کوئی ایسی تجویز سوچنی چاہئے جس سے اُن کا کام جاری رہے مگر ہم اس طرف مطلق خیال نہیں دوڑاتے اور

مذہبی تعلیم و تلقین کی جو گئی گذری مشین ہے اُسے کبھی توڑ پھوڑ کر برابر کیا چاہتے ہیں۔ الغرض سوامی اپنی قوم کا اخلاق۔ اُس کے مراسم۔ اُس کا ادب اور فلسفہ اُس کا طرز معاشرت اُس کے پرانے عظماء اور ہند کی خاک پاک سب کو محترم اور ممتاز سمجھتے تھے۔ آپ کی تقریر سے ذیل کا اقتباس آب زر سے لکھنے کے قابل ہے:۔

"پیارے ہموطنو۔ اے مقدس آریہ ورت کے بسنے والو! کیا تم اپنی ذلت آمیز بودے پن سے وہ آزادی حاصل کر سکو گے جو دلیروں کا حق ہے۔ اے برادرانِ ہند یہ خوب یاد رکھو کہ سیتا ساوتری اور دمینتی تمہاری قوم کی دیویاں ہیں۔ اے بہادرو مرد بنو۔ اور للکار کر کہو ”میں ہندوستانی ہوں میں ہند کا رہنے والا ہوں۔ ہندوستانی اور ہند کا بسنے والا خواہ کوئی ہو میرا بھائی ہے جاہل ہندوستانی۔ نادار ہندوستانی اعلیٰ قوم کا ہندوستانی ادنیٰ قوم کا ہندوستانی سب میرے بھائی ہیں۔ ہندوستانی میرا بھائی ہے۔ میری زندگی ہندوستان ہے۔ ہندوستان کے دیوتے میرے پرورش کرنیوالے ہیں۔ ہندوستان میرے بچپن کا گہوارہ۔ میرے شباب کا عیش گاہ اور میرے بڑھاپے کا فردوس بریں ہے۔ اے شنکر۔ اے مادر گیتی! مجھے مرد بنا۔ میری کمزوری کو دور کر اور میری بزدلی کو مٹا دے۔"

سوامی جی کی تلقینات کا لبّ لباب یہ تھا کہ ہم اپنی قوم کے ساتھ اپنا فرض ادا کریں۔ روحانیت حاصل کریں۔ مضبوط۔ شہ زور اور دلاور ہوں۔ نیچی ذاتوں

کو اُبھاریں اور اُنھیں اپنا بھائی سمجھیں۔ جب تک نوتے فیصدی ہندوستانی اپنے تئیں ذلیل ونادار سمجھتے رہینگے۔ یہ بالکل غیر ممکن ہے کہ ہندوستان میں اتفاق واتحاد پیدا ہوسکے۔ ہم مذہب پرست ہوں مگر سنیاسی اور تارک الدنیا نبیں۔ ہاں ہم اپنی قوم کے لئے ہر قسم کی قربانی کرنے پر آمادہ رہیں۔ ہم دولت وثروت پیدا کریں مگر اُسے ذاتی عیش وآرام میں نہ صرف کریں بلکہ قوم پہ نثار کر دیں۔ ہندو فلسفہ کے عملی پہلو پر عمل کریں اور نفس کشی اور ریاضت اور ترک اُن لوگوں کے لئے چھوڑ دیں جنھیں ایشور نے اِن بلندیوں تک پہنچنے کی توفیق دی ہے۔ سوامی جی کی تلقینات محبت اور طاقت پر مبنی تھیں۔ بیخوفی اُن کے تعلیم کی روح تھی۔ اور اپنے اوپر اعتقاد، اُس کا ایمان۔ اُن کی تعلیم میں کمزوری اور التجا کا مطلق گزر نہ تھا۔ اُن کا ویدانت انسان کو مصائب روزگار سے بچاتے اُسے مصائبات زندگی کا مقابلہ کرنے اور ذہنی اور روحانی تمنّاؤں برابریوں کی یکساں تعلیم دیتا تھا۔

# گیری بالڈی

جوزف گیری بالڈی جس نے اٹلی کو غلامی سے آزاد کیا۔ تاریخ کے اُن چند ناموروں میں سے ہے جو اپنی بے غرض اولوالعزمانہ حُبِّ وطن کے لیے دُنیا کے محسنوں میں شمار کئے گئے ہیں۔ وہ آزادی کا سچّا شیدائی تھا اور جب تک زندہ رہا نہ صرف اپنی قوم اور ملک کو عروج کے اعلیٰ مدارج پر پہنچانے کی کوشش کرتا رہا۔ بلکہ دیگر پامال اقوام کو بھی غار پستی سے نکالنے میں منہمک رہا۔ گیری بالڈی کا سا فراخ دِل اور انسانی ہمدردی سے معمور شخص تاریخ میں بہت شاذ نظر آتا ہے جو جھونپڑے میں پیدا ہوا جس کی صداقت اور جوش نے اُسے ساری قوم کا منظورِ نظر بنا دیا اور جس کی تعریف و توصیف میں ساری مہذّب دنیا یکساں ہم آواز ہے۔ اِس میں شک نہیں کہ اُس کی ذات میں کمزوریاں بھی تھیں۔ ایسا کون سا انسان ہے جو کمزوریوں سے پاک ہو مگر اِن کمزوریوں سے اس کی شہرت اور نیکنامی میں ذرہ بھر بھی فرق نہیں آتا۔ اُس کے ارادوں کی صفائی اور بے غرضی پر کبھی کسی کو

شبہ کرنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ اگر وہ چاہتا تو اُس مقبولیت عام کی بدولت جو اُسے حاصل تھی نہ صرف دولت و ثروت کے اعلیٰ ترین منازل پر پہنچ جاتا۔ بلکہ صاحب علم اور مالک دیہیم بن جاتا مگر اُس کی ذات ایسی خود غرضیوں سے پاک تھی جب اُس کی کوششیں بار آور ہوگئیں جب خستہ حال اور پامال اٹلی نے طوق غلامی کو نکال پھینکا تو وہ خاموشی سے اپنے وطن لوٹ آیا اور کنج عافیت میں بیٹھ کر بقیہ زندگی پیشہ زراعت میں کاٹ دی ایسی مثالیں بے شک موجود ہیں جن میں اُس کی سی جرأت اور بسالت موجود ہے مگر وہ صفت جس نے اُسے قوم اطالیہ کے لازوال شکریہ کا مستحق بنا دیا ہے۔ وہ اُس کی بے داغ نیک نیتی اور بے لوث پاکیزگی ہے۔

گیری بالڈی ۲۲۔ جولائی ۱۸۰۷ء میں بمقام نائس پیدا ہوا۔ اُس کا باپ ایک ادنیٰ درجہ کا جہازراں تھا جو نامساعدت روزگار کے باعث عُسرت کی زندگی بسر کرتا تھا۔ ہاں اُس کی ماں بڑی نیک ذات اور خوشخصال بیوی تھی۔ عُسرت وہ بلائے بد ہے کہ انسان کے بہت سے ذاتی محاسن پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ مگر اس تنگ حالی میں بھی یہ عورت بڑی قناعت اور اطمینان سے گزران کرتی تھی۔ اچھی ماؤں سے ہمیشہ اچھے بیٹے پیدا ہوا کئے ہیں ناموروں میں بیشتر ایسے ہیں جن کے دلوں میں اُن کی ماؤں ہی کی خوبیوں اور اوصاف حسنہ نے نیک ارادوں اور بلند حوصلوں کے بیج بوئے۔ گیری بالڈی بھی اپنی ماں کے محاسن ذاتی سے بہت متاثر ہوا۔ وہ خود لکھتا ہے۔

"وہ محبت خالص جو مجھے اپنے ملک کے ساتھ ہے اور جس نے مجھے اپنے بدقسمت ہموطنوں کا ہمدرد بنا دیا ہے اُس کا آغاز اُس وقت ہوا تھا جب میں اپنی غریب ماں کو غربا کے ساتھ ہمدردی اور خستہ حالوں پر رحم کرتے ہوئے دیکھتا تھا۔ مَیں باطل پرست نہیں ہوں لیکن میں اقرار کرتا ہوں کہ سخت سے سخت مصیبت کے وقت جب کہ سمندر میرے جہاز کو غرقاب کرنے پر تُلا ہوا تھا اور اُسے کاغذ کی ناؤ کی طرح تلے اوپر اُچھالتا تھا۔ یا جب ہوا کی سنسناہٹ کی طرح بندوق کی گولیاں میرے کان کے پاس سے سنسناتی ہوئی نکل جاتی تھیں اور اولے کی طرح میرے سر پر گولے برس رہے تھے اُس وقت میں اپنی مادرِ مہربان کو ہمیشہ اپنے بیٹے کے لئے درگاہ خدا میں سربسجود اور دست بدعا دیکھتا تھا۔ میری وہ جرأت اور دلیری جس پر اکثر لوگوں کو حیرت ہوتی ہے اس مضبوط عقیدہ کے باعث ہے کہ میرے اوپر کوئی بلا نہیں نازل ہو سکتی جب تک ایسی پاکباز اور فرشتہ خصال عورت میرے لئے دُعا کرتی ہے۔"

بچپنے ہی سے گیری بالڈی کی خلقی جنونی اور آزادروی اور حاجتمندوں کے ساتھ دردمندی اور رحم کا اظہار ہونے لگا۔ آٹھ سال کا بھی نہ ہونے پایا تھا کہ ایک عورت کو ڈوبتے دیکھ کر مردانہ وار دریا میں کود پڑا اور اُسے دہنِ اجل سے صاف نکال لایا۔ اُس کے چند سال کے بعد ایک بار جبکہ اُس کے چند احباب سیر و تفریح کے لئے کشتی پر گئے ہوئے تھے سخت طوفان آیا اور کشتی

کے چادرِ آب میں ڈھک جانے کا اندیشہ ہوا۔ گیری بالڈی کنارے سے یہ کیفیت دیکھ رہا تھا۔ فوراً کمر ہمت باندھ کر پانی میں کود پڑا اور کشتی کو صحیح و سالم ساحل تک لایا اُس کی جرأت اور انسانیت کی صدہا روایتیں زبان زدِ خاص و عام ہیں۔ یہی اوصاف تھے جنھوں نے بعد کو اُسے قوم کا ناخدا اور مایۂ ناز بنا دیا۔

والدین گو غریب تھے۔ مگر بیٹے کی ذہانت و ذکاوت دیکھ کر اُسے اچھی تعلیم دلوائی اور اُن کی خواہش تھی کہ وہ وکالت کا پیشہ اختیار کرے مگر ایک ایسے نوجوان کو جسے جہاز رانی اور سپہگری کی دُھن سوار تھی مقدموں کے ثبوت ڈھونڈھنے اور پرانی کرم خوردہ نظریں تلاش کرنے میں مطلق دلچسپی نہ ہو سکتی تھی۔ اس لئے اُس نے سارڈینیا کی بحری فوج میں ملازمت کر لی۔ اور کئی برس تک یہاں اُس مستقل مزاجی اور جفاکشی کے سبق سیکھتا رہا جس نے آگے چل کر اُس کے قومی آرزوؤں کے پورے ہونے میں بڑی مدد دی۔

اُس زمانہ میں ملک اٹلی کی حالت بہت ابتر ہو رہی تھی۔ شمال آسٹریا کے مظالم سے نالاں تھا۔ جنوب میں نیپلز کے بدعنوں کی دھوم تھی۔ وسط میں پوپ نے اندھیر مچا رکھا تھا اور مغرب میں پیڈمانٹ کے جور و جفا کا علم بلند تھا۔ مگر ہر طرفہ قومی بیداری کے آثار نمایاں ہو رہے تھے اور نوجوانوں کے دلوں میں اپنی قوم کو اُن مظالم سے آزاد کر لینے۔ اٹلی کو ایک قومی گورنمنٹ

بنانے اور اُسے سربرآوردہ اقوام کے زُمرہ میں لانے کی تحریک شروع ہو رہی تھی۔ جوش محض تعلیم یافتہ طبقہ تک محدود نہ تھا۔ بلکہ جمہور میں بھی اُس آزادی کا جوش جس نے فرانس کے شاہی حکومت کا شیرازہ بکھیر ڈالا تھا پیدا ہو چلا تھا۔ ہمدردانِ قوم نے "ینگ اٹلی" نام کی ایک انجمن قائم کر رکھی تھی جس کی رُوحِ رواں میزینی جیسا سچا محبِ وطن تھا۔ چنانچہ کامیابی کے لئے بہت سے وسائل اور ذرائع سوچنے کے بعد ۱۸۳۲ء میں اُس نے یہ فیصلہ کیا کہ ملک میں گورنمنٹوں کے خلاف شورش برپا کر دی جائے اور اس کا آغاز پیڈیمانٹ سے ہو۔ گیری بالڈی کو یہ خبر سن کر کب ضبط ہو سکتا تھا۔ فوراً ملازمت سے مستعفی ہو کر میزینی کی اعانت کے لئے جا پہنچا مگر غالباً مصالحہ پکا نہ تھا بھنڈا پھوٹ گیا اور جماعت منتشر کر دی گئی میزینی تو گرفتار ہو گیا۔ گیری بالڈی کسی طرح بچ نکلا۔ مگر اُس کی بے چین طبیعت کو چین کہاں؟ ہمیشہ درپردہ رسل و رسائل کے ذریعہ آگ بھڑکاتا رہتا تھا۔ دو برس بعد پھر ایک جماعت تیار کی مگر ابکی خود گرفتار ہو گیا۔ حاکم وقت نے سزائے موت کا مستوجب ٹھہرایا۔ قریب تھا کہ اُسے اپنے نیک ارادوں کے لئے شہید ہونا پڑے کہ جاں بَری کی صورتیں نکل آئیں۔ بھاگ کر فرانس آیا۔ اور طونس ہوتا ہوا جنوبی امریکہ میں داخل ہو گیا۔ یہاں اُن دنوں کئی قومیں اپنی حکمراں طاقتوں سے آزادی کے لئے آمادۂ جنگ و پیکار تھیں۔ گیری بالڈی نے باری باری سے اُن کی اعانت کی۔ چھوٹی

چھوٹی فوجیں لے کر برسوں تک کوہ و بیابان میں لڑتا رہا۔ اُس کی عصمت مآب اور وفادار بیوی انتیا اِن تمام مصائب سفر و حضر میں اُس کے ساتھ رہی۔ اِس ایام میں اُسے جنگی اُمور میں اس درجہ مصروفیت رہتی تھی کہ چار برس تک ایک روز بھی آرام سے بستر پر لیٹنا نہ نصیب ہوا۔ جب نیند کا غلبہ ہوتا گھوڑے کی پُشت پر سر نیچا کر لیتا۔ زیادہ مُہلت ہوتی تو زمین پہ دراز ہو جاتا۔ اس سے زیادہ قابل تعریف انتیا کا استقلال ہے جو شوہر کی خاطر یہ تمام مُصیبتیں اور صعوبتیں جھیلتی تھی اور حرف شکایت زبان تک نہ لاتی تھی۔

"اگرچہ ینگ اٹلی" اور اُس کے زیادہ تر شرکا جن میں میزینی بھی شامل تھا جلاوطنی کے مصائب جھیل رہے تھے مگر اُن کے خیالات خفیہ تحریروں کے ذریعہ سے عوام میں آزادی کی روح پھونکتے جاتے تھے۔ کئی بار کے ضعیف اظہاروں کے بعد آخر ۱۸۴۸ء میں جوش بھڑک اُٹھا۔ کئی شہروں میں رعایا نے آزادی کے علم بلند کر دئے اور میلان اور جنیوا میں آسٹریا کی فوجوں کو شکست بھی ہو گئی۔ پیڈ مانٹ کے حکمراں شاہ البرٹ نے پہلے تو آسٹریا کے خلاف اِس باغیانہ جوش کو بہت سختی سے زیر کرنے کی کوشش کی مگر جب اِن کوششوں میں کامیاب نہ ہوا اور رعایا کا جوش بڑھتا ہی گیا تو اِس خوف سے کہ مبادا اُس کی رعایا بھی شر و فساد پہ آمادہ ہو جائے۔ خُفیہ

طور پر باغیوں کی مدد کرنے لگا۔ پوپ نے بھی مصلحت وقت یہی دیکھا کہ رعایا کی مخالفت نہ کی جائے۔ جب اِن شورشوں کی حوصلہ بخش خبریں سمندر کو پار کر کے امریکہ پہنچیں تو اس غربت زدہ جاں نثار قوم کے دِل میں پھر جوش حُبِّ وطن موجزن ہونے لگا۔ اُس کے ساتھ اُس وقت تراسی[۹۳] آدمیوں سے زائد نہ تھے۔ اِسی قلیل جماعت کے ساتھ وہ شیرانہ وار اپنی مُہم پر چل کھڑا ہوا۔ روانگی کے وقت اِن آدمیوں میں سے کتنوں ہی کے حوصلے پست ہو گئے کہ کُجا ہم اور کُجا آسٹریا اور دیگر دوِل یورپ کی متفقہ فوجیں۔ صرف ۵۶ آدمی بچ رہے مگر گیری بالڈی کا حوصلہ دَبنا جانتا ہی نہ تھا۔ اُس کے استقلال نے ذرا بھی جُنبش نہ کھائی۔ اُنھیں ۵۶ آدمیوں اور چند بندوقوں کے ساتھ وہ ایک جہاز پر عازم اٹلی ہوا۔ یہاں جس جوش و خروش سے اُس کا خیر مقدم کیا گیا وہ اس بات کا ثبوت تھا کہ قوم میں جانداری اور روحانی آزادی کا سچّا جوش نفوذ کر گیا ہے۔

گیری بالڈی نے پہلے پوپ کے دربار میں ملازمت کی استدعا کی۔ اُس نے پوپ کے متعلق جو افواہیں سُنی تھیں اُن سے اُس کو یقین تھا کہ وہ ضرور میری خدمات قبول کرے گا اور مجھے آسٹریا والوں کی سرکوبی کا اچھا موقع ہاتھ آئے گا۔ مگر پوپ کے نیک اِرادوں کی قلعی بہت جلد کھل گئی۔ اُس نے نہ صرف گیری بالڈی کی خدمات نہ قبول کیں۔ بلکہ چند ایسی حرکتیں کیں جن سے

ظاہر ہو گیا کہ وہ سنگِ زر برادرِ شغال سے کم نہ تھا۔ اِدھر سے مایوس ہو کر گیری بالڈی نے پیڈمانٹ کے بادشاہ کی خدمت میں اپنا تیغہ پیش کیا۔ یہ وہی حضرت تھے جنھوں نے پہلے گیری بالڈی کو باغیانہ سازش کی پاداش میں جلاوطنی کی سزا دی تھی۔ اب عام جوش کی مخالفت میں اپنی سلامتی نہ دیکھ کر آسٹریا سے علانیہ مخالفت کرنی شروع کی تھی۔ مگر غالباً یہ زیادہ تر رعایا کو دھوکہ میں ڈالنے کے لئے تھا۔ گیری بالڈی کو یہاں سے بھی صاف جواب ملا۔ اِسی اثنا میں شورشِ عام سے خائف ہو کر پوپ نے راہبانہ لباس اُتار پھینکا اور روم سے بھاگ نکلا۔

پوپ کے مفرور ہونے کی خبر جوں ہی مشہور ہوئی کہ جلاوطن ہمدردانِ قوم اپنے اپنے پوشیدہ مقامات سے نکل کر روم کی طرف دوڑے اور وہاں ایک پارلیمنٹ قائم ہوئی جو چند روزہ ہونے کے باعث عارضی گورنمنٹ کہلاتی ہے۔ یہ دِن اٹلی کی تاریخ میں مبارک تھا۔ رعایا فرطِ مسرت سے پھولے نہ سماتی تھی۔ اِس گورنمنٹ نے گیری بالڈی کی خدمات بہت خوشی سے قبول کیں۔ اور وہ والنٹیروں کی ایک جماعت لے کر سیدھا شمال کی طرف چلا۔ یہاں متعدد مواقعہ پر اُس نے سپاہیانہ جانفروشی سے جو کام کئے اُن پر بہادر سے بہادر سپاہی کو ناز ہو سکتا ہے۔ متواتر کامیابیوں سے اُس کی شہرت روز افزوں ہوتی گئی اور قوم کے دلوں میں وقار جمتا گیا۔

اُس کی عادت غنیم کی افواج کا اندازہ کرنے کی نہ تھی اور اپنے جاں نثاروں کی جمعیت کا بھی وہ کچھ خیال نہ کرتا۔ اُس کا طریق عمل یہ تھا کہ جہاں دشمن کو سامنے دیکھا اور ٹوٹ پڑا۔ اس میں وہ ذرا بھی پس و پیش نہ کرتا۔ اور اُس کے یلغاروں میں کچھ ایسا زور ہوتا تھا کہ قریب قریب کل موقعوں پر اُس کی یہ حکمت کارگر ہوتی رہی۔ اپنے سے دس گُنی فوج کو جو سامانِ جنگ سے لیس ہوتی تھیں اُس نے بارہا اپنے خام کار نوآموز رنگروٹوں سے ہرا دیا۔ اس کا باعث یہ تھا کہ اُس کی جماعت کا ایک ایک متنفس نشۂ قومیت سے مخمور ہوتا تھا۔ ملن کے باشندوں نے آسٹریا کی بہت پُرزور مخالفت کی تھی۔ اس لئے آسٹریا کے غصہ کا آماج گاہ بھی وہی بنا ہوا تھا۔ گیری بالڈی اُس کی محافظت میں سرگرم تھا کہ روم سے خوف ناک خبریں آئیں۔ میزینی بھی سوئٹزرلینڈ سے وطن کو آرہا تھا۔ ملان میں دونوں ہمدردانِ قوم مدت دراز کی مفارقت کے بعد پھر بغلگیر ہوئے اور ساتھ ساتھ روم کی طرف چلے کہ وہاں پارلیمنٹ کے آئین و قوانین منضبط کریں اور ملک کو بدامنی و طوائف الملوکی کی مصیبتوں سے بچائیں۔

روم اُس وقت ہر چہار طرف سے بادِ حوادث کا شکار ہو رہا تھا۔ قومی گورنمنٹ جو قائم کی گئی تھی ابھی مستقل طور پر جمنے نہ پائی تھی کہ ایک طرف سے نیپلز کا بادشاہ اور دوسری طرف سے بوناپارٹ کی فوجیں

اُس کا گلا گھونٹنے کے لئے آپہنچیں۔اس کے علاوہ پوپ کے گوئندوں اور پادریوں نے عوام کی ضعیف الاعتقادیوں کو کام میں لاکر قومی گورنمنٹ کی طرف سے اُنھیں بدظن کرنا شروع کیا۔گیری بالڈی اِن تمام مخالف طاقتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار تھا۔پہلے والی نیپلس سے اُس کی مُٹ بھیڑ ہوئی۔اُس کے ساتھ پندرہ ہزار آزمودہ کار سپاہی تھے۔مگر اُس جماعت کثیر کو اُس نے دم زدن میں منتشر کر دیا اور بہت دور تک اُن کا تعاقب کیا۔اُس کا مقصد تھا کہ نیپلس پر چڑھ دوڑے کہ فرانسیسیوں کے آپہنچنے کی خبر سُنکر لوٹ پڑا۔فرانسیسی سپاہی جو افریقہ کے میدانوں سے تازہ تازہ لوٹے تھے۔بڑی پامردی سے لڑے اور قریب تھا کہ شہر میں گھس پڑیں کہ اِتنے میں گیری بالڈی اپنے ایک ہزار والنٹیروں کے ساتھ آپہنچا اور آٹھ ہزار آزمودہ کار فرانسیسیوں کو ایک نہایت سخت مقابلہ کے بعد پسپا کر دیا۔فرانسیسی جنرل ایسا گھبرایا کہ مصالحت کی درخواست کی۔گیری بالڈی اس کے خلاف تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ غنیم محض کُمک کا انتظار کرنے کے لئے مُہلت چاہتا ہے۔مگر میزینی نے صلح کرنا ہی زیادہ مُناسب سمجھا۔آخر اس ناعاقبت اندیشی کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرانسیسیوں نے دھوکا دے کر روم پر قبضہ کر لیا اور گیری بالڈی کو بڑی بے سروسامانی سے یہاں سے بھاگنا پڑا۔

اس طرح زک پاکر گیری بالڈی اپنے وفادار رفیقوں کے ساتھ جو ڈیڑھ ہزار کے قریب تھے توکل بخدا چل کھڑا ہوا۔ اُس کی باعصمت بیوی یہاں بھی اُس کے ساتھ تھی۔ وہ بہت دنوں تک سرگرداں و پریشان پھرتا رہا۔ رفیقوں کی تعداد روز بروز کم ہوتی جاتی تھی۔ نہ رسد کا کوئی سامان تھا۔ نہ اسلحہ کا کوئی انتظام۔ مخالفین اُس کے ایک ایک حرکت کی جانچ پرتال کیا کرتے تھے اور اُسے اتنی مُہلت نہ دیتے تھے کہ رعیّت میں کچھ شورش برپا کر سکے۔ آج یہاں ہے۔ کل وہاں ہے۔ نت دِن غنیموں کے دھاوے ہوتے ہیں۔ اُس کے اِن بادیہ پیمائیوں کا تذکرہ ایک نہایت دلچسپ فسانہ ہے۔ سچ ہے قوم کی خدمت آسان کام نہیں۔ اس کے لیئے بلند حوصلہ۔ آہنی استقلال۔ شبانہ روز کی جفاکشی اور سر بکف ہونے کی ضرورت ہے جب تک یہ اوصاف اپنی ذات میں سرایت نہ کر جائیں قومی خدمت کا بیڑا اُٹھانا زبانی ڈھکوسلا ہے۔ آخر ایک موقع پر آسٹریا کی افواج نے اُسے ایسا گھیر لیا کہ کہیں سے نکل بھاگنے کا راستہ نظر نہ آتا تھا۔ اُس کے رفیقوں نے جاں برآری کی کوئی صورت نہ دیکھ کر حوصلے ہار دیئے اور تقریباً نو سو آدمیوں نے ہتھیار رکھ کر غنیم سے اماں مانگی مگر آسٹریا کی سپاہ ایسی بد دل ہو رہی تھی کہ اُسے اِن بدقسمتوں کی حالت پر ذرا بھی ترس نہ آیا اور بجائے اُس رعایت کے جو قواعدِ جنگ کے مطابق اماں مانگنے والوں کے ساتھ

کی جانی چاہیئے۔ اُنھوں نے اُن لوگوں کو مقید کر کے جلاوطن کر دیا اور کتنوں ہی کے تازیانے لگوائے۔ گیری بالڈی کے ساتھ تین سو آدمیوں سے زائد نہ تھے۔ امتحان کا وقت بڑا ہوتا ہے۔ مگر اُس کے استقلال میں ذرا بھی فرق نہ آیا۔ ذرا بھی خائف و ہراساں نہ ہوا۔ اس قلیل جماعت کے ساتھ غنیم کے نرغہ سے مردانہ وار نکل پڑا اور اُن کی صفوں کو چیرتا پھاڑتا سمندر کے کنارے آپہنچا۔ یہاں پندرہ کشتیاں تیار تھیں اُن میں بیٹھ کر وینس کی طرف رُخ کیا۔ تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ آسٹریا کی دُخانی کشتیاں تعاقب میں آتی ہوئی دکھائی دیں اور دیکھتے دیکھتے اس کے ساتھ کی تیرہ کشتیاں گرفتار بلا ہو گئیں۔ صرف دو جن میں گیری بالڈی، اُس کی بیوی اور چند اور رفیق تھے۔ ایک جزیرہ کے کنارے آلگیں۔ یہاں گیری بالڈی کی زندگی کا نہایت دردناک سانحہ وقوع میں آیا۔ غریب انتیا حاملہ تھی اور مصائب سفر جھیلتے جھیلتے تنگ آگئی تھی۔ تکان اور غلبہ بیماری نے اُسے چلنے پھرنے سے معذور کر رکھا تھا۔ گیری بالڈی نے کوئی چارہ نہ دیکھ کر اپنے رفیقوں کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اور اپنی بیوی کو گود میں لے کر چلا۔ تین دن کے بعد اُس نے ایک کسان کا دروازہ کھٹکھٹایا اور پانی مانگا۔ انتیا کو شدت کی پیاس لگی ہوئی تھی۔ مگر وہ موت کی تشنگی تھی جو شربت مرگ کے چکھنے ہی سے بجھی۔ گیری بالڈی اُس کے مُنھ میں پانی کے قطرے ٹپکا رہا تھا

کہ اُس کی روح پرواز کر گئی۔ اس صدمہ کا گیری بالڈی پر جو اثر ہوا وہ مدت العمر قائم رہا۔ یہاں تک کہ دم مرگ بھی اپنی پیاری بیوی ہی کا نام اُس کے ورد زبان تھا۔ بہت رویا پیٹا۔ مگر وہاں رونے کی فرصت نہ تھی۔ دشمن قریب آپہنچا تھا مجبوراً وہاں سے بھاگ کر وینیس میں جا داخل ہوا۔ وہاں سے جنیوا کی طرف چلا۔ مگر کہیں مقصد بر آری کی کوئی صورت نظر نہ آئی جنیوا سے طونس ہوتا ہوا جبرالٹر پہنچا مگر یہاں بھی اُسے چین نہ نصیب ہوا۔ حکومتیں اس کے نام سے گھبراتی تھیں۔ حتیٰ کہ جبرالٹر میں بھی جو انگریزی عملداری ہے اُسے رہنے کی اجازت نہ ملی۔ مجبوراً یہاں سے لورپول آیا اور لورپول سے ممالک متحدہ امریکہ کی راہ لی۔ یہاں کوئی اور مشغلہ نہ پاکر اُس نے ایک انگریزی صابن کے کارخانے میں ملازمت کر لی۔ تعجب ہے کہ ایسے عالی نفس اور بلند حوصلہ شخص کو ایسے ذلیل پیشے کی طرف کیونکر رجحان ہوا۔ غالباً کسب معاش کی ضرورتوں نے مجبور کر رکھا ہوگا۔ کیونکہ اُسکی مالی حالت بالکل قابل اطمینان نہ تھی۔ کچھ دنوں یہاں دفع الوقتی کرنے کے بعد اُس نے ایک جہاز کی ملازمت کر لی۔ اور چین آسٹریلیا وغیرہ مقامات میں عرصہ تک جہازرانی کرتا رہا۔ اِن بادیہ گردیوں کے کئی سال بعد وہ ایک بار نیوکیسل آیا۔ رعایا نے اُس کا بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا اور اُسے ایک تلوار اور ایک دوربین تحفتہً دی۔ اُس موقع پر جو تقریر

کی گئی اُس کے جواب میں گیری بالڈی نے کہا۔

"اگر تمھارے وطن برطانیہ عظمےٰ کو کبھی کسی مددگار کی ضرورت ہو تو ایسا کون بدقسمت اٹالین ہے جو میرے ساتھ اُس کی مدد پر آمادہ نہ ہوگا۔ تمھارے ملک نے آسٹریا والوں کو وہ تازیانہ لگایا ہے جسے وہ کبھی فراموش نہ کر سکیں گے۔ اگر انگلینڈ کو کبھی کسی جائز معاملہ میں میرے اسلحہ کی ضرورت پڑے تو میں اُس نادر تیغہ کو جو تم نے مجھے "تحفۃً" دیا ہے بڑے فخر سے نیام سے باہر کرونگا۔"

چونکہ اب سلطنت پیڈمانٹ میں امن ہو گیا تھا۔ گیری بالڈی نے کیپریرا نامی جزیرہ خرید لیا اور اُسے آباد کرکے زراعت کا پیشہ کرنے لگا۔ زراعتی پیداواروں کو نواح کے بازاروں میں فروخت کیا کرتا تھا۔ وہ تو یہاں بیٹھا ہوا زراعت و تجارت میں مُنہمک تھا۔ اُدھر اٹلی کے مُلکی معاملات میں بڑی سُرعت سے تغیر و تبدل ہو رہے تھے۔ یہاں تک کہ آسٹریا کے مُظالم سے جان بہ تنگ آکر پیڈمانٹ گورنمنٹ نے فرانس کی مدد سے آسٹریا سے جنگ کا اعلان کیا۔ اب گیری بالڈی کی ضرورت محسوس ہوئی اور وزیر اعظم کیوور نے ماہ اپریل ۱۸۵۹ء میں اُسے حمایت قوم کی دعوت دی۔ گیری بالڈی فی الفور گوشۂ عافیت سے نکل کھڑا ہوا۔ اُس کی ہر خاص و عام کے دِلوں میں اتنی جگہ تھی اور وہ اپنے ارادوں کا ایسا سچا اور

نیک تھا کہ دیگر عہدہ داران فوج جوانِ شورشیوں سے کچھ ذاتی مفاد کی صورتیں نکالنا چاہتے تھے اُس سے بدظن ہونے لگے لیکن نئے نوجوان بادشاہ وکٹر ایمینوئیل نے جو اُس کے خصائل سے بخوبی آگاہ تھا فرمایا۔ آپ جہاں چاہیں جائیں۔ آپ جو چاہیں کریں۔ مجھے صرف اس بات کا افسوس ہے کہ میں آپ کے پہلو بہ پہلو چل کر شرط وفا نہیں ادا کر سکتا۔"

اس طرح بادشاہ سے آزادی افعال کی سند پا کر گیری بالڈی نے آسٹریا کے خلاف اُن چھوٹی چھوٹی لڑائیوں کا سلسلہ شروع کیا جو تاریخ میں اپنا ثانی نہیں رکھتیں۔ اُس کے ساتھ سترّہ ہزار آدمی تھے اور یہ سب قریب قریب وہ نوجوان والنٹیر تھے جنھوں نے بہبود قوم پر اپنی جانوں کے نثار کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ اُن سے اُس نے متعدد لڑائیاں جیتیں کومو اور برگو کو چھین لیا اور آخر ش حریف کو شمال اٹلی سے باہر نکال دیا۔ اُدھر پیڈمانٹ اور فرانس کی متحدہ افواج نے بھی آسٹریا والوں کو متعدد زکیں دیں اور اُن سے لمبارڈی چھین لیا مگر فتوحات کا یہ سلسلہ عرصہ تک قائم نہ رہنے پایا۔ شہنشاہ نپولین نے پیڈمانٹ کو زیادہ طاقتور ہوتے دیکھ کر لڑائی کے بند کرنے کا حکم دیا۔ آسٹریا نے بھی موقع غنیمت جانا اور برائے چندے دم لینا مناسب سمجھا۔ گیری بالڈی شروع سے کہتا آتا تھا کہ خارجی قوتوں کی مدد سے قوم کبھی نہیں آزاد ہو سکتی۔ وہ شاہ فرانس

کی امداد قبول کرنے کے بالکل مخالف تھا مگر پیڈ یانٹ گورنمنٹ نے اُسکے مشورہ کے خلاف کارروائی کی تھی۔ اور اب اُنھیں اپنی ناعاقبت اندیشی کا خمیازہ اُٹھانا پڑا۔ اگر اُس وقت تک تھوڑے ہی دنوں تک لڑائی اور جاری رہتی تو اٹلی میں آسٹریا کا قلع قمع ہوجاتا مگر لڑائی کے بند ہوجانے سے اُسے پھر اپنی طاقت کے مجتمع کرنے کا موقع مل گیا۔ آخر گیری بالڈی نے ناراض ہوکر استعفا دیدیا لیکن شاہ ایمینوئیل نے ایسے نازک وقت میں اُس کا استعفاء منظور کرنا مناسب نہ سمجھا۔ لہذا گیری بالڈی نے اپنے ہی والنٹیرز سے آزادانہ طور پر لڑائی جاری رکھنے کا ذمّہ لیا۔ مگر بالواسطہ اور بلاواسطہ اُس پر چو طرفہ سے ایسے دباؤ پڑنے لگے کہ آخر کار مایوس ہوکر اُس نے پھر استعفا دیا اور اب کی بار یہ منظور کرلیا گیا۔ حالانکہ قوم نے اس منظوری کو نہایت مُخالفانہ نگاہوں سے دیکھا مگر اِس آزادی کے دلدادہ اور قوم کے عاشق زار سے خاموش کب بیٹھا جاتا تھا وہ تحریر و تقریر سے قوم کو حصول آزادی کے لئے اُبھارتا رہتا تھا۔ خفیہ رسالوں اور پوشیدہ مضامین کے ذریعہ سے اُنکے قومی جذبات مشتعل کئے جاتے تھے۔ متواتر اعلان شائع کئے جاتے تھے جن میں مقصد برآری کے وسائل اور ذرائع پر پُر زور الفاظ میں بحث کی جاتی تھی۔ اُس کا قول تھا کہ جب تک ملک میں دس لاکھ بندوقیں اور دس لاکھ نشانہ لگانے والے نہ ہوجائیں گے قوم کو آزادی

کبھی نہ ملے گی۔ آخر اِن اعلانوں کا یہ اثر ہوا کہ اہلِ امریکہ نے مدد کے طور پر
چوبیس ہزار بندوقیں ایک جہاز میں لدوا کر گیری بالڈی کے پاس
بھیجیں۔ کئی ہزار نوجوان اپنے کو قوم پر قربان کرنے کے لئے آمادہ ہوگئے
اور گیری بالڈی دو ہزار آدمیوں کو لے کر سسلی کی طرف چلا۔ یہاں نیپلز
کے بادشاہ نے رعایا کو ستا ستا کر بغاوت پر آمادہ کر رکھا تھا۔ اِن مظلوموں
نے جوں ہی سُنا کہ گیری بالڈی اُن کی مدد کو آ رہا ہے تو اپنی تیاریوں میں
مصروف ہوئے اور بڑی گرمجوشی سے اُسکا خیر مقدم کیا۔ مصالحہ تیار تھا ہی گیری بالڈی
نے آتے ہی پلرمو پر ایسا پُر زور دھاوا کیا کہ شاہی فوج قلعہ میں بند ہوگئی اور
امان مانگی۔ رعایا کو اُس پر ایسا اعتقاد تھا کہ اُس نے اپنا آزاد کنندہ
تسلیم کرکے "سسلی کا ڈکٹیٹر" کا خطاب دیا۔ شاہ ایمینوئیل اس مہم کے
پہلے ہی سے مخالف تھے۔ اس خوف سے کہ مبادا شاہ نیپلز آسٹریا سے
صلح کرکے ہمارے ملک پر حملہ کر بیٹھے۔ جب اس فتح کی خبر پائی تو گیری بالڈی
سے استدعا کی کہ اب آپ نیپلز کی گورنمنٹ کو اور زیادہ دق نہ کریں کہ وہ
متحدہ اٹلی کا ایک جزو بن سکے مگر گیری بالڈی اپنی رائے پر قائم رہا۔ پہلے
تو اس نے شاہی فوج کو سسلی سے نکالا۔ بعد ازاں اٹلی کے جنوبی ساحل
پر اُتر پڑا۔ اِس کی خبر پاتے ہی چو طرفہ سے رعایا اس کی جماعت میں شریک
ہونے کے لئے ٹوٹنے لگی گویا اُسی کی منتظر تھی۔ بیشتر مقامات میں جدید عارضی

گورنمنٹیں قائم ہوگئیں اور ۳۱ اگست کو رعایا نے باقاعدہ طور پر سسلی کا ڈکٹیٹر کا لقب جو شاہ نیپلز کو حاصل تھا گیری بالڈی کو دیدیا۔ فرانسس کے ہوش اڑے۔ گیری بالڈی کے خلاف اعلان جنگ کیا مگر تین لڑائیوں میں ایک کا بھی نتیجہ اُس کے حق میں اچھا نہ ہوا۔ ۸ ستمبر کو گیری بالڈی نیپلز داخل ہوا اُس کے دوسرے دن وکٹر امینوئیل وہاں کا بادشاہ مشتہر کیا گیا اور کُل سلطنت کی رعایا کے اتفاق رائے سے سسلی اور نیپلز دونوں پیڈمانٹ کے ممالک میں ملحق کردے گئے۔

اِس اہم قومی خدمت کو انجام دے کر جو اُس کا نصف ثمرۂ زندگانی کہا جاسکتا ہے اُس نے اپنی فوج برخاست کردی اور اپنے جزیرہ کو لوٹ آیا۔ اب صرف روم اور وینس وہ مقام رہے جو ابھی تک پوپ اور آسٹریا کے پنجۂ بیداد میں پھنسے ہوئے تھے۔ دو سال تک اپنے کُنج تنہائی میں بیٹھا ہوا گیری بالڈی اِن مظلوموں میں آزادی کی روح پھونکتا رہا۔ آخر اُس کی سرگرمیوں کا جادو چل گیا اور وینس والوں نے بھی آزاد ہونے کے لئے آمادگی ظاہر کی۔ اب کیا دیر تھی گیری بالڈی فی الفور اپنے ساتھ چُنے آدمیوں کی ایک جمعیت لیکر چل کھڑا ہوا مگر وکٹر امینوئیل کو اُس کی یہ جسارت ناگوار گزری۔ وزیر اعظم کیوور کے مر جانے سے اب اُس کے مُشیروں میں کوئی جری اور ذی حوصلہ آدمی باقی نہ رہا تھا۔ سب کے سب ڈر گئے کہ کہیں آسٹریا

والے ہمارے درپے آزار نہ ہو جائیں اِس لئے گیری بالڈی کو روکنے
کے لئے فوج روانہ کی۔ وہ اپنے ہموطنوں سے لڑنا نہ چاہتا تھا حتیٰ الوسع
بچتا رہا مگر آخر گِھر گیا۔ اور نوبت یہ جنگ پہنچی۔ ممکن تھا کہ وہ یہاں سے بھی
صاف نِکل جاتا۔ مگر اُس کے کئی زخم ایسے کاری لگے تھے کہ مجبوراً وطن کو لوٹ
آیا اور کئی ماہ تک بستر پہ قیدی بنا پڑا رہا۔

سنہ ۱۸۶۴ء میں گیری بالڈی انگلستان کی سیر کو آیا۔ یہاں جس تزک و
احتشام سے اُس کا استقبال کیا گیا اور جس شان و شکوہ سے اُس کی سواری
نِکلی وہ تاجداروں کی تشریف آوری کے موافقہ پر بھی مشکل سے نظر آ سکتا
ہے۔ جیسا ازدحام گلی کوچوں اور خاص خاص مقامات پر اُس کے دیدار کیلئے ہوا
ویسا انبوہ کثیر کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ یہاں وہ دس دِن تک مقیم رہا۔
صدہا جماعتوں نے اُسے ایڈرس دئیے کتنے ہی شہروں نے تیغے اور
اعزازی خطابات اُسکے نذر کئے۔ ۲۲ اپریل کو وہ پھر اپنے جزیرہ کو لوٹ آیا۔

اِسی اثناء میں آسٹریا اور پروشیا میں جنگ چِھڑ گئی۔ گیری بالڈی نے
مُخالفین کو اُدھر مصروف دیکھ کر اپنی مقصد برآریوں کی صورتیں سوچ لیں۔
چنانچہ ۱۱ جون سنہ ۱۸۶۶ء کو وہ یکایک جینوا میں آ پہنچا اور آسٹریا کے خلاف
شورش برپا کر دی مگر پہلی ہی لڑائی میں اُس کی ران میں ایسا زخم لگا کہ
اُس کے جانبازوں کو پسپا ہونا پڑا۔ زخم سے صحت پانے پر اُس نے کوشش کی کہ

فرانس کی عملداری میں چلا جائے اور اُدھر سے غنیم پر حملہ آور ہو۔ مگر آسٹریا کی فوجوں نے یہاں اُسے پھر روکا اور ایک بڑی خونریز لڑائی ہوئی جس میں مخالفین کو شکست فاش ملی چونکہ آسٹریا کے لئے پروشیا ہی کا مقابلہ کرنا آسان نہ تھا۔ اس لئے جنوبی لڑائیوں کے مقابلے میں اُس نے شمال کی طرف رجوع ہونا زیادہ مناسب سمجھا چنانچہ مصالحت کی کوشش ہونے لگی اور جنگ کا خاتمہ بالخیر ہوا۔ بعد مدت کے وینس والوں کی آرزوئیں برآئیں اور وہ بھی متحدہ اٹلی کا ایک صوبہ قرار دیا گیا۔

۱۸۶۷ء میں گیری بالڈی نے روم پر پھر حملہ کرنے کی تیاریاں شروع کیں۔ ہر چند کہ اٹالین گورنمنٹ نے اُس کے راستے میں رکاوٹیں ڈالیں اور اُسے قید بھی کر دیا مگر وہ یہ سب مراحل طے کرتا ہوا آخر فلورنس میں آپہنچا۔ صرف پوپ کا علاقہ ہی اٹلی میں اب ایسا خطّہ رہ گیا تھا جہاں قومی حکومت نہ ہو اور گیری بالڈی کی روح کو اُس وقت تک چین نہیں ہو سکتا تھا جب تک کہ وہ اٹلی کی ایک ایک اُنگل زمین کو غیر قومی حکومت سے باہر نہ نکال لے۔ حالانکہ اُس نے دو بار روم کو پوپ کے مظالم سے آزاد کرانے کی سخت کوشش کی تھی مگر دونوں بار ناکام رہا تھا۔ جوں ہی اُس کے فلورنس میں آپہنچنے کی خبر مشہور ہوئی رعایا میں جوش پھیل گیا اور چند ہی دنوں میں اُس کے ساتھ والنٹیروں کی ایک خاص فوج تیار ہوگئی پوپ کی

فوجیں بھی آمادہ تھیں۔ لڑائی شروع ہو گئی۔ اور گو پہلی فتح گیری بالڈی کے ہاتھ رہی مگر دوسری لڑائی میں فرانس اور پوپ کی متحدہ فوجوں نے اُسے شکست دی۔ بہت سے آدمی کام آئے۔ کتنے ہی قید کر لئے گئے۔ گیری بالڈی بچ گیا۔ غالباً پوپ نے اُس کا چلا جانا ہی زیادہ مناسب سمجھا کیونکہ اُسے قید کر لینے سے ملک میں ایک زبردست ہنگامہ بپا ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ مگر جب وہ ناکام اور دل شکستہ اپنے وطن کی طرف لوٹا جا رہا تھا۔ پیڈمانٹ کے فوجی افسروں نے اُسے گرفتار کر لیا اور قید کرنے کی نیت کی۔ اس خبر کے پھیلتے ہی کئی مقامات پر رعایا بگڑ گئی۔ اور ایک عام بغاوت کا احتمال ہوا۔ ناچار حاکموں نے اُسے آزاد کر دیا۔ جب قوم اور سرغنہ قوم میں ایسے مضبوط رشتے ہوتے ہیں تب جا کر قومیں آزاد ہوتی ہیں۔ حالانکہ اُس وقت علاقہ پوپ میں اُس کی کوششیں سر سبز نہ ہوئیں مگر اُس کے تین ہی برس بعد جب فرانس اور پروشیا میں جنگ چھڑ گئی تو یہ خطہ بہت آسانی سے شاہ اٹلی کے ہاتھ میں آ گیا اور سارے ملک میں جنوب سے شمال تک ایک ہی رنگ کا جھنڈا لہرانے لگا۔

اِس طرح گیری بالڈی کی زندگی کا مشن پورا ہوا۔ اُس نے اٹلی کو متحد کرنے اور اُس میں ایک قومی حکومت قائم کرنے کا بیڑہ اُٹھایا تھا اور اُس کی کوشش اُس کے دورانِ زندگی ہی میں بارور ہو گئی۔ اُس کی دلی

آرزو تھی کہ اٹلی ایک قوم ہوجائے اور اسکی یہ دلی آرزو برآئی۔ اس میں شک نہیں کہ اس آرزو کے برآنے میں بہت سی ذاتی قربانیاں کرنی پڑیں۔ ہزارہا بندگانِ خدا کی جانیں گئیں کتنی ہی عورتیں بیوہ اور کتنے ہی بچے یتیم ہوگئے۔ مگر آج اِن باتوں میں سے ایک بھی یاد نہیں اور مشکل سے ایسا کوئی اٹالین ہوگا جو اِن آزادی کے شہیدوں پر حزن و ملال کے آنسو بہاتا ہو۔ ہاں اُن قربانیوں کا جو مبارک نتیجہ برآمد ہوا وہ آج ساری دُنیا کے پیش نظر ہے۔

گیری بالڈی اپنی ہی قوم کو آزاد کرکے آسودہ نہیں ہوا ہے۔ گو وہ بوڑھا ہو گیا ہے اُسکے قویٰ ضعیف ہوگئے ہیں مگر اُس کے حوصلے وہی ہیں اور نسل انسانی سے اُسکی ہمدردیاں ویسی ہی مضبوط۔ پروشیا کو فرانس کی تذلیل و تحقیر پر آمادہ دیکھ کر اُس کے دل میں پھر اُمنگ پیدا ہوجاتی ہے۔ ہر چند کہ فرانس اُس کا دشمن قدیم ہے اور ابھی پوپ ہی کی امداد میں اُسکی قوم کے صدہا نوجوانوں کے خون بہا چکا ہے مگر یہ ناہمدردانہ خیالات اُس کے دل میں جگہ نہیں پاتے۔ وہ اپنے کنج عافیت سے نکل کھڑا ہوتا ہے اور اِس عالم ضعیفی میں فرانس کی خاطر توپ و تفنگ کا سامنا کرتا ہے اور اُسے پروشیا کے پنجہ تصرف میں پڑ جانے سے بچا لیتا ہے۔

فرانس اور پروشیا میں صلح ہوجانے کے بعد گیری بالڈی اپنے وطن کو واپس آیا۔ اور اب چونکہ قوم کو اُس کی سپاہیانہ قابلیتوں کی ضرورت نہ تھی۔ وہ اپنے کنبے کے ساتھ اطمینان سے بڑھاپے کے دن بسر کرنے لگا۔ مگر اُس حالت میں بھی قوم کی طرف سے بے خبر نہ رہتا تھا۔ بلکہ اُس کی صنعت و حرفت کی ترقی کی تجاویز اور ذرائع سوچنے

میں مصروف رہتا تھا۔ ۱۸۷۵ء میں وہ اپنے بال بچوں کے ساتھ روم کی زیارت کے لئے روانہ ہوا۔ یہاں اُس کا جیسا شاندار استقبال ہوا وہ دنیا کی تاریخ میں بے نظیر ہے۔ جب وہ یہاں سے واپس چلا تو بیس ہزار آدمی پاپیادہ قومی گیت گاتے بجاتے اُسے رخصت کرنے آئے۔ اُس کی ساری زندگی کی قربانیوں کے صلہ میں یہی ایک نظارہ کافی تھا۔

گیری بالڈی کی بقیہ زندگی کپریرا میں صرف ہوئی۔ یہاں وہ اپنے عیال و اطفال کے ساتھ اطمینان سے گزران کرتا رہا۔ اُسکے قوی سب مضمحل ہو گئے تھے۔ تندرستی بھی رخصت ہو چلی تھی۔ مگر محنت و مشقت سے ایسی خلقی الفت تھی کہ دم آخر تک کوئی نہ کوئی شغل کرتا رہا جب اور سب قوی جواب دے چکے تو بیٹھا ناول لکھوایا کرتا۔ آخر ۱۸۸۲ء میں چند دن بیمار رہکر اِس دارفانی سے رحلت کی اور ایک ایسے شخص کی یادگار چھوڑی جو ملک کا شیدائی اور سچا فنا فی القوم اور نہ صرف اٹلی بلکہ سارے بنی نوع انسان کا ہمدرد اور دوست تھا۔

آج اُس کا نام اٹالین قوم کے ایک ایک بچہ کے وردِ زبان ہے اور اُس کی جرأت۔ فیاضی۔ اولوالعزمی اور شرافت کی صدہا مثالیں زبان زد خاص و عام ہیں۔ ایسا مشکل سے کوئی شہر ہوگا جہاں کے باشندوں نے اُس کا سنگی بت نصب کرکے اپنے شکریہ کا حق نہ ادا کیا ہو مگر اُس کے کارناموں کی بہترین اور زندہ یادگار وہ وسیع سلطنت ہے جو کوہِ آلپس سے لے کر سسلی تک پھیلی ہوئی ہے۔ اور وہ قوم جو آج اٹالین کے نام سے مشہور ہے۔

# ڈاکٹر سر رام کرشن بھنڈارکر

ڈاکٹر بھنڈارکر کے حالات زندگی اُن لوگوں کے لئے خاص طور پر سبق آموز ہیں جن کا صیغۂ تعلیم سے تعلق ہے۔ اُن کی زندگی سے ہم کو سب سے بڑا یہ سبق ملتا ہے کہ اپنے ارادہ کا مضبوط اور دُھن کا پکّا آدمی خواہ کسی صیغہ میں کیوں نہ ہو عزت و نیکنامی کے اونچے سے اونچے معیار پر چڑھ سکتا ہے۔ ڈاکٹر بھنڈارکر کی ذات میں ذہنی اوصاف کے ساتھ مضبوط ارادہ اور سخت جفاکشی کا ایسا اتحاد ہو گیا تھا جو بہت کم دیکھنے میں آتا ہے اور جو کبھی ناکام نہیں رہ سکتا۔ تاریخی تلاش و تحقیقات میں کوئی ہندوستانی عالم آپ کا ہمسر نہیں۔ سنسکرت ادب اور صرف و نحو کے آپ ایسے جیّد عالم تھے کہ یورپ اور امریکہ کے بڑے ماہر السنہ آپ کے سامنے فرق عقیدت خم کرتے تھے۔ پراکرت زبانوں کا اس مُلک میں اب نام بھی باقی نہیں۔ پالی۔ ماگدھی بھاشاؤں کا سمجھنے والا تو درکنار اِن کے حروف شناس بھی مُشکل سے ملیں گے۔ اگر علمائے یورپ نے اِدھر توجہ نہ کی ہوتی تو یقیناً اِن بھاشاؤں کا دُنیا میں وجود قائم نہ رہ سکتا۔ ڈاکٹر بھنڈارکر پراکرت زبانوں کے نہ صرف مسلم الثبوت ماہر تھے بلکہ آپ نے اِن میں بہت سی تحقیقاتیں بھی کی تھیں۔

تاریخ زباندانی اور علم الاسلاف کے ہر ایک صیغہ میں ڈاکٹر بھنڈارکر کو دستگاہ تھی۔ جرمنی کی مشہور گاٹنگن یونیورسٹی نے آپ کو ڈاکٹر کا خطاب دیا تھا۔ اور گورنمنٹ نے آپ کی کے۔سی۔ایس۔آئی اور سر کے خطاب سے عزت افزائی کر کے آپ کے کمالات کا اعتراف کیا تھا۔

ڈاکٹر بھنڈارکر کے والد ایک قلیل تنخواہ کے محرّر تھے اور اتنا مقدور نہ تھا کہ اپنے لڑکوں کو انگریزی تعلیم کے لئے کسی شہر میں بھیج سکتے۔ مگر حسن اتفاق سے ۱۸۴۹ء میں اُن کا تبادلہ رتناگری کو ہوا۔ یہاں ایک انگریزی اسکول کھلا ہوا تھا۔ بچّہ رام کرشن نے اِسی اسکول میں انگریزی شروع کی اور چھ سال میں یہاں کی تعلیم ختم کر کے الفنسٹن کالج میں شریک ہونے کیلئے بضد ہوئے۔ اِن کے والد نے پہلے تو انھیں روکنا چاہا کیونکہ ان کی آمدنی اِتنی وافر نہ تھی کہ کالج کی تعلیم کے مصارف اُٹھا سکتے مگر لڑکے کو بیقرار دیکھا تو راضی ہو گئے۔ اُس وقت تک بمبئی یونیورسٹی قائم نہ ہوئی تھی اور ڈگریاں بھی نہ دیجاتی تھیں۔ مسٹر دادابھائی نوروجی اُسوقت اُس کالج میں پروفیسر تھے۔ رام کرشن نے اپنی ذہانت اور محنت سے بہت جلد طلبا میں ایک ممتاز جگہ حاصل کر لی اور کالج کی تعلیم ختم کرنے کے بعد اُسی کالج میں پروفیسر ہو گئے۔ اُسی زمانہ میں آپ کو سنسکرت کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا اور اوقات فرصت اُس کی نذر کرنے لگے۔

اِسی اثناء میں بمبئی یونیورسٹی قائم ہوئی اور پروفیسروں کو تاکید ہوئی کہ وہ بی۔اے کی ڈگری حاصل کریں ورنہ اپنے عہدہ سے معزول کیئے جائیں گے۔ ڈاکٹر بھنڈارکر

نے وقت معینہ کے اندر ایم۔اے پاس کرلیا اور حیدر آباد سندھ کے ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوگئے۔ سال بھر کے بعد وہ اپنی پرانی تعلیم گاہ رتناگری اسکول کی ہیڈ ماسٹری پر تبدیل کیے گئے۔ یہاں اُنھوں نے سنسکرت کی پہلی اور دوسری کتابیں تصنیف کیں۔ یہ کتابیں بہت مقبول ہوئیں اس وقت تک ان کے بیسیوں ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ سنسکرت زبان کا مطالعہ ان کی بدولت مقابلتہً بہت آسان ہوگیا ہے اور اُن کا رواج ایسا عام ہے کہ کسی ہندی کا جزودان اُن سے خالی نظر نہ آئے گا۔ دس برس تک آپ الفنسٹن اور دکن کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے کام کرتے رہے یہاں تک کہ ۱۸۷۹ء میں ڈاکٹر کیل ہارن کے مستعفی ہونے کے بعد آپ دکن کالج میں مستقل پروفیسر ہوگئے اور تب سے پنشن لینے تک اُسی عہدہ پر مامور رہے۔

ڈاکٹر بھنڈارکر نے آثار قدیمہ کی تحقیقات اور کھوج میں عالمگیر شہرت حاصل کرلی ہے۔ اُنھیں یہ شوق کیونکر پیدا ہوا اُس کا تذکرہ بہت دلچسپ ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ جس کام میں ہاتھ لگاتے تھے اُسے ادھورا نہیں چھوڑتے تھے۔ ۱۸۶۷ء میں ایک پارسی صاحب کو تانبے کی ایک لوح ہاتھ آگئی۔ یہ کسی پرانے کھنڈر میں دفن تھی اور اُس پر زمانہ قدیم کی دیوناگری رسم الخط میں کچھ عبارت منقوش تھی۔ پارسی صاحب نے وہ لوح ڈاکٹر بھنڈارکر کو دی کہ شاید وہ کچھ عبارت کا مطلب نکال سکیں۔ ڈاکٹر صاحب اُس وقت تک قدیم حروف سے ناآشنا تھے۔

عبارت کو نہ پڑھ سکے مگر پراکرت کے رسم الخط کا علم حاصل کرنے کی دھن پیدا ہوگئی۔ یوروپین علماء نے اس صیغۂ تعلیم میں نہ صرف پیش روؤں کا کام کیا ہے بلکہ انھیں اس کا مسیح سمجھنا چاہیئے۔ ڈاکٹر بھنڈارکر نے اس موضوع پر متعدد کتابیں جمع کیں اور نہایت سرگرمی کے ساتھ تحصیل علم میں مصروف ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے سال بھر کے اندر اُس لوح کی عبارت کو نہ صرف سمجھ لیا بلکہ اُس پر مجلس علما میں ایک معرکے کی تقریر کی۔ محض اتنا ہی نہیں بلکہ اس شعبۂ علم سے انھیں مناسبت پیدا ہوگئی اور علمی تفتیش و تحقیقات کا کام شروع ہوگیا۔ آپ نے آثارِ قدیم اور قدیم تاریخی مسائل پر متعدد مضامین لکھے۔ پراکرت اور قدیم تاریخی مسائل باہم اس قدر مخلوط ہیں کہ ایک کو جاننا اور دوسرے سے نابلد رہنا غیر ممکن ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر بھنڈارکر نے پراکرت میں بھی عالمانہ مزاولت حاصل کرلی۔ ۱۸۷۴ء میں لندن میں مستشرقین کی ایک کانگریس ہوئی آپ بھی مدعو ہوئے مگر خانگی وجوہات کے باعث شریک نہ ہوسکے۔ تاہم آپ نے ایک محققانہ مضمون لکھ کر بھیجا جس کی وسیع تحقیقات کی بہت تعریف کی گئی۔

۱۸۷۶ء میں السنہ قدیمہ کی ترویج کے خیال سے پروفیسر ولسن کی یادگار میں سالانہ تدریس و تقریر کے لئے ایک جگہ قائم کی گئی۔ اور اس عالمانہ منصب پر ڈاکٹر بھنڈارکر فائز ہوئے۔ انھیں کئی انگریز علما کے مقابلہ میں ترجیح دی گئی۔ ہندوستان میں اِس منصب کے وہی مستحق تھے۔ اپنی خلقی سرگرمی و یکسوئی کے

ساتھ وہ اس کام میں مصروف ہوئے اور سنسکرت پراکرت اور موجودہ بھاشاؤں پر اُنھوں نے جو لکچر دیئے وہ کمال تحقیق اور تاریخی انکشافات کے لحاظ سے بہت عرصہ تک یادگار رہیں گے۔ اِن کی تیاری میں ڈاکٹر بھنڈارکر کو ریاضت شاقہ کرنا پڑی۔ مگر ایسی خدمات کا جو کچھ بہترین صلہ مل سکتا ہے وہ ہاتھ آگیا۔ علما نے بڑی کشادہ دلی سے داد دی اور گورنمنٹ کو بھی عملی طور پر قدردانی کرنے کا جلد موقع ملگیا۔ یہ تجویز کچھ عرصہ سے درپیش تھی کہ ہندوستان کے قدیم غیر مطبوعہ مسودات سنسکرت کی تلاش کی جائے اور اُنکا مجموعہ تاریخی تحقیقات کے لئے علما کے روبرو رکھا جائے کیونکہ مورخین کا خیال تھا کہ ہندوستان میں ازمنہ قدیم کی مستند تاریخ مدوّن کرنے کے مسالہ کی کمی نہیں۔ وہ جابجا کھنڈروں میں، پرائیویٹ کتب خانوں میں حوادثِ روزگار سے جانیں بچا بچا کر چھپے پڑے ہوئے ہیں اور اُن کے مطالعہ سے اُس زمانہ کی تاریخ پر بہت کچھ روشنی پڑسکتی ہے مگر اُن کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالنا آسان کام نہ تھا۔ یہ اہم خدمت ڈاکٹر بھنڈارکر کو عطا ہوئی اور اُنھوں نے اس کام کو جس قابلیت سے انجام دیا وہ حسن تعریف سے مستغنی ہے۔ نہ صرف متعدد بیش بہا مسودے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالے بلکہ اُن پر محققانہ رپورٹ بھی تیار کی جو پانچ ضخیم جلدوں میں ختم ہوئی ہے۔ اِس صیغہ میں ڈاکٹر بھنڈارکر نے پیشرو کا کام کیا ہے اور مزید تحقیقات کے لئے میدان صاف کر دیا ہے۔ اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں کہ اُنھیں اِس کام میں کیسی کیسی موانعات کا سامنا کرنا پڑا۔ اِس ملک میں جس شخص کے قبضہ

میں پرانی کتاب ہے خواہ وہ حسن وعشق کا قصہ ہی کیوں نہ ہو وہ اُسے نسخۂ کیمیا سمجھے ہوئے بیٹھا ہے اور گوارا نہیں کرتا کہ کسی غیر کی پردہ شکن نگاہ اُس پر پڑے۔ ایسے لوگوں کی تالیف قلب کرنا ڈاکٹر صاحب ہی کا کام تھا۔ آج یہ ضخیم رپورٹ علماء و مورخین کے لئے نظارۂ حیرت بنی ہوئی ہے اور شاید کچھ دنوں تک اُسے لوگ دقیق مطالعہ، صحیح امتیاز اور مورخانہ تحقیق کا نمونہ سمجھتے رہیں گے۔

سنہ ۱۸۸۶ء میں وائنا میں مستشرقین کی ایک کانگریس پھر منعقد ہوئی۔ اب کی بار ڈاکٹر بھنڈارکر نے دعوت منظور کر لی اور یورپ کے حالات کا غائر نگاہوں سے مطالعہ کیا اس کے ایک سال بعد گورنمنٹ آف انڈیا نے اُنھیں سی، آئی، ای، کا خطاب عطا کرکے علم و فضیلت کی قدردانی فرمائی مطالعہ اور تحقیقات کا یہ شغل جاری رہا۔ یہاں تک کہ پنشن کا زمانہ آپہنچا اور ڈاکٹر بھنڈارکر نے پونا میں سکونت اختیار کی مگر ملک کو ابھی اُن کی خدمات کی ضرورت تھی سنہ ۱۹۰۱ء میں آپ بمبئی یونیورسٹی کے وائس چینسلر مامور ہوئے۔ یہ اُنکے مسلسل احسانات اور حسن خدمات کا اعتراف تھا۔

متذکرہ بالا علمی مشاغل کے علاوہ ڈاکٹر بھنڈارکر نے بمبئی گزیٹیر کے لئے قدیم دکن کی ایک تاریخ لکھی جس پر ہر ایک صورت سے تاریخ کا صحیح اطلاق کیا جا سکتا ہے۔ وہ نہ صرف واقعات کی ایک جامع فہرست ہے بلکہ اس سے اسلامی حملوں سے قبل کے طرز معاشرت رسم و رواج اور آئین و قوانین پر بھی روشنی

پڑتی ہے اس تاریخ کا مسالہ اِدھر اُدھر منتشر پڑا ہوا تھا اُن کو ایک جا جمع کرنا، ان اُن کی تقدیم و تاخیر کا تصفیہ اور اُن بکھرے ہوئے سنگریزوں سے ایک عالیشان عمارت کھڑی کرنا دشوار کام تھا۔ حق یہ ہے کہ ڈاکٹر بھنڈارکر خلقتاً طالب علم واقع ہوئے تھے۔ فطرت نے اُنھیں جانچ پڑتال کا زبردست ملکہ عطا کیا تھا۔ علم سے اُنھیں عشق تھا۔ ایک پیاس تھی جو کسی طرح نہیں بجھتی تھی۔ وہ جب کسی علمی مسئلہ کو ہاتھ میں لیتے تھے تو اُس کی تحقیق میں ہمہ تن محو ہو جاتے تھے اور اُس کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے۔ سطحی معلومات سے اُن کی تحقیق پسند طبیعت کو تسکین نہ ہوتی تھی۔ بے دلی اور کم توجہی سے اُنھوں نے کوئی کام نہیں شروع کیا اور اپنے شاگردوں میں کبھی اس عادت کو کبھی روا نہیں رکھا۔ مناظرہ اور مجادلہ میں بھی اُنھیں کمال حاصل تھا۔ وہ بہت تعمیم و توجیہ کے بعد علمی مسئلے قائم کرتے تھے اور تنقید و تبصرے کے تیز ترین شعلے بھی اُن کا بال بیکا نہیں کر سکتے تھے۔ عالمانہ ضد سے بھی اُنھوں نے کافی حصّہ پایا تھا اور جب اَڑ جاتے تھے تو کسی طرح نہیں ٹلتے تھے۔ وہ ایک وقت ایک ہی مسئلہ کی طرف رجوع ہوتے تھے اور اپنے دماغ کی مجموعی قوت اُس پر صرف کر دیتے تھے۔ اس لیے جب کبھی مباحثہ کی ضرورت ہوتی تو استدلال اور تمثیل سے کامل طور پر مسلّح ہو کر میدان میں اُتر آتے تھے۔

پروفیسر بھنڈارکر کا اپنے شاگردوں کے ساتھ ہمیشہ بہت شریفانہ اور

ہمدردانہ برتاؤ رہتا تھا۔ ایک اچھے اتالیق کے فرائض یہ ہیں کہ وہ اپنے شاگردوں کا رہنما۔ دوست مشیر کار ہو۔ ڈاکٹر بھنڈارکر نے اس معیار کو ہمیشہ پیش نظر رکھا۔ ہونہار لڑکوں کو آپ بقدر ضرورت مالی امداد بھی فرمایا کرتے تھے اُن کے طلبا کو اُن پر کامل اعتماد تھا اور اپنے تردّدات ومشکلات میں وہ ڈاکٹر صاحب ہی سے مشورہ کرتے اور اُس پر کاربند ہوتے۔ بیشتر پروفیسروں کی طرح وہ اپنی ذمہ داریوں کو صرف لیکچر ہال تک محدود نہیں کرتے تھے۔

طلبا کے لئے اُن کے مکان پر کسی وقت روک ٹوک نہ تھی۔ ایک زندہ مثال سے جو تعلیمی اور اخلاقی مقاصد پورے ہو سکتے ہیں وہ پند و نصائح کے دفتروں سے بھی نہیں ہو سکتے۔ ڈاکٹر بھنڈارکر اپنے طلبا کے لئے ہمدردی و حسنِ اخلاق اور آزادی کی زندہ مثال تھے اور چونکہ یہ اُن کے نمائشی نہیں بلکہ طبعی اور ارادی اوصاف تھے اس لئے طلبا کے دلوں پر نقش ہو جاتے تھے سنسکرت کے پروفیسروں کو اکثر یہ شکایت رہتی ہے کہ طلبا دیگر مضامین کے مقابلہ میں اُسکی طرف بہت کم توجہ کرتے ہیں۔ حالانکہ سنسکرت ادب کی خوبیاں اور نازک خیالیاں اُنکی ضیافت طبع کا کافی سامان مہیا کرتی ہیں۔ ڈاکٹر بھنڈارکر کو کبھی یہ شکایت نہیں ہوئی۔ اِن کے لیکچر ہمیشہ محویت سے سُنے جاتے تھے طلبا کو وقت کی شکایت ذرا بھی محسوس نہ ہوتی۔ کچھ تو مضمون متعلقہ پر اُن کی عالمانہ قدرت اور کچھ اُنکی طبعی سرگرمی اور زندہ دلی۔ توجہ اور خیالات پر جادو کا اثر کرتی۔

بمبئی میں اُنھوں نے سنسکرت کے مطالعہ کا شوق پیدا کرنے میں بڑی کامیابی حاصل کی تھی۔ آپ کے شاگردوں میں ایسے شاذ ہی نکلیں گے جنھیں سنسکرت زبان کی لطافت کا چسکا نہ پڑ گیا ہو۔ اُنھوں نے ہمیشہ معاملات زندگی میں آزادانہ روش اختیار کی تملق اور بیجا خوشامد سے اُنھوں نے اپنی زبان کو آلودہ نہیں کیا اور غالباً کبھی اسباب خارجی سے دیکر اپنے اُصول اور عمل میں ناموافقت نہیں ہونے دی۔ اُن کی زندگی ترغیبات سے بےلوث رہی ہے۔ اُتنی ہی جتنی کہ انسان کے امکان میں ہے۔ اُنھیں شاید کسی بات سے اتنا روحانی صدمہ نہیں ہوتا تھا جتنا کہ اپنے اخلاق پر بیجا حملے سے۔ اُنھوں نے مراعات وعنایات کی کبھی ہوس نہیں کی۔ شہرت وجاہ طلبی سے محترز رہے۔ یہ وہ کمزوریاں ہیں جو بعض اوقات بہترین انسانوں کو گمراہ کر دیتی ہیں۔ آزاد اور بےلوث دلوں پر اُن کا جادو نہیں چلتا۔ تاہم گورنمنٹ کی نظر الطاف اُن کی مساعدت کرتی رہی۔ وہ اعلیٰ ترین اعزازات اور خطابات جن کے لئے لوگ ترستے ہیں اُنھیں بے مانگے مل گئے۔ سی۔ آئی۔ ای۔ پہلے ہی ہو چکے تھے جشن دربار کے موقع پر اُنھیں سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب عطا ہوا۔ اگر ثبوت درکار ہو تو یہ اس امر کا کافی ثبوت ہے کہ مورد عنایات ہونے کیلئے ہمیں اپنی خودداری اور حق پسندی کے خون کرنے کی مطلق ضرورت نہیں۔ جو لوگ ایسا سمجھتے ہیں، اُن کی تعداد بے شمار ہے۔ وہ نہ صرف اپنی کم نگاہی کا اظہار کرتے ہیں بلکہ گورنمنٹ کی نیت وانصاف اور دانائی کو بدنام کرتے ہیں۔ حالانکہ بہت افسوس سے

کہنا پڑتا ہے کہ بعض اوقات گورنمنٹ کے آئین الطاف اس خیال کی تصدیق کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ آزادی اور حق پسندی اس کے لیے چنداں ضروری نہیں۔

ڈاکٹر بھنڈارکر میں ایک بڑا وصف یہ تھا کہ وہ عالمانہ تعصب سے پاک تھے۔ دیگر علما کی طرح انھوں نے کبھی اپنے ہمعصروں کی ناقدری نہیں کی بلکہ شروع سے اُن کا رویہ یہ رہا کہ دوسروں کے دل میں بھی تحقیق و تلاش کا شوق پیدا کریں۔ اُن کی حوصلہ افزائی کریں اور مشورہ اور ہدایات سے اُن کے معاون ہوں تاکہ اُن کے بعد اس شعبہ میں دلچسپی لینے والوں کا قحط نہ ہو جائے۔

الغرض ڈاکٹر بھنڈارکر کی ذات مبارک ہندوستان کے لیے مایۂ ناز تھی۔ آپ نے ثابت کر دیا تھا کہ ہندوستانی لوگ علم کے دقیق شعبوں میں بھی یوروپین علما کے دوش بدوش گامزن ہو سکتے ہیں۔ جرمن، فرانس، انگلستان سبھی ملکوں کے علما آپ کے معتقد ہیں۔ اور ہمارے لیے جو اُن کے ہموطن ہونے کا فخر رکھتے ہیں۔ اُن کی زندگی ایک کھلی ہوئی کتاب ہے جس میں جلی حروف میں لکھا ہوا ہے کہ "استقلال انتظام اور بلند نگاہ کامیاب زندگی کے راز ہیں" جسٹس چندرا وارکر نے جن کو آپ سے فخر تلمذ حاصل ہے، آپ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

"سر بھنڈارکر نے باوجود متعدد مشکلات کے اپنے برتاوات میں لگاؤ نہیں رکھا اور کبھی شہرت کی فکر نہیں کی۔ انھوں نے ہمیشہ حق کی وکالت کی ہے مگر حق کو ملائم اور شیریں الفاظ میں چھپا کر ناحق پسندوں کی دلجوئی اور دلداری نہیں کی۔

آپ برہمو سماج کے پیرو ہیں اور ذات پات اور چھوت چھات کی تفریق کو قومیت کے منافی سمجھتے ہیں۔ بھگوت گیتا اور اُپنشد آپ کی زندگی کے نور ہدایت ہیں۔ یہی آپ کی روحانی تشفی اور صفائی قلب کے ذریعے ہیں۔ مورتی پوجن یا اصنام پرستی پر آپ کا اعتقاد نہیں۔ آپ کو ویدوں اور اُپنشدوں اور بھگوت گیتا میں مورتی پوجن کی کوئی سند نہیں ملتی۔ آپ نے بہت تحقیقات کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ رسم ہندوؤں نے جین اور بودھ فرقوں سے لی ہے۔ اگرچہ جینیوں اور بودھوں کا خالق بالاوصاف پر عقیدہ نہیں تھا۔ مگر جب اُن کے علما اور اولیا انتقال کرتے تو وہ اُن کی یادگار میں بُت اور پیکر نصب کیا کرتے تھے۔ ہندوؤں نے یہ رواج اُن سے لیا اور اُسی نے اب بُت پرستی کی صورت اختیار کر لی ہے۔ باوجود اس کے اکثر تعلیم یافتہ ہندو مورتی پوجن کے ایسے گرویدہ ہیں اور اُس پر اُن کا ایسا پختہ اعتماد ہے گویا یہی ہندومت کی جان ہے۔ تمدنی معاملات میں آپ اصلاح کے پیرو ہیں اور عملی طور پر اس کا اظہار کر چکے ہیں۔ مئی ۱۹۱۰ء میں آپ نے اپنی بدھوا لڑکی کی شادی کر کے اپنی اخلاقی جرأت کا ثبوت دے دیا۔ جو مدعیان اصلاح میں ایک کمیاب وصف ہے جس قوم میں ایسے نفس پاک پیدا ہوتے رہیں اُسکے مستقبل کی نسبت کوئی شک نہیں کیا جا سکتا۔



سر سید احمد خاں

# سرسیّد

کیا بہ حیثیت مدبّر، کیا بہ حیثیت مصنّف، کیا بہ حیثیت مذہبی پیشوا اور مصلح اور کیا بہ حیثیت خادمِ قوم، سرسیّد احمد کو جو شہرتِ دوام حاصل ہے وہ ہندوستان کے دنیاءِ اسلام میں شاید ہی کسی بزرگ کو حاصل ہوا۔ ہم میں سے ہر ایک کا فرض ہے کہ ہم اِس بزرگ کے سوانحِ زندگی کو غور سے مطالعہ کریں اور تحقیق کریں کہ اِن میں وہ کیا خوبیاں تھیں جن کی بدولت وہ اِس قدر اعزاز و امتیاز حاصل کر سکے اور قوم کی اِتنی خدمت کر سکے۔ اُن کی انگریزی استعداد بہت کم تھی، وہ گھر کے مالدار نہ تھے قوم میں بھی اُن کے حامیوں کی تعداد اُن کے مخالفوں سے زیادہ نہ تھی لیکن باوجود اِن سوانحات کے اُنھوں نے دنیاءِ علم و ادب اور دنیاءِ عمل میں لافانی یادگاریں چھوڑیں۔ یہ محض خدمتِ قوم کا جوش تھا جس نے ساری دشواریوں پر فتح پائی۔

سیّد احمد، ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں بھی اُن کے قوائے جسمانی غیر معمولی طور پر مضبوط تھے لیکن ذہنی اعتبار سے اُن کا

شمار عام طلبا میں تھا۔ اُس وقت کون یہ پیشین گوئی کر سکتا تھا کہ ایک زمانہ آئے گا جب یہ لڑکا اپنے ملک اور قوم کے لئے باعث فخر ہوگا۔ اُن کی تعلیم بھی عام مسلمان بچّوں کی طرح قرآن شریف سے شروع ہوئی۔ اُن کی اُستانی ایک شریف پردہ نشین خاتون تھیں، اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں بھی شریف گھرانوں میں بچّوں کی تعلیم اُستانیوں ہی کے سپرد کی جاتی تھی۔ آج یوروپ میں مدارس کی ابتدائی جماعتوں میں بالعموم عورتیں ہی پڑھاتی ہیں۔ اپنی خلقی نرم دلی، تحمّل، ضبط اور محبت کے باعث وہ فطرتاً بچّوں کی تعلیم کے لئے موزوں ہوتی ہیں۔

سیّد احمد خاں نے قرآن ختم کرنے کے بعد فارسی اور عربی شروع کی۔ اٹھارہ اُنیس برس کی عمر میں اُنھوں نے پڑھنا چھوڑ دیا، مگر کتابوں کے مطالعہ کا شوق اُنھیں مدّت العمر رہا۔ اُس وقت دہلی کی سلطنت کا صرف ایک مٹا ہوا نشان رہ گیا تھا۔ بادشاہ قلعہ دہلی میں کسی سجّادہ نشین کی طرح رہتا تھا اور انگریزی سرکار کا وظیفہ خوار تھا۔ بابر اور اکبر کی اولاد اب قریب قریب دہلی میں قید تھی۔ سیّد احمد کے والد شاہی دربار میں ملازم تھے۔ لیکن اُن کے انتقال کے بعد تنخواہ بند ہوگئی اور سیّد احمد خاں کو معاش کی فکر پیدا ہوئی۔ اُنھوں نے انگریزی سرکار کی ملازمت قبول کر لی اور ۱۸۳۹ء میں کمشنری آگرہ کے نائب منشی مقرر ہوئے۔ یہاں اُنھوں نے اتنی جانفشانی سے کام کیا کہ دو ہی سال میں اُن کی ترقی منصفی کے عہدہ پر ہوگئی اور مین پوری میں تعینات کئے گئے۔ اِسی زمانہ میں اُنھوں نے

اپنی مشہور کتاب آثار الصنادید لکھی جس میں قدیم شاہی عمارتوں کے حالات بڑی تفصیل اور تحقیق سے قلمبند کئے گئے ہیں۔ یہ تصنیف زبان اُردو کے کلاسک میں شمار ہوتی ہے۔

۱۸۵۷ء کے غدر میں سیّد احمد خاں بجنور میں منصف تھے۔ یہ وہ پُرآشوب زمانہ تھا جب کہ انگریز افسر اور اُن کی بیویاں اور بچّے باغیوں کے خوف سے جائے امن تلاش کرتے پھرتے تھے۔ باغی کمال بیدردی سے جس انگریز کو پاجاتے قتل کر ڈالتے تھے۔ اُس وقت باغیوں کی مرضی کے خلاف کوئی کام کرنا خود اپنی جان خطرہ میں ڈالنا تھا۔ لیکن سید احمد خاں نے اُس وقت بھی حق کی حمایت سے دریغ نہ کیا اور مظلوموں کی حمایت میں سینہ سپر ہو گئے جو انسان کا اخلاقی فرض ہے۔ اُن کی کوشش سے کتنے ہی انگریزوں کی جان بچ گئی۔ باغیوں کو اُن پر شک ہوا۔ انھوں نے آپ کے مکان کا محاصرہ کر لیا۔ انھیں طرح طرح کی دھمکیاں دیں یہاں تک کہ اُن کا مکان اُن سے جبراً خالی کرالیا اور اُن کا اثاثہ بھی لوٹ لیا۔ سید احمد خاں نے استقلال کے ساتھ یہ ساری مصیبتیں جھیلیں مگر جنھیں پناہ دی تھی انھیں باغیوں کے حوالے نہ کیا۔ جب غدر فرو ہو گیا اور سرکار کا مُلک پر دوبارہ تسلّط ہوا تو باغیوں کے جرم کی تحقیقات کے لئے ایک کمیٹی مقرر ہوئی۔ سیّد احمد خاں اُس کمیٹی کے ممبر بنائے گئے۔ اُس وقت اِس کا

بڑا اندیشہ تھا کہ گنہگاروں کے ساتھ بے گناہ نہ پس جائیں، حملہ کرنے والوں کے ساتھ اپنی محافظت کے لئے شمشیر بہ کف ہونے والے اشخاص پر بھی عتاب نہ نازل ہو جائے۔ سید احمد اس نیک ارادہ سے کمیٹی میں شریک ہوئے کہ حتی الامکان بیگناہوں کی حفاظت کریں۔ ذاتی مفاد یا کسی صلہ کی انھیں مطلق تمنّا نہ تھی۔ چنانچہ جب ایک باغی مسلمان رئیس کی جائداد کثیر ضبط کر لی گئی اور سرکار نے اُسے سید احمد خاں کو اُن کی خدمات کے صلہ میں دینا چاہا تو انھوں نے اُسے شکریہ کے ساتھ واپس کر دیا۔ ایک مصیبت زدہ بھائی کی تباہی سے مستفید ہونا اُن کی باحمیّت اسلامی فطرت نے گوارا نہ کیا۔

دو سال بعد سید احمد خاں نے "اسباب بغاوت ہند" نامی ایک رسالہ شائع کیا۔ اس میں انھوں نے دلائل اور واقعات سے ثابت کیا کہ یہ غدر ملکی بغاوت نہ تھی، نہ جنگ آزادی، نہ کسی قسم کی سازش۔ بلکہ صرف سپاہیوں کی عدول حکمی تھی اور وہ بھی بوجہ جہالت اور توہمات۔ چونکہ گورنمنٹ کا یہ خیال تھا کہ اس غدر کے محرّک مسلمان ہیں اس رسالہ کا ایک منشا یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کے سر سے یہ الزام دور کر دیا جائے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ سید احمد خاں کو اس مقصد میں کامیابی حاصل ہوئی۔ انھوں نے اس رسالہ کو گورنمنٹ آف انڈیا اور پارلیمنٹ میں بھیجا، اور

چونکہ سرکار کو اُن کی خیرخواہی اور وفاداری پر کامل یقین تھا اُس نے اُن اسباب ودلائل پر ٹھنڈے دل سے غور کیا اور جو شکایتیں اُسے صحیح معلوم ہوئیں اُن کے دور کرنے کا وعدہ بھی کیا۔ سیّد احمد خاں کی اِس اخلاقی جرأت کی کن لفظوں میں تعریف کی جائے۔ جس زمانہ میں کہ سرکار سختیوں کی جانب مائل تھی اور کسی کی زبان کھولنے کی ہمّت نہ پڑتی تھی کہ مبادا اُسپر بغاوت کا شبہ کیا جانے لگے اُس وقت گورنمنٹ کے طرزِ عمل پر نکتہ چینی کرنا اور اُس کی بے عنوانیوں کا پردہ فاش کرنا بیش بہا ملکی اور قومی خدمت تھی۔

سیّد احمد خاں کو جو خدمت عطا ہوئی تھی اُسے دل وجان سے انجام دیتے تھے۔ وہ اِس مقولہ کے پابند تھے کہ جو کام کرنا ہو اُسے دل سے کرنا چاہیئے۔ بیدلی سے یا بیگانہ سمجھکر وہ کوئی کام نہ کرتے تھے۔ وہ مراد آباد میں تھے جب امساکِ باراں نے فصل تباہ کردی اور ملک میں شدید قحط پڑ گیا۔ سرکار نے وہاں ایک محتاج خانہ کھولا اور اُس کا انتظام سیّد احمد خاں کے سپرد کیا۔ اُس وقت جتنی تندہی سے اُنھوں نے قحط زدوں کی امداد کی، پردہ نشین مستورات اور سفید پوش مفلسوں کی جس انسانیت اور ہمدردی کے ساتھ دستگیری کی، وہ تعریف سے مستغنی ہے۔ کسی فرقہ یا مذہب کا آدمی کیوں نہ ہو، اُن کی ہمدردی

سب کے ساتھ یکساں تھی۔

آج کل تو مذہبی مباحثوں کا زور کچھ کم ہو گیا ہے، لیکن اُس زمانہ میں عیسائی مشنری عیسائیت کی منادی کے جوش میں ہندو اور مسلمان مذاہب پر علانیہ اعتراضات کیا کرتے تھے۔ اور چونکہ اُس وقت علما اور پنڈتوں میں یہ صلاحیت نہ تھی کہ وہ مذہبی احکام اور روایتوں کی معقولیت کے ساتھ تشریح کر سکیں اور الفاظ کے پردہ میں چھپے ہوئے معانی کو واضح کر سکیں اس لئے عیسائی مشنریوں کے سامنے وہ لاجواب ہو جاتے تھے اور اس کا عوام پر بہت بُرا اثر پڑتا تھا۔ سیّد احمد خاں نے مشنریوں کے اس حملہ سے اسلام کو بچانے کے لئے یہ ضروری سمجھا کہ عیسائیوں کے اعتراضات کا دنداں شکن جواب دیا جائے اور قرآن اور بائبل کا موازنہ کر کے دکھایا جائے کہ دونوں کتابوں میں کس قدر یکسانیت ہے۔ اِسی ارادہ سے اُنھوں نے بائبل کی تفسیر لکھنی شروع کی، مگر یہ کتاب پوری نہ ہو سکی۔ لیکن ملازمت سے پنشن لینے کے بعد جب اُنھیں زیادہ یکسوئی ہوئی تو اُنھوں نے اِس خیال کو اپنی معرکتہ الآرا تصنیف تفسیر القرآن کے ذریعہ پورا کیا۔ اسلامی تعلیمات پر فلسفہ سے پیدا ہونے والے اعتراضات کے اُنھوں نے بڑی تحقیق سے جواب دئے۔ ہندو اور مسلمان دونوں ہی عام تعلیم نہ ہونے کے باعث عام مذہبی احکام اور شریعت کو آنکھ بند کر کے مانتے

آتے تھے۔ اُن احکام کی معقول تشریح وہ کیا کرتے۔ اُن کے دل میں شکوک ہی نہ پیدا ہوتے تھے، کیونکہ شکوک تو تعلیم اور تفتیش کی برکات ہیں۔ وہ لوگ بزرگوں کی تقلید میں ہی خوش تھے یہ مذہب محض ایک رسمی اور رواجی چیز ہو گئی تھی، گویا جسم سے جان نکل گئی ہو۔ یہی باعث ہے کہ ہندو اور مسلمان تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اپنے مذہب سے بے اعتقادی ہونے لگی تھی، انگریزی تعلیم کے ابتدائی دور میں کتنے ہی تعلیم یافتہ ہندو عیسائی ہو گئے۔ آخر راجہ رام موہن رائے کو ایک ایسے فرقہ کی بنیاد ڈالنی ضروری معلوم ہوئی جو کلیتہً فلسفیانہ دلائل پر قائم ہو، اور اُس میں وہ سب ہی آسانیاں اور آزادیاں حاصل ہوں جو لوگوں کو عیسائی ہو جانے پر آمادہ کرتی تھیں۔ اس نئے فرقہ کا نام برہم سماج رکھا گیا۔ برہم سماج میں سے ذات پات، چھوت چھات، تیرتھ اشنان، مورتی پوجا اور شرادھ اور وہ جملہ رسوم جن پر عیسائیوں کے اعتراضات ہوا کرتے تھے نکال دئے گئے، یہاں تک کہ عبادت کا طریقہ بھی تبدیل کر دیا گیا۔ اور اِس میں کوئی شک نہیں کہ اِس فرقہ نے ہندوؤں میں عیسائیت کے سیلاب کو بہت کچھ روک دیا۔ اِس کے بہت عرصہ بعد سوامی دیانند سرسوتی نے آریہ سماج کی بنیاد ڈالی جس نے مغربی ہند میں تقریباً وہی کام کیا جو برہم سماج نے مشرق میں کیا تھا۔ تفسیر القرآن بھی اِسی ارادہ سے لکھی گئی تا کہ نوجوان

مسلمانوں کے دل میں اسلام کی جانب سے جو شکوک پیدا ہوں اُن کی تشفّی کر دی جائے۔ مگر مسلم علما اِس کتاب کے شائع ہوتے ہی سیّد احمد خاں پر کفر کا فتوے لے کر دوڑے اُن پر دہریہ اور ملحق اور نیچریہ ہونے کا الزام لگایا۔ ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک آگ لگ گئی اور جوابی کتابوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ مصنّف پر طرح طرح کے بیجا اور بے معنی الزامات عائد کئے جانے لگے۔ بعضوں کا تو یہ بھی خیال ہوا کہ سیّد احمد خاں ولایت جا کر عیسائی ہو آئے ہیں اور اسلام کو تباہ کرنے کے لئے یہ کتاب لکھی ہے۔ بہت دنوں کے بعد یہ شور و غوغا فرو ہوا اور آج تفسیر القرآن متلاشیانِ حقیقت کے لئے مشعل کا کام کر رہی ہے۔

سیّد احمد خاں کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ مدرستہ العلوم علی گڈھ ہے جو اب مسلم یونیورسٹی کی صورت میں اُن کی لازوال یادگار ہے۔ مسلمانوں میں افلاس اور بے روزگاری کی بڑھتی ہوئی رفتار کو روکنے کے لئے اُنہیں مغربی تعلیم کی سخت ضرورت تھی۔ اور مدرستہ العلوم نے اِس ضرورت کو کما حقہٗ پورا کر دیا۔ مگر اُس وقت لوگ مغربی تعلیم سے ایسے بدظن ہو رہے تھے کہ اُنھیں خوف تھا مبادا ہمارا مذہب بھی ہاتھ سے جائے اور وہ کہیں کے نہ رہیں۔ مگر سر سیّد اپنے ارادہ میں مستقل تھے۔ اِس غرض سے اُنھوں نے ولایت کا سفر کیا تاکہ وہاں کی قدیم یونیورسٹیوں کے نظام کا مطالعہ کریں

اور اُسی نمونہ پر ہندوستان میں مدرستہ العلوم کی داغ بیل رکھی جائے۔ یکم اپریل ۱۸۶۹ء کو سرسید ولایت روانہ ہوگئے۔ لندن میں جس شان سے اُن کا استقبال کیا گیا اور اُن کی جتنی خاطر و تواضع کی گئی اُس نے سرسید کو ہمیشہ کے لئے انگریزوں سے متحد کر دیا۔ وہ تقریباً دو سال تک ولایت کے کالجوں کے انتظام کا مطالعہ کرنے کے بعد ہندوستان واپس آئے اور مدرستہ العلوم کے افتتاح کی تیاریاں کرنے لگے۔ اِس ارادہ کی تکمیل اور نیز مسلمانوں میں صحیح ادبی اور علمی مذاق پیدا کرنے کے لئے اُنھوں نے تہذیب الاخلاق نامی ایک ماہوار رسالہ جاری کیا۔ مگر طبقہ علما نے اِس رسالہ کی مخالفت شروع کی اور مدرسہ کی تحریک سے عوام میں بدگمانی پیدا کرنے لگے۔ شاید کچھ لوگوں کا خیال ہوا ہو کہ وہ انگلینڈ سے اپنا مذہب کھو کر آئے ہیں۔ لیکن سرسید نے ہمت نہ ہاری اور متواتر پانچ سال کی شبانہ روز سعی کے بعد ۱۸۷۵ء میں مدرستہ العلوم کا علی گڈھ میں افتتاح ہوا۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ مدرستہ العلوم کے قیام سے مسلمانوں کو جتنا فروغ ہوا وہ اور کسی طرح ممکن نہ تھا۔ آج مسلم یونیورسٹی مسلمانوں کی قومی یادگار ہے اور اِسکے طلبا ہندوستان کے ہر ایک گوشہ میں اِسکے علم بردار بنے ہوئے ہیں۔

سید احمد خاں محض اِن وجوہ سے ہندوؤں سے بدگمان ہوگئے تھے کہ ۱۸۶۷ء میں ہندوؤں کی جانب سے یہ کوشش ہوئی کہ اِس صوبہ

میں ناگری کو عدالتی زبان بنایا جائے بسید احمد خاں نے اسے ہندوؤں کی زیادتی سمجھی، حالانکہ یہ کوشش محض عوام کی آسانی کے خیال سے جاری ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کہ جس صوبہ میں ہندوؤں کی آبادی ۸۰ فیصدی سے زیادہ ہو اور اُس میں بیشتر لوگ دیہات کے رہنے والے اُردو سے ناآشنا ہوں وہاں اُردو کا عدالتی زبان ہونا صریح بے انصافی ہے اور تھوڑے سے اُردو داں اشخاص کے فائدے یا آرام کے لئے آبادی کے بہت بڑے حصّہ کو زیر بار کرنا کسی طرح قرین مصلحت نہیں۔ اور نہ اس تحریک کا منشا یہ تھا کہ اُردو ایک سرے سے فنا کر دی جائے لیکن سرسید کے دل میں یہ شبہہ جاگزیں ہوا کہ ہندو مسلمانوں کو زک دینا چاہتے ہیں۔ ممکن ہے بعض ایسے اسباب اور بھی پیدا ہو گئے ہوں جن سے اس خیال کو تقویت ہوئی ہو کہ ہندو مسلمانوں کا اتفاق اور اتحاد ممکن نہیں ہے۔ ان دونوں قوموں میں تاریخی اور مذہبی اختلافات پہلے ہی سے موجود تھے۔ مغل سلطنت کی تباہی اور انگریزی عملداری نے ان اختلافات کو مٹانا اور پرانے زخموں کو بھرنا شروع کیا تھا کہ یہ نئے اختلافات پیدا ہو گئے اور متحدہ قومیت کی منزل ایک عرصہ دراز کے لئے نظروں سے دور ہو گئی۔ مذہبی فرقوں کے اختلافات کا عملی عناد کی صورت میں منتقل ہو جانا کتنا آسان ہے۔ یہ ہم آئے دن آنکھوں سے

دیکھ رہے ہیں۔ آج ذرا ذرا سی فروعی باتوں پر آپس میں خونریزیاں ہوجاتی ہیں اور ملکی طاقت کا ایک بڑا حصہ باہمی ناچاقیوں کی نذر ہوجاتا ہے۔ ایسا کوئی سال نہیں جاتا کہ دو چار مقامات میں ہولناک شرو فساد نہ ہوجاتے ہوں۔ جائے افسوس ہے کہ اس زمانہ میں فریقین کی تنگ خیالیوں نے اس رواداری اور باہمی مصالحت میں رخنہ ڈال دیا جس کی بنیاد پر متحدہ قومیت کی عمارت کھڑی ہوسکتی ہے۔ ممکن ہے سرسیّد نے مسلمانوں کے لئے سابق حکمرانوں کی روداد کی حیثیت سے کسی قدر امتیاز ضروری سمجھا ہو مگر ہندو مساوی سے زیادہ کسی قسم کی رعایت کے لئے آمادہ نہ تھے۔ اگر سرسیّد نے اس وقت فراخدلی سے کام لیا ہوتا تو آج ہندوستان کی حالت کچھ اور ہوتی۔ لیکن اُنھوں نے وقتی اور قریبی فوائد کو دائمی اور قومی اغراض پر مرّجح سمجھا۔ موجودہ حکمرانوں سے اتحاد اُس سے کہیں زیادہ نفع بخش تھا جتنا محکوم ہندوؤں کے ساتھ۔ انگریزی گورنمنٹ کے ہاتھ میں اختیار تھا۔ مناصب تھے۔ ترقی کے غیر محدود ذرائع تھے۔ ہندوؤں کی دوستی میں بجز باہم مِل کر رونے کے اور کیا رکھا تھا۔ سرسیّد کے خیالات میں یہ تغیّر اُس وقت سے اور زیادہ نمایاں ہوگیا جب وہ ولایت گئے۔

وہاں انھوں نے جو کچھ دیکھا اس سے وہ اسی نتیجہ پر پہونچے کہ مسلمانوں کا مفاد انگریزوں سے موانست اور اتحاد میں ہے۔ اس طرح اس طرزِ عمل کی بنیاد پڑی جو روز افزوں خوفناک صورت اختیار کرتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اس نے باہمی ارتباط کو محال ہی نہیں کر دیا بلکہ ملک کی فضا کو مسموم کر دیا ہے۔ ملک دو مخالف حصّوں میں منقسم ہو گیا ہے اور اس کے تباہ کن اثرات کُشت و خون کی صورت میں ظاہر ہوتے رہتے ہیں اور ہر دو فریق ایک تیسرے فریق کا برسرِ اقتدار ہونا اپنے اپنے وجود اور بقا کے لئے ناگزیر سمجھتے ہیں۔ سرسید جیسے ذی اثر اور بیدار مغز بزرگ قوم نے اگر متحدہ قومیت کی حمایت کی ہوتی تو آج ہندوستان کہیں سے کہیں پہونچا ہوتا۔ نفاق کے جراثیم اس قدر سخت جان ہوتے ہیں کہ ایکبار تقویت پاکر پھر ناقابلِ ہلاک ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اُس وقت سے اب تک اتحاد کی جتنی کوششیں کی گئیں وہ سب ناکام ہوئیں اور اتحاد کی منزل اب بھی اتنی ہی دور ہے۔

سرسید فطرتاً مردم شناس تھے۔ اور جس شخص سے انھیں ایکبار حسنِ ظن ہو جاتا پھر اس کے خلاف کوئی شکایت نہ سنتے تھے۔ اُن کی محنت کا یہ حال تھا کہ وہ تنہا جتنا دماغی کام کر سکتے تھے اُتنا کئی

آدمی مل کر بھی نہ کر سکتے تھے۔ بہت ہی زندہ دل، بامروت، فیاض طبع اور خوش بیان بزرگ تھے۔ اُن کی تقریر میں جادو تھا۔ سامعین محوِ حیرت ہو جاتے تھے۔ اُن کا قول تھا کہ کسی بڑے کام کی تکمیل کے لئے علمی لیاقت کی اتنی ضرورت نہیں ہے جتنی تجربہ اور موقع شناسی کی۔ مخالفین ہی اُن کے سامنے جاکر معاون بن جاتے تھے۔ اُن کی ذہانت سے متاثر نہ ہو جانا غیر ممکن تھا۔

سرسید نے اُردو زبان کی جتنی خدمت کی اُس کی تعریف کن الفاظ میں کی جائے۔ یوں کہو کہ اُردو نے اُن کے دامن میں پرورش پائی۔ اُس وقت تک اُردو میں شاعری کا بازار گرم تھا۔ ادبیت اور شعر گوئی شعرا کے تذکروں تک محدود تھی۔ اِس میں نہ گہرائی تھی نہ بلندی۔ دقیق مسائل اور سنجیدہ مطالب کے ادا کرنے کی صلاحیت نہ تھی۔ تاریخی، تنقیدی، اور علمی موضوعات پر اُسے اقتدار نہ تھا۔ سرسید نے اِن موضوعات پر تہذیب اخلاق میں جو مضامین لکھے وہ اُردو زبان کے کلاسک ہیں۔ اُن کے ایک ایک لفظ سے دقیق مطالعہ، وسیع تجربہ، فطرت انسانی کے غائر مشاہدہ اور علمی مسائل کی عالمانہ تحقیق ٹپک رہی ہے بیان میں اتنی سلاست ہے کہ تھوڑی استعداد کا آدمی بھی بے تکلف سمجھ سکتا ہے۔

نہ پیچیدہ ترکیبیں ہیں، نہ اُلجھے ہوئے جملے، نہ مشکل الفاظ۔ مشکل سے مشکل مطالب کو وہ اِتنی بے ساختگی سے ادا کرتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ اگرچہ یہ مضامین سب کے سب طبع زاد نہیں ہیں، بیکن اور اَڈیسن اور بعض دیگر ادیبوں کے خیالات کا چربہ لیا گیا ہے، مگر اندازِ بیان اُن کا اپنا ہے اور اِس انداز نے مضامین میں جدّت پیدا کر دی ہے۔ اُن کی ادبی اور قومی خدمات کے صلہ میں گورنمنٹ نے اُنھیں سَر کا خطاب عطا کر کے قدر دانی کا ثبوت دیا۔

عمر کے آخری ایّام میں سرسیّد مسلسل بیماریوں سے بہت نقیہہ ہو گئے تھے۔ مگر اُس وقت بھی یہ فنا فی القوم بزرگ خدمتِ قوم میں ہی منہمک تھا۔ آخر ۱۸۹۸ء کی ۲۷ر مارچ کو پیامِ اجل آپہنچا اور اُس نے اپنی زندگی کی لازوال یادگاریں چھوڑ کر عالمِ فانی سے رحلت کی۔

# بدرالدین طیّب جی

ہندوستان میں مسلمانوں کی یورش دو مختلف راستوں سے ہوئی۔ ایک تو بلوچستان اور سندھ سے۔ دوسرے شمال مغرب کے کوہستانی راستوں سے۔ سندھ کی طرف سے جو مسلمان آئے وہ عربی نسل کے تھے اور تجارت کرنے آئے تھے۔ شمال مغرب سے جو لوگ آئے وہ افغانی نسل کے تھے اور فاتحانہ ہیموں میں آئے تھے۔ چنانچہ بمبئی صوبہ میں زیادہ تر عربی نسل کے مسلمان آباد ہوئے جنھیں تاجرانہ تعلقات کے باعث اہلِ ہند کے مساوات کا تعلّق پیدا کرنے میں کوئی امر مانع نہ تھا۔ افغانی چونکہ فاتح تھے، وہ اہلِ ہند سے زیادہ خلط ملط روا نہ رکھتے تھے۔ بدرالدین طیّب جی بھی ایک معزز عرب خاندان کی یادگار تھے جو ایک عرصہ دراز سے بمبئی میں آباد تھا۔ اُن کے اجداد تجارت کے سلسلہ میں ہندوستان آئے تھے اور بدرالدین کے والد طیّب جی بھائی میاں ایک کامیاب تاجر تھے۔ حالانکہ وہ مذہب کے پابند تھے اور اُس زمانہ میں بوہروں میں انگریزی تعلیم کو کفر خیال کیا جاتا تھا مگر طیّب جی نے اِن مہمل قیود کی پروانہ کرکے اپنے

ہونہار لڑکے کو انگریزی تعلیم سے محروم رکھنا مناسب نہ سمجھا جو اُن کی دوراندیشی اور آزاد خیالی کا ثبوت ہے ۔ بدرالدین کی ابتدائی فارسی اور عربی تعلیم تو عربی مدرسہ میں ہوئی مگر جونہی اُنھیں اِن زبانوں میں کچھ استعداد ہو گئی وہ الفنسٹن کالج میں داخل کر دئے گئے اور ۱۶ سال کی عمر میں تکمیل تعلیم کے لئے انگلینڈ بھیجدئے گئے جہاں سے وہ ۱۸۶۷ء میں بیرسٹر ہو کر ہندوستان واپس آئے ۔ حالانکہ اُن کی صحت نازک تھی اور بصارت میں بھی فرق آگیا تھا مگر انھوں نے مردانہ استقلال سے تعلیم جاری رکھی اور بالآخر کامیاب ہوئے ہندوستان آکر انھوں نے بمبئی ہائی کورٹ میں وکالت شروع کی ۔

وکالت کا ابتدائی زمانہ اُس وقت بھی جفاکشی کا زمانہ تھا اور بدرالدین کو اپنے پیشہ میں فروغ پانے کے لئے اور بالخصوص بمبئی میں جہاں بڑے بڑے نامور وکلا پہلے ہی سے اپنا سکہ جمائے ہوئے تھے آسان کام نہ تھا ۔ مگر دس سال کی مختصر مدت میں ہی آپ نامور وکیلوں کے زمرہ میں داخل ہو گئے ۔ اِس کے ساتھ ہی آپ ملک کے اہم سیاسی اور اقتصادی مسائل کا مطالعہ بھی کرتے رہتے جو ہر ایک تعلیم یافتہ انسان کا فرض ہے جو اپنی قوم سے کچھ ہمدردی رکھتا ہو اور اُس کی بہتری کا خواہاں ہو ۔ آپ فصیح و بلیغ اور شیریں زبان مقرر بھی تھے سیاسی جلسوں میں آپ نے کئی معرکہ کی تقریریں کیں جن سے آپ ایک مقرر کی حیثیت

سے بھی مشہور ہو گئے۔ آپ کو تقریر کرنے کا موقعہ ۱۸۷۹ء میں ملا جب مانچسٹر سے آنے والے مال کی چنگی اُٹھائی گئی اور اُس سے ناراضگی کا اظہار کرنے کے لئے بمبئی میں ذمہ دار اصحاب نے ایک عام جلسہ کیا۔ چونکہ بمبئی میں کپڑے کی قیمت ابھی عالم طفولیت میں تھی اور مانچسٹر ولنکاشائر سے آنے والے مال کا مقابلہ نہ کر سکتی تھی اس لئے گورنمنٹ نے شروع میں اُس مال پر چنگی لگا دی تھی تاکہ اُسکا نرخ گراں ہو جائے اور بمبئی کے مال کی کھپت ہو۔ مگر ولایت کے تجار اس چنگی کی برابر مخالفت کرتے رہتے تھے اُن کے خیال میں بمبئی کی پارچہ بافی اب اس درجہ بالغ ہو چکی تھی کہ اُسے گورنمنٹ کی جانب سے کسی قسم کی امداد کی ضرورت نہ تھی۔ آخر ۱۸۷۹ء میں گورنمنٹ نے یہ چنگی اُٹھا دی۔ اس موقعہ پر مسٹر بدرالدین نے ایسی جامع مدلل اور بصیرت خیز تقریر کی کہ اہل نظر سمجھ گئے کہ ہندوستان کے سیاسی آسمان میں ایک نئے ستارہ کا ظہور ہوا۔

وہ زمانہ ہندوستان کی سیاست میں یادگار رہے گا۔ اُس وقت لارڈ رپن ہندوستان کے وائسرائے تھے جن سے زیادہ پاک طینت جزورس، ہمدرد اور منصف مزاج وائسرائے ہندوستان میں نہیں آیا۔ اُن کا قول تھا کہ بڑی بڑی سلطنتیں اپنے عساکر اور سامانِ حرب کی طاقت سے نہیں زندہ رہتیں بلکہ اپنے قوانین کی راستبازی اور آئین انصاف

کی طاقت سے۔ اُس وقت تک ہندوستان میں خود اختیاری نظام کا
وجود نہ تھا۔ یعنی میونسپل اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کا ظہور نہ ہوا تھا۔
ضلع کا وہ انتظام بھی جو اب ڈسٹرکٹ بورڈوں سے متعلق ہے
حاکم ضلع ہی انجام دیا کرتا تھا۔ وہی اپنے دیگر فرائض منصبی کے
ساتھ شہر کی صفائی، روشنی، سڑکوں کی مرمّت اور تعلیم وغیرہ کا ذمہ دار
ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ حاکم ضلع اِن فرائض کو تندہی سے انجام [illegible]
سکتا تھا کیونکہ اُسے اور بھی متعدّد فرائض انجام دینے [illegible]
لارڈ رپن نے لوکل سلف گورنمنٹ (یعنی مقامی [illegible]
نافذ کیا جس کے مطابق شہر اور ضلع کی انتظا[illegible]
لارڈ ممدوح کا منشا اِس قانون سے یہ تھا کہ اہل [illegible]
معاملات میں اختیارات عطا کرکے اُنھیں اِس قابل [illegible]
اور ملک کا انتظام بھی کر سکیں۔ اب تو یہ مقامی بورڈ [illegible]
آزاد ہیں [illegible] اپنی آمدنی اور خرچ کا پورا [illegible]
کے [illegible] کا انتخاب کرتی ہے۔ [illegible]
کے فیصلے سے ہوتا ہے۔ صدر کا انتخاب [illegible]
گورنمنٹ اِن بورڈوں کے طرزِ عمل کی نگرانی کرتی ہے [illegible]
کے لئے ہمیں لارڈ رپن کا مشکور ہونا چاہئے۔ حالانکہ اب بھی مقامی

بورڈوں پر کبھی کبھی سرکاری عتاب نازل ہو جاتا ہے مگر معمولی طور پر گورنمنٹ ان کے کاموں میں مداخلت نہیں کرتی۔

لارڈ رپن ہی کے زمانہ میں البرٹ بل بھی پاس ہوا۔ اس قانون کے مطابق ہندوستانی افسروں کو انگریزوں کو سزا دینے کا اختیار دیا گیا تھا۔ اس وقت تک ہندوستانی حکّام کو یہ مجاز نہ تھا۔ انگلینڈ میں ایک قانون ہے جس کے مطابق انگریز کو انگریزی پنچایت ہی سزا دے سکتی ہے۔ [illegible] ہندوستان میں انگریزوں کی اچھی خاصی آبادی ہے۔ [illegible] کتنا ہی بڑا جرم کرے کوئی ہندوستانی حاکم اس کے مقدمہ [illegible] جب کوئی انگریز کسی جرم میں ماخوذ ہوتا تھا تو انگریزوں کی ایک پنچایت اس کے مقدمہ کی سماعت کے لئے مقرر کی جاتی تھی۔ اور بسا اوقات جب ان مقدمات میں کوئی فریق ہندوستانی ہوتا تھا تو وہ انگریز پنچایت انگریز مجرم کی جانب داری [illegible] اور ہندوستانیوں کے ساتھ اکثر بے انصافی ہو جاتی تھی۔ [illegible] یہ ایک [illegible] ہندوستانی اپنی توہین سمجھتے تھے۔ [illegible] جب ہم ایک ملک کے باشندے اور ایک حکومت کی رعایا ہیں تو سب کے لئے ایک قانون ہونا چاہئے۔ ان [illegible] قسم کی تفریق مناسب نہیں۔ لارڈ رپن [illegible] کو حق بجانب [illegible] تھا اور ان کے

ایما سے کائونسل کے ایک ممبر سر کورٹنی البرٹ نے یہ مسودہ قانون پیش کیا اور گورنمنٹ نے اُسے منظور کر لیا۔ لیکن انگریزوں کو یہ کب گوارا ہو سکتا تھا کہ وہ اپنے خاص حقوق سے دست بردار ہو جائیں۔ وہ اپنے تئیں اس ملک کا حاکم سمجھتے تھے اور اہل ہند کو ذلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اُنکا دعویٰ تھا کہ ہم تہذیب میں، نسل میں، رنگ میں ہندوستان کے باشندوں پر فضیلت رکھتے ہیں، اور ان کے حاکم ہیں۔ لارڈ رپن کے خلاف اُنھوں نے زبردست شورش کی۔ انگریزی اخباروں میں اختلافی مضامین نکلنے لگے۔ تقریروں میں لارڈ رپن پر حملے کئے جانے لگے۔ سرکاری جلسوں اور دعوتوں میں شرکت کرنا بھی انگریزوں نے ترک کر دیا۔ یہاں تک کہ کچھ لوگوں نے ایک ایسی سازش کی کہ لارڈ رپن کو زبردستی گرفتار کر کے جہاز پر سوار کرا کے لندن روانہ کر دیا جاوے۔ بالآخر لارڈ رپن کو مجبور ہو کر اس قانون میں ترمیم کرنا پڑی جس سے اِس قانون کا منشا قریب قریب فوت ہو گیا۔

مسٹر بدرالدین نے اُس زمانہ کے سیاسی مشاغل میں عملی حصّہ لیا اور متعدّد تقریریں کیں۔ ایسا شاید ہی کوئی جلسہ ہوتا تھا کہ وہ اُس میں تقریر نہ کرتے ہوں اور ان کی تقریریں ہمیشہ پاکیزہ صائب اور منصفانہ ہوتی تھیں۔ ۱۸۸۱ء میں سر جیمس فرگوسن نے جو اُس وقت بمبئی کے

گورنر تھے آپ کو بمبئی لیجسلیٹو کاؤنسل کا ممبر نامزد کرایا اور آپ کی قومی خدمات کا دائرہ اور بھی وسیع ہو گیا۔

۱۸۸۵ء میں ہندوستان میں انڈین نیشنل کانگریس کا ظہور ہوا۔ یہ تعلیم یافتہ اور متوسط طبقہ اشخاص کی سیاسی انجمن تھی جس کا مقصد سیاسی حقوق اور اختیارات کا مطالبہ تھا۔ بدرالدین اس انجمن کے سرگرم رکن تھے اور ۱۸۸۷ء میں وہ مدراس کے اجلاس کے صدر منتخب ہوئے۔ اس موقع پر انھوں نے جو صدارتی تقریر کی اُس کے وسعت معلومات اور زور بیان اور بیخوف صاف گوئی نے سامعین کو حیرت میں ڈال دیا۔ مسٹر بدرالدین صرف باتوں کے آدمی نہ تھے وہ عملی کاموں میں بھی اُتنی ہی سرگرمی سے حصّہ لیتے تھے۔

۱۸۷۵ء میں سر سیّد احمد نے علی گڈھ کالج کی بنیاد ڈال دی تھی مگر مسلمانوں میں عام طور پر اُس وقت جدید علوم کی جانب سے بے التفاتی تھی۔ مسٹر بدرالدین نے فراخدلی سے کالج کی مالی امداد کی اور ہر ممکن ذریعہ سے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی میں سرگرم کار رہے۔ انڈین نیشنل کانگریس میں مسلمانوں کی شرکت کے متعلق آپ میں اور سر سیّد احمد میں اختلاف تھا۔ سر سیّد کا خیال تھا کہ مسلمانوں کا کانگریس میں شریک ہونا قرین مصلحت نہیں ہے

کیونکہ مسلمان تعلیمی ترقی میں ہندوؤں سے پیچھے ہیں اور کانگریس
جن اصولوں کی حمایت کرتی ہے اُن کے اعتبار سے مسلمانوں کو ہندوؤں
کے مقابلہ میں نقصان پہونچنے کا احتمال تھا۔ مسٹر بدرالدین طیب جی
سر سید احمد خاں کے ان اصول اور خیالات کے قطعاً خلاف تھے۔
اُن کا خیال تھا کہ ہندوستانیوں کو متحدہ طور سے گورنمنٹ کے سامنے
اپنے مطالبات پیش کرنا چاہیئے۔ غرض ان اختلافات کے باوجود
بھی مسٹر بدرالدین ہمیشہ علی گڑھ کالج کی اعانت کرتے رہے۔
سنہ ۱۹۰۳ء میں جب مسلمانوں کی تعلیمی کانفرنس علی گڑھ میں منعقد
ہوئی تو مسٹر بدرالدین اُس کے صدر منتخب کئے گئے۔ اُس جلسہ میں
نواب محسن الملک مرحوم اور لارڈ ولینگٹن گورنر بمبئی بھی تشریف
رکھتے تھے۔ حالانکہ مسٹر بدرالدین اُس وقت بمبئی ہائی کورٹ کے جج اور
ملازم سرکار تھے، مگر آپ نے خطبۂ صدارت میں انھوں نے کمال صاف گوئی
اور بے خوفی سے اپنے سیاسی عقائد کا اظہار کیا اور مسلمانوں کو مشورہ دیا
کہ اگر وہ اپنی اور اپنے ملک کی بہتری چاہتے ہیں تو انھیں کانگریس
میں شریک ہو کر اُن کا اثر اور وقار بڑھانا چاہیئے۔ اس تقریر میں ممدوح
نے تعلیم نسواں کے متعلق بھی زبردست اپیل کی۔ ممدوح کی قطعی
رائے تھی کہ جب تک ہندوستان میں مردوں کے ساتھ عورتوں کی تعلیم

نہ ہوگی ملک ترقی کے زینہ پر نہ چڑھ سکے گا۔ انھوں نے خود اپنی صاحبزادیوں کو اعلیٰ درجہ کی انگریزی تعلیم دلوائی تھی۔ حالانکہ مسلمانوں میں اس وقت تک یہ ایک نہایت غیر معمولی جرأت کا کام تھا۔

مسٹر بدرالدین پردہ کے بھی مخالف تھے۔ اور اپنے گھر کی مستورات کو پردہ کی قید سے آزاد کر دیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ پردہ سے جسمانی اور ذہنی زوال پیدا ہوتا ہے۔ آج تعلیم یافتہ مسلمانوں میں پردہ کے قیود اتنے سخت نہیں ہیں اور لاہور، دہلی وغیرہ شہروں میں شریف زادیاں برقعہ اوڑھ کر بے تکلف نکلتی ہیں لیکن اس وقت مستورات کا باہر نکلنا آنا جانا [illegible] سمجھا جاتا تھا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ مسٹر بدرالدین کتنے دور اندیش اور زمانہ شناس بزرگ تھے۔

ہندوستان میں اس وقت بھی تعلیم یافتہ طبقہ میں انگریزی وضع کا رواج ہو چلا تھا اور آج تو یہ رواج اسقدر عام ہے کہ کسی کالج یا دفتر میں چلے جائیے آپ کو ایک سرے سے انگریزی وضع کے لوگ ہی نظر آئیں گے۔ ان کی گفتگو بھی بیشتر انگریزی ہی میں ہوتی ہے۔ انہیں نہ قومی زبان سے کوئی خاص الفت ہے نہ قومی لباس سے، نہ قومی آداب سے، وہ قومی آداب و اطوار کی مخالفت ہی میں اپنی مصلحانہ سرگرمی کا اظہار کرتے ہیں۔ غالباً ان کا نفس اس خیال سے

خوش ہوتا ہے کہ وہ بھی کم سے کم وضع اور قطع میں تو انگریزوں کے ہمسر ہیں۔ قومی وضع اُن کے خیال میں استخواں پرستی کی دلیل ہے مگر جسٹس بدرالدین نے ہائی کورٹ کی ججی کے اعلیٰ منصب پر فائز ہونے اور اعلیٰ درجہ کی انگریزی استعداد رکھنے پر بھی وضع تبدیل نہیں کی۔ عدالت کی کرسی پر ہوں یا مجلس احباب میں، وہی قدیم عربی لباس اُن کے زیب جسم ہوتا تھا۔

جسٹس بدرالدین حد درجہ کے خوددار واقع ہوئے تھے۔ اپنے فرائض کی بجا آوری میں وہ ہمیشہ نہایت اونچا معیار پیش نظر رکھتے تھے۔ حکام پروری کے خیال یا افسروں کے ناراضگی کے خوف سے وہ کبھی اپنے ضمیر کا خون نہ کرتے تھے۔ نیشنل کانگریس کے مشہور لیڈر رآنجہانی پنڈت بال گنگادھر تلک پر جب سرکار نے بغاوت کا مقدمہ چلایا اور وہ سیشن سپرد ہوئے تو مسٹر تلک کے وکلا نے انہیں ضمانت پر رہا کرانے کی درخواست کی۔ وہ درخواست جسٹس بدرالدین کے اجلاس میں پیش ہوئی۔ حکّام مسٹر تلک سے بدظن تھے اور اس مجرم سرکار کی ضمانت منظور کرنا یقیناً گورنمنٹ کی ناراضگی کا باعث تھا۔ مسٹر تلک کے پیروکاروں کو بھی اُمید نہ تھی کہ اُن کی ضمانت منظور ہوگی جسٹس بدرالدین کے لئے یہ سخت آزمائش کا موقع تھا۔ مگر آپ انصاف کی کرسی پر جلوہ افروز تھے اور آئین انصاف سے، جو پھر بھی منحرف ہونا آپ کو

گوارا نہ تھا۔ آپ نے ضمانت منظور کرلی۔ سارے ملک میں آپ کی حق پرستی اور انصاف پروری کا شہرہ ہوگیا۔

جسٹس بدرالدین میں قومی خودداری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اپنے مذہب یا قوم کی جائز نکتہ چینی سننے میں تو آپ کو اعتراض نہ تھا لیکن اس کی توہین اُن کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ قاضی کبیرالدین صاحب نے آپ کی سوانح زندگی کے سلسلہ میں ایک روایت نقل کی ہے جو جسٹس ممدوح کے جذبۂ قومیت کو روشن کرتی ہے۔

ایک مرتبہ مسئلہ وقف کے مقدمہ میں بمبئی کے ایک ایڈوکیٹ جنرل نے عدالت میں کہا کہ اس مسئلہ پر محمڈن لا میں غالباً کوئی فیصلہ نہیں ہے۔ جسٹس بدرالدین اس کی برداشت نہ کرسکے اور بولے مسٹر ایڈوکیٹ جنرل یہ کہنے کی جرأت کرنا کہ اس مسئلہ پر جامع اور ہمہ گیر محمڈن لا میں کوئی فیصلہ نہیں ہے اس محترم قانون کی اہانت کرنا ہے، اس پر ایڈوکیٹ جنرل نے فوراً معذرت کی اور کہا کہ محمڈن لا میں فیصلہ نہ ہونے سے میرا مطلب صرف یہ تھا کہ میری دسترس وہاں تک نہیں ہے یعنی اسکا انگریزی میں ترجمہ نہیں ہوا ہے۔

ایک دوسرے موقعہ پر ایک انگریز بیرسٹر نے کسی مقدمہ میں چند یوروپین گواہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ یہ گواہ بہ سبب یوروپین ہونے کے

زیادہ قابل اعتبار ہیں بہ نسبت اور گواہوں کے جو معزز تاجر ہیں مگر ہندوستانی ہیں؟" جسٹس بدرالدین نے فوراً اُن یورو پین بیرسٹر صاحب کی زبان پکڑی اور فرمایا "کیا آپ خیال کرتے ہیں کہ ہر ایک انگریز ہر ایک ہندوستانی سے فطرتاً زیادہ راستباز ور معتبر ہوتا ہے۔ یہ دعوے کرنا اِس عدالت کی توہین کرنا ہے" بیرسٹر صاحب سخت نادم ہوئے۔

اُس وقت کی انڈین نیشنل کانگریس کے آپ ہمیشہ مداح اور معاون رہے۔ ایکبار کسی بیرسٹر نے کانگریس کے متعلق چند نازیبا کلمات کہے۔ جسٹس بدرالدین نے اُس سے تو کچھ نہ کہا مگر اُس مقدمہ کا فیصلہ لکھتے ہوئے اُنھوں نے کانگریس کے متعلق اپنے حسن ظن کا اعادہ کیا اور لکھا "کانگریس وہ مقتدر جماعت ہے جو قوم کی ضروریات اور مطالبات کی بوجوہ احسن سرکار سے نیابت کرتی ہے۔ مجھے فخر ہے کہ میں اِس جماعت کا صدر رہ چکا ہوں۔

ہندوستانیوں کی سہل انکاری مشہور ہے۔ وقت کی پابندی ایک ایسا وصف ہے جس سے ہم بالعموم عاری ہیں کسی جلسہ یا جماعت میں جائیے۔ وہ اپنے مقررہ وقت سے گھنٹے آدہ گھنٹہ بعد ضرور ہوگی۔ ریل کے سفروں کو لیجیے۔ یا تو ہم دو ڈھائی گھنٹہ قبل اسٹیشن پر پہونچ جاتے ہیں، یا ایسے تنگ وقت میں کہ دوڑ کر گاڑی میں سوار ہونا پڑتا ہے۔



مولانا عبدالحلیم شرر

جسٹس بدرالدین خصوصیت کے ساتھ اوقات کی پابندی کرتے تھے۔ وہ تھوڑی سی جسمانی ورزش ہمیشہ کرتے تھے۔ کتنا ہی ضروری کام درپیش ہو۔ مگر اس معمول میں فرق نہ آتا تھا۔ ہاں ناسازی کی حالت میں مجبوری تھی۔ بلکہ جس روز کاموں کی زیادہ کثرت ہوتی تھی۔ اس دن وہ معمول سے کچھ پہلے ہی ورزش شروع کردیتے تھے۔ شام کو ان کا روزانہ معمول تھا کہ وہ ہائی کورٹ سے نکلکر کوئنس روڈ کے آخری سرے تک پاپیادہ جاتے تھے۔ اور اس معمول میں کبھی انھوں نے کبھی ناغہ نہیں کیا۔ ایسی باقاعدہ اور ہموار زندگی کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔

آپ نے ۱۱ اگست ۱۹۰۶ء کو وفات پائی۔ اور مادر ہند کے ایسے باعزت فرزند کی یادگار چھوڑی جس پر وہ ہمیشہ ناز کرے گی۔

# مولانا عبدالحلیم شرر

مولانا عبدالحلیم شرر کے والد حکیم تفضل حسین صاحب نیک نفس، پابند صوم وصلوٰۃ، حنفی مذہب، صوفی مشرب، متوسط قدوقامت، گورا رنگ، چیچک رو، کتابی چہرہ، لاغر اندام، ریش مبارک یکمشت دو انگل کر نیچی آنکھیں، لکھنؤ جھوائی ٹولہ میں رہتے تھے۔ نسبتاً شیخ ہاشمی عباسی تھے۔

اسی مکان میں مولانا شرر یوم جمعہ صبح ۶ بجے ۱۷- جمادی الثانی ۱۲۷۵ھ غدر کے دو برس بعد پیدا ہوئے۔

حکیم تفضّل حسین ایک متوسط الحال آدمی تھے اور زمرۂ منشیان شاہی میں ملازم تھے۔ تاہم لڑکے کی تربیت اور سرپرستی میں بہت کوشش کی۔ چھ برس کی عمر سے مولانا کا تعلیمی سلسلہ شروع ہوا۔ سال بھر تک والدہ کے پاس پڑھتے رہے اور قرآن کا ایک پارہ بھی ختم نہ ہوا۔

مولانا بچپنے میں نہایت شریر تھے چنانچہ اُن کی والدہ نے ایک مرتبہ کسی بات پر خفا ہو کر مارا تو اُنھوں نے غصّے میں اُن کی اُونگلی چبالی۔ جب مولانا آٹھ برس کے ہوئے تو اُن کے والد کلکتہ میں منشی السلطان کے دفتر میں منشیوں میں ملازم ہو کر کلکتہ جانے لگے اور مولانا شرر کو بھی اپنے ہمراہ لیتے گئے اور وہیں اُن کی تعلیم ہونے لگی۔ پہلے حافظ الٰہی بخش سے سال بھر میں قرآن ختم کیا۔ دو برس میں ماتیہ عامل گلستاں بوستاں تک استعداد حاصل کی۔ مُلّا باقر سے ہدایتہ النحو کافیہ مُلّا جامی ختم کی۔ منشی عبداللطیف سے شرح وقایہ اور خوشنویسی سیکھی۔ مولانا طباطبائی سے بھی کچھ عربی کی کتابیں نکالیں۔ حکیم مسیح سے طب حاصل کی اور پندرہ برس کی عمر میں شاہی منشیوں میں اپنے والد کی جگہ پر ملازم ہو گئے۔ اُن کے والد لکھنؤ چلے آئے۔ اُس وقت مولانا کی صحبت شاہی خاندان کی ذریات کے ساتھ تھی

اور تاثیر صحبت نے کچھ رنگ بدلا تو مولانا کے والد نے ان کو لکھنؤ بلوا لیا۔ یہاں آ کر مولوی عبدالباری شاگرد مولانا عبدالحئی سے معقول کی کتابیں پڑھیں اور مولانا عبدالحئی سے بھی کچھ درس حاصل کیا لکھنؤ سے دہلی گئے مولانا نذیر حسین صاحب سے حدیث کی کتابیں پڑھیں اور وہاں عبدالوہاب نجدی کے رسالہ توحید کا ترجمہ کیا۔ دہلی سے خاصے غیر مقلد ہو کر لکھنؤ آ گئے۔ یہاں آپ کے والد نے حکیم سعدالدین کی صاحبزادی سے نسبت طے کر لی تھی لکھنؤ میں آتے ہی شادی ہو گئی۔ اب مولانا اودھ اخبار میں تیس روپیہ ماہوار کے ملازم ہو گئے۔ کچھ انگریزی بھی حاصل کر لی تھی اور شاعری کا بھی شوق دامنگیر ہوا۔ اُس زمانے میں منشی امیر احمد مینائی کی شاعری کا بہت شہرہ تھا۔ اُنہی کے شاگرد ہوئے اور شرر تخلص رکھا۔

اودھ اخبار میں شرر کے مضامین نے ایک ہلچل ڈال دی۔ لوگ بہت شوق سے دیکھتے تھے۔ اودھ اخبار کی ملازمت کے زمرہ میں کئی دفعہ حیدرآباد جانے کا اتفاق ہوا اور نواب وقارالامرا تک رسائی ہو گئی۔ مولانا کے والد بھی اُسی زمانے میں حیدرآباد میں ملازم تھے اور آخر عمر میں پنشن لے لی تھی۔ مولانا باوجود اس کے کہ اودھ اخبار میں ملازم تھے اور مضامین لکھا کرتے تھے، تاہم آپ کو دوست احباب کی صحبت میں بیٹھنے کا وقت مل جاتا تھا۔ ان کے ایک دوست مولوی عبدالباسط کرسی کے رہنے والے تھا مینا

وفادار، غیور اور رجوری الکڑی کے فن میں استاد تھے ان کے نام سے رسالہ محشر جاری کیا اور اسکا دفتر چوک بنازہ میں قائم کیا وہیں مولوی صاحب کی نشست بھی ہونے لگی۔ مولوی ہدایت رسول ان کے ہم محلہ اور دوست تھے۔ اکثر وہ بھی ساتھ رہتے تھے۔ لالہ روشن لال ایک کھتری تھے جو مسلمان ہو گئے تھے۔ وہ بھی اسی گدڑے کے یار تھے۔ مولوی معصوم علی بھی اسی زمرہ میں تھے مگر اپنی تہذیب اور مولویت کے زعم میں بے تکلف جلسے میں شریک نہ ہوتے تھے۔ محشر کی بہت کچھ شہرت ہوئی لیکن ان کی [illegible] مزاجی سے وہ بھی بند ہو گیا۔

شادی کے دو برس کے بعد ان کو فکر ہوئی کہ کوئی مستقل ذریعہ معاش پیدا کیا جائے اور [illegible] مستقل رسالہ دلگداز جاری کیا اس میں ایک حصہ خیالی مضامین کا ہوتا تھا اور دوسرا حصہ ناول کا۔ پہلا ناول آپ کا [illegible]۔ اس زمانے میں ناول لکھنے والے ایک مولوی صاحب تھے دوسرے پنڈت سرشار کشمیری۔ سرشار نے اپنا رنگ رندانہ اختیار کیا۔ ان کی [illegible] فسانہ عام لوگوں میں دلچسپی سے دیکھا [illegible] داستان امیر حمزہ کے خیالات کا اندازہ کر کے آزاد [illegible] رفتہ مزاج رند اور عاشق [illegible] چالاک قرار دیا اور بدیع الزمان افیونی کو [illegible] کا جامہ پہنایا اور ان پر بے غیرتی کا خاتمہ کر دیا۔ یہ رنگ ایسا مقبول ہوا کہ اس زمانے [illegible]

سوسائٹی نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔

مولانا نے دیکھا کہ اس رنگ کے سامنے کوئی نیا رنگ جمانا مشکل ہے۔ انھوں نے رندانہ خیال کو سرشار کے سپرد کر دیا اور اپنے واسطے ایک نیا راستہ پیدا کیا۔ اسلام عرب کے تاریخی واقعات لیکر مسلمانوں کی تہذیب۔ علو ہمتی۔ دینداری۔ فیاضی۔ علمی مشاغل۔ وضعداریوں کو انگریزی طرز عبارت میں لکھنا شروع کیا۔

دلچسپ کو دلکشی کا لباس پہنایا۔ ملک العزیز ناول اسقدر مقبول ہوا کہ عام اور خاص رند اور مولوی سب نے مطالعہ کیا اور گہری دلچسپی سے دیکھا۔ منصور موہنہ کو لوگوں نے آنکھوں پر جگہ دی۔ درگیش نندنی۔ حسن انجلینا بہت مقبول ہوا۔ ہندوستان کا کوئی مسلمان ایسا نہ تھا جس نے مولانا کے ناول کا مطالعہ نہ کیا ہو۔ یہاں تک کہ بعض علما جن کو ناول کے نام سے نفرت تھی مولانا کی تصنیف کا دیکھنا باعث حسنات جانتے تھے۔ اس کے علاوہ تہذیب اور متانت اتنی تھی کہ تمام ہندو مسلمان سوسائٹی میں ان کا طرز تحریر [illegible] اور تمام مہذب لوگوں نے اسے اپنے کتب خانوں [illegible] ان کے اقتباسات درسی کتب میں داخل ہونے لگے۔

دلگداز [illegible] بھی نہ نکلنے پایا تھا کہ مولانا کو نواب [illegible] طلب فرماکر اپنے صاحبزادوں کے ہمراہ انگلستان روانہ کیا۔

ڈیڑھ برس کے بعد مولانا اس سفر سے واپس آئے تو کچھ دنوں کے بعد نواب وقارالأمرا معزول ہو گئے اور مہاراجہ کشن پرشاد وزیر ہوئے۔ ناچار مولانا پھر لکھنؤ تشریف لائے اور دلگداز پھر جاری ہوا۔ اس کے علاوہ بھی مولانا نے چند ناول تصنیف کر کے اڈیٹر پیام یار کو بمعاوضہ معقول دئے۔

لوگ کہتے ہیں ابتدا میں مولانا نے مختلف اخبارات میں بمعاوضہ کام کیا اور روزانہ اخبار میں جو انوار محمدی پریس سے منشی محمد تیغ بہادر کے اہتمام سے نکلتا تھا کچھ مضامین لکھے۔ صحیفہ نامی اخبار جو مطبع نامی لکھنؤ سے نکلتا تھا اس میں بھی کچھ کام کیا۔

پہلی بی بی سے مولانا کے دو لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔ بڑے لڑکے محمد صدیق حسن کی تعلیم انٹرنس تک ہوئی۔ چھوٹے صاحبزادہ مولوی محمد فاروق اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے اور مولانا کے دفتر کا کام بخوبی انجام دیتے تھے لیکن اٹھارہ برس کی عمر میں بیمار ہو کر انتقال کیا۔ اس کا کچھ مولوی صاحب کو ایسا صدمہ ہوا کہ بہت دنوں تک کام بند رہا۔ اس کے بعد ایک لڑکی کا بھی انتقال ہو گیا۔

پچاس برس کی عمر میں مولوی صاحب نے اپنی دوسری شادی کی اور شادی کے بعد پھر ریاست حیدرآباد میں گئے۔ وہاں اسسٹنٹ صیغہ تعلیم مقرر ہوئے اور وہیں سے دلگداز جاری کیا۔ تاریخ سندھ تصنیف کی اور اس پر

سرکار نظام سے پانچ ہزار روپیہ انعام ملا۔ کچھ دنوں کے بعد حیدر آباد سے قطع تعلق کرکے واپس آئے اور دفتر ہمدرد میں معقول تنخواہ پر ملازمت کرکے دہلی تشریف لے گئے مگر دہلی کی سوسائٹی مولانا کو پسند نہ آئی اور سال بھر کے اندر وہاں سے چلے آئے۔

پھر ریاست حیدر آباد میں طلبی ہوئی۔ سو روپیہ ماہوار تو حیدر آباد سے پنشن ملتی تھی چار سو روپیہ ماہوار تاریخ اسلام لکھنے پر مقرر ہوئے لیکن اس مرتبہ مولانا حیدر آباد میں مقیم نہ ہوئے کام لیکر اعلیٰ حضرت کی اجازت حاصل کرکے لکھنؤ تشریف لے آئے اور پانچ برس تک اس خدمت کو انجام دیتے رہے۔ ریاست نظام نے اس تاریخ کو بہت پسند کیا۔ اس مدّت میں دلگداز نے بہت ترقّی کی اور ہر سال ایک نیا ناول بھی ناظرین کو مفت ملنے لگا۔

دوسرے محل سے مولانا کے دو لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں۔ ان سب میں چھوٹی ایک لڑکی ہے۔ جس زمانہ میں مولانا حیدر آباد میں اسسٹنٹ صیغہ تعلیم تھے وہاں ایک ناول پردے کے نقائص پر لکھا تھا جس کا نام بدرالنسا کی مصیبت تھا۔ اس کے بعد لکھنؤ میں آکر پردۂ عصمت کا اجرا کیا جس کے اڈیٹر حسن شاد تھے۔ ایک ناگوار بحث بھی اس درمیان میں آپڑی۔ مسٹر چکبست مرحوم نے مثنوی گلزار نسیم کا ایک جدید اڈیشن شائع کیا۔ اس مقدمہ میں مصنّف کی مدح سرائی اور دوسرے شعرا کی مذّمت کا پہلو نکلتا تھا۔ مولانا نے اس پر ریویو

کیا اور اسی ضمن میں مثنوی کے بعض عیوب پر نظر ڈالی۔ اسکا جواب اودھ پنچ نے اپنے خاص پیرایہ میں دیا۔ جس کے بعد مولانا نے ظریف اخبار نکالا اور پنچ کے رنگ میں جواب الجواب لکھا۔ ظریف کے ایڈیٹر منشی نثار حسین صاحب تھے۔ یہ بحث آٹھ مہینے تک جاری رہی اور اس میں فریقین سے بہت کچھ ردّو کد رہی۔ پھر مولانا نے ایک رسالہ العرفان نکالا جس کے ایڈیٹر حکیم سراج الحق صاحب تھے اُس میں بھی تمام مضامین مولانا کے قلم کے ہوتے تھے مگر اس رسالے کی عمر بھی بہت کم ہوئی۔ مولانا کی تمام تصانیف مقبول عام ہوئیں اور اسقدر مقبول ہوئیں کہ باوجود حق تالیف محفوظ ہونے کے مختلف مطابع نے شہید وفا۔ ملک العزیز۔ منصور موہنا۔ درگیش نندنی۔ دلچسپ۔ دلکش۔ فردوس بریں۔ فلورا فلورنڈا کو بار بار چھپوا کر فائدہ اُٹھایا۔ اور اسی پر اکتفا نہیں کی۔ حسن کا ڈاکو اور دربار حرام پور خراب کر کے اور تبدل تحرّف کر کے اور قیمت قلیل رکھکر حجم کم کر کے خراب کاغذ پر چھپوا کر ملک کو دھوکا دیا اور بہت فائدہ حاصل کیا۔

یوں تو تمام تصانیف مولانا کی مقبول عام ہوئیں مگر ابتدائی ناولوں میں ملک العزیز ورجنا۔ منصور موہنا۔ درگیش نندنی۔ شہید وفا کو سب سے زاید قبولیت عام کا شرف ملا۔ اور آخری ناولوں میں حسن کا ڈاکو۔ شوقین ملکہ۔ جویائے حق۔ دربار حرام پور حد سے زیادہ پسند کئے گئے۔

مولانا علمی خدمت کے اسقدر حریص تھے کہ ان کا مدّ مقابل آج ایک

تنفس بھی نظر نہیں آتا ستر برس کی عمر ہوئی پچپن برس تک زبان اُردو کی خدمت میں مصروف رہے۔ اودھ اخبار روزانہ اخبار صحیفہ نامی۔ ہمدرد میں کام کیا۔ محشر۔ مہذب۔ دلگداز۔ اتحاد۔ پردہ عصمت۔ العرفان۔ ان سب رسالوں میں مضمون لکھے۔ اِن میں ۴۶ برس تک دلگداز کو جاری رکھا اِس کے بعد اِن کی تصانیف کی طرف غور کیجیے تو اُس کی تعداد کم و بیش ایک سو کتاب سے زائد ہے۔ دلگداز کے مختلف مضامین اور تاریخ کے بعض ابواب ناول کے بعض حصّے صیغہ تعلیم کے کورس میں داخل ہوئے۔ مولانا کے بعض ناول کے ترجمے دوسری زبانوں میں کئے گئے۔

آخر عمر میں مولانا کا رجحان تصوّف کی طرف ہوا اور متقدّمین صوفیہ کی سوانح عمری سے اُس کی ابتدا ہوئی۔ سوانح عمری خواجہ معین الدین چشتی۔ سوانح ابوبکر شبلی اور اسی طرح کی کتابیں تصنیف کیں اور وہ پکّے حنفی صوفی پابند صوم و صلوٰۃ ہو گئے۔ نماز تو مولانا ہمیشہ پڑھتے تھے مگر جو خضوع و خشوع آخر وقت میں ہو گیا تھا اُس کا درجہ بہت بلند تھا۔ چالیس پچاس برس کی عمر تک ترکی ٹوپی پہنی اور فرینچ ڈاڑھی رکھی۔ خضاب کا استعمال بھی کیا مگر اُس وقت میں اُن کا حلیہ دوسرا تھا۔ چوگیہ ٹوپی پوری ریش مبارک سفید گداز بدن میانہ قد گول چہرہ نورانی شکل اِسلام اور تاریخ اِسلام کا ہر وقت تذکرہ اُن کی زبان پر رہتا تھا۔ باتوں باتوں میں خدا اور رسول کے تذکرے کا پہلو نکال لیتے تھے۔

آخر وقت میں اُن کا سفر گھر سے جھنوائی ٹولہ تک رہ گیا تھا مگر یہ ناممکن تھا کہ وہ کسی ضرورت سے ہماری طرف سے نکلیں اور ہم سے نہ ملیں اور دو چار منٹ اپنے صرف نہ کریں یسال بھر کا عرصہ ہوا جب مولانا کسی قدر بیمار ہوئے اور خواب میں دیکھا کہ خاندان کے بعض بزرگ جو مر چکے ہیں مولانا سے کہتے ہیں کہ اب تم چلے آؤ۔ آپ نے یہ خواب اپنا بیان کیا اور کہا کہ اب اُمید نہیں کہ ہم اس بیماری سے نجات پائیں۔ احباب نے کہا کہ آپ گھبرائیں نہیں ہم دعا کریں گے اور آپ اچھے ہو جائیں گے۔ حُسنِ اتفاق سے ایسا ہی ہوا کہ مولانا تندرست ہو گئے اور ایسے اچھے ہوئے کہ اپنا کام اچھی طرح کرنے لگے۔

دس بجے سے قلم لیکر بیٹھتے تھے اور دو بجے تک برابر لکھا کرتے تھے۔ دو بجے سے چار بجے تک کمرے میں سوتے تھے یا آرام سے لیٹے رہتے تھے۔ شام کو دوست احباب سے ملنے چلے جاتے تھے اور وہاں سے اکثر آٹھ نو بجے رات کو گھر آتے تھے۔ جیسا طرزِ تحریر معلومات سے لبریز تھا ایسی تقریر نہ تھی مگر تقریر شروع کرنے کے بعد رفتہ رفتہ اُس میں بھی دلچسپی پیدا کر لیتے تھے اور خاتمہ تقریر بہت پُر لطف ہوتا تھا۔

شاعری آپ کی برائے نام تھی ابتدائے شباب میں کچھ غزلیں کہی تھیں اور دو مثنویاں شبِ غم اور شبِ وصل لکھی تھیں جو مقبولِ عام ہوئیں۔ لیکن فنِ شعر سے خوب واقف تھے اور اصولِ فن پر اکثر تقریر کیا کرتے تھے۔

سب سے آخری ناول نیکی کا پھل لکھا تھا جو انتقال کے بعد شائع ہوا ہے۔ اِس نام سے آپ کے خاتمہ کا عمدہ نتیجہ مرتّب ہوتا ہے۔

قدرت کے تماشے دیکھو کہ مولانا ۱۹۲۶ء کو رخصت کرتے ہوئے اپنے قلم سے اپنے مرنے کی خبر دلگداز کے صفحات پر لکھتے ہیں اور یہ نہیں محسوس کرتے کہ میں سال کی کیفیت نہیں بلکہ اپنی حالت لکھ رہا ہوں لکھتے ہیں :-

اِتنی ہی تھوڑی مدّت میں اُس نے بچپن کی نادانیاں جوانی کی اُمنگیں اور بڑھاپے کی پختہ کاریاں سب دیکھ لیں اور اب پانچ چھ روز کا مہمان ہے۔

کیا معلوم تھا کہ سچ مچ اِس تحریر کے پانچ چھ روز کے بعد مولانا بیمار ہو جائیں گے اور ایک ہفتہ بھی بستر علالت پر لیٹنا نصیب نہ ہوگا۔

# مولانا وحیدالدین سلیم

وحیدالدین نام۔ سلیم تخلص۔ والد کا نام حاجی فریدالدین صاحب مرحوم، پانی پت ضلع کرنال (پنجاب) کے شرفائے سادات سے تھے۔ اُن کے دادا ملتان سے نقل مکانی کر کے پہلے پاک پٹن پہونچے جہاں حاجی فریدالدین صاحب پیدا ہوئے۔ پھر پانی پت آئے اور اسی قصبہ کو مقامِ سکونت بنایا۔ حاجی صاحب پانی پت کے مشہور بزرگ حضرت بوعلی شاہ قلندر قدس سرہٗ کے مزار کے متوّلی

تھے۔ بہت زاہد و عابد اور مشہور عامل تھے۔ قصبہ استھاوان (بہار) کے مقدّس بزرگ مولانا سید غوث علی شاہ عرصۂ دراز کی سیر و سیاحت کے بعد جب پانی پت میں وارد ہوئے تو حاجی صاحب نے اصرار کے ساتھ اُن کو قلندر صاحب کے احاطہ میں ٹھہرایا اور اٹھارہ برس تک حضرت کی خدمت کی۔ حضرت والا حاجی صاحب کے حال پر بہت مہربان تھے۔ آپ کے اور آپ کے مہمانوں کے لئے دونوں وقت کھانا حاجی صاحب کے گھر سے آتا تھا۔ حاجی صاحب کے یہاں عموماً لڑکیاں پیدا ہوتی تھیں۔ اولاد نرینہ سے محروم تھے۔ حضرت کی دعا کی برکت سے حاجی صاحب کے ہاں دو فرزند نرینہ پیدا ہوئے۔ بڑے فرزند کا نام وحیدالدین اور چھوٹے کا نام حمیدالدین رکھا گیا۔ یہی فرزند اکبر ہمارے اس تذکرے کے موضوع مولانا سلیم صاحب ہیں۔ قصبہ کی ایک شریف اُستانی نے جو آپا شمس النساء کے نام سے مشہور تھیں، مولانا کو قرآن شریف حفظ کرایا۔ اس کے بعد خود مولانا حضرت غوث علی صاحب نے ان کو سرکاری اسکول میں داخل کرایا۔ حاجی صاحب کے انتقال کے بعد اُن کی تعلیم و تربیت کی نگرانی خود حضرت ہی نے کی۔ اوائل عمر ہی سے مولانا کو فارسی کا شوق تھا۔ وہ اپنی ذاتی کوشش سے فارسی کی کتابیں پڑھتے اور حاشیوں اور شرحوں کی مدد سے اُن کو سمجھنے کی کوشش کرتے رہے۔

جب یہ گلستاں کا تیسرا باب پڑھتے تھے اور ان کی عمر صرف چودہ برس کی تھی تو انھوں نے حضرت مولانا کی مدح میں فارسی میں ایک قصیدہ لکھا۔ جو

اکیتنوایک شعر پر مشتمل ہے اور عرفی کے ایک قصیدے کے جواب میں مولانا نے حضور کے سامنے مجمع عام میں یہ قصیدہ بلند آواز سے پڑھکر سُنایا۔ جسے سُنکر حاضرین محو حیرت ہو گئے کہ اس عمر اور اس لیاقت کے ایک بچّے سے ایسے دقیق مضامین کیونکر ادا ہوئے۔ درحقیقت یہ حضرت کے فیض اور توجہ کا نتیجہ تھا اور بطور حضرت کی کرامات کے کتاب "تذکرۂ غوثیہ" میں یہ قصیدہ چھاپا گیا ہے۔ اس قصیدے کے صلہ میں ممدوح نے ایک جیپوری اشرفی اور ایک زرتار بنارسی چادر مولانا سلیم صاحب کو عطا فرمائی تھی[۵۱]۔

مڈل تک تعلیم پانے کے بعد مولانا سلیم پانی پت سے لاہور پہنچے، جہاں آپ نے عربی ادب کی تعلیم مولانا فیض الحسن صاحب سہارنپوری سے پائی جو اس زمانہ میں اورینٹل کالج کے عربی پروفیسر تھے۔ تفسیر بھی انھیں سے پڑھی۔ فقہ حدیث اور منطق و فلسفہ کی تعلیم مولانا عبدالاحد ٹونکی سے حاصل کی۔ یہ تمام تعلیم محض شوقیہ اور آزادانہ تھی۔ سوائے انٹرنیس اور منشی فاضل کے یونیورسٹی کا کوئی امتحان پاس نہیں کیا۔ البتہ یونیورسٹی کے پروفیسروں سے مغربی فلسفۂ طبیعات کیمیا اور ریاضی کی تعلیم پائی مگر اس سلسلے کا بھی کوئی امتحان پاس نہیں کیا۔ ارادہ تھا کہ قانون کی تعلیم پاکر وکالت کا پیشہ اختیار کریں۔ چنانچہ قانونی درجہ میں داخل بھی ہو گئے تھے لیکن ضروریات معاش سے مجبور ہوکر یہ سلسلہ ختم کردینا پڑا اور صیغۂ تعلیم ریاست بہاولپور میں

---

۵۱۔ تذکرہ غوثیہ۔

ملازمت اختیار کرلی ایجرٹن کالج بھاولپور کی ششش سالہ ملازمت کے بعد مولانا کو ریاست رامپور کے ہائی اسکول میں ہیڈ مولوی کے عہدے پر بلا لیا گیا لیکن یہ سلسلہ ملازمت چھ ماہ سے زیادہ نہ چل سکا کیونکہ جنرل عظیم الدین صاحب مرحوم جو مولانا کے قدردان تھے اسی زمانہ میں یکایک مارے گئے۔ اِدھر مولانا مرض تشنج میں مبتلا ہوکر چھ سال تک صاحب فراش رہے۔ اس کے بعد آپ نے طب یونانی کا فن جالندھر کے ایک مشہور طبیب سے (جو کہ حکیم محمد محمود خاں صاحب کے ہم سبق تھے) حاصل کیا اور پرائیویٹ طور سے ڈاکٹری سے بھی واقفیت پیدا کر کے پانی پت میں مطب شروع کیا جو کئی سال تک کامیابی کے ساتھ چلتا رہا۔ اس زمانہ میں مولانا حالی صاحب مولانا کو اپنے ہمراہ علی گڈھ لے گئے اور سرسید سے ملایا۔

سرسید کی مردم شناس آنکھوں نے اس جوہر فرد کو پہچانا اور باصرار تمام مولانا کو اپنے پاس رہنے کے لئے آمادہ کرلیا۔ اور مرتے دم تک انھیں اپنے پاس سے جُدا نہ ہونے دیا۔ اگر کبھی مولانا کسی بات پر ناراض ہوکر علی گڈھ سے چلے جاتے تو سرسید اپنے خاص رفیق مولوی زین العابدین صاحب کو اسٹیشن تک اُن کے تعاقب میں روانہ کرتے اور مولانا سلیم کشاں کشاں پھر سرسید کے دربار میں واپس لائے جاتے۔ سرسید کا دستور تھا کہ علمی اور مذہبی مسئلے جو زیر تنقیح ہوتے تھے اُن میں مولانا سلیم سے بحث و مباحثہ کرتے تھے مولانا سلیم اور سرسید دو فریق بنجاتے اور ہر مسئلے کے ایک ایک پہلو کو ہر دو صاحبان لے لیتے اور اُس پر خوب

مخالفانہ بحث و مباحثہ ہوتا اور آخر کار کسی نتیجہ پر پہنچکر یہ مباحثہ ختم کردیا جاتا۔ علاوہ اس خدمت کے مولانا سلیم صاحب سرسید کو تصنیف و تالیف میں مدد دیتے اور اُن کے لئے مضامین کا مواد فراہم کرتے تھے۔ نیز علی گڈھ گزٹ اور تہذیب الاخلاق میں مضامین لکھتے تھے۔ سرسید کے انتقال کے بعد اُنھوں نے حاجی اسمٰعیل خانصاحب رئیس وتاولی کی معیت میں رسالہ "معارف" نکالا جس نے بہت شہرت پائی۔ اسی زمانے میں مولانا سلیم کے چھوٹے بھائی حمیدالدین صاحب نے "حالی پریس" کے نام سے ایک مطبع پانی پت میں قائم کیا۔ جو کئی سال تک جاری رہا۔ علی گڈھ کالج کے طلبار کے مشہور اسٹرائک کے ختم ہونے پر نواب محسن الملک مرحوم نے مولانا کو علی گڈھ گزٹ کی ایڈیٹری کے لئے بلایا۔ اس خدمت کو کئی سال تک مولانا نے نہایت سرگرمی اور مستعدی سے انجام دیا۔ اور آخر کار علالت کی مجبوری سے استعفادیکر اپنے وطن کو واپس چلے گئے اور ایک مدت تک خاموش زندگی بسر کرنے کے بعد جب لکھنؤ کے اُفق پر "مسلم گزٹ" طلوع ہوا تو بانیانِ اخبار کی نظر انتخاب مولانا پر پڑی اور مولانا حالی کے اصرار سے آپ نے "مسلم گزٹ" کی ایڈیٹری قبول فرمائی۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ سیاسیات حاضرہ کی ابتدا ہوئی تھی مسلمانوں نے پالٹکس کے میدان میں چند نمایاں قدم اُٹھائے تھے مسلم لیگ کے نصب العین میں حکومت خوداختیاری کا مطالبہ شامل ہو رہا تھا مسلم یونیورسٹی کے آئین اساسی تیار ہو رہے تھے اور یونیورسٹی میں حکومت وقت کے اختیارات کا مسئلہ تمام قوم کا

جاذب نظر بنا ہوا تھا۔ جنگ طرابلس اور جنگ بلقان نے مسلمانوں کے احساس پر ایک بیدار کن ضرب لگائی تھی اور اس کے کچھ ہی عرصہ کے بعد مسجد کانپور کے واقعہ نے ایک عام قومی ہیجان پیدا کر دیا تھا۔ ایسے زمانے میں مولانا کے زبردست قلم نے "مسلم گزٹ" کے صفحات پر جو جولانیاں اور سحر نگاریاں کی ہیں وہ اُردو کے سیاسی لٹریچر کا بہترین سرمایہ ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس زمانے میں مولانا کی جادو نگاری نے تمام قوم کی ذہنیت میں ایک نمایاں انقلاب پیدا کر دیا تھا "مسلم گزٹ" کا غلغلہ ہندوستان کے ہر گوشے میں پہنچ گیا تھا۔ آخر کار مسجد کانپور کے سلسلے میں حکام کی سخت گیری کے سبب سے مولانا کو مسلم گزٹ کی ایڈیٹری چھوڑنی پڑی مگر بہت جلد مولانا کو اخبار زمیندار کی چیف ایڈیٹری پر بلا لیا گیا۔ اس زمانے میں زمیندار ہندوستان کا سب سے زیادہ کثیر الاشاعت اخبار ہوگیا۔ انگریزی اخباروں میں بھی صرف ایک اخبار "اسٹیٹسمین" ایسا تھا جسکی اشاعت "زمیندار" سے زیادہ تھی باقی تمام اخبارات "زمیندار" سے نیچے تھے۔ مولانا کے زمانے میں "زمیندار" نہایت آب و تاب سے نکلتا رہا۔ اور بالآخر جب اُسکا مطبع ضبط ہوگیا تو مولانا اپنے گھر چلے گئے۔

**مولانا سلیم کی ایک زندہ جاوید علمی خدمت**

حیدرآباد میں عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہونے سے پہلے ایک محکمہ دارالترجمہ کے نام سے قائم ہوا تھا تاکہ

عثمانیہ یونیورسٹی کے لئے درسی کتابوں کا ترجمہ کرنے سب سے بڑی دقّت اصطلاحات کے ترجمے میں پیش آئی مترجموں کے گروہ اپنے اپنے مذاق کے مطابق مختلف رائیں رکھتے تھے۔ کوئی فیصلہ کن اصول پیشِ نظر نہ تھا۔ چونکہ مولانا سلیم صاحب اس مسئلہ پہ مدّت دراز سے غور کر رہے تھے اس لئے وہ بُلائے گئے۔ حیدرآباد پہنچ کر وہ اصطلاحات کی کمیٹیوں میں شریک ہوئے اور ایک معرکتہ الآرا کتاب وضع اصطلاحات پر لکھی۔ اس کتاب میں مولانا نے ثابت کیا ہے کہ اُردو ایک آریائی خاندان السنہ کی زبان ہے۔ جو لوگ عربی زبان کی قواعد کے مطابق اصطلاحیں بناتے ہیں وہ درحقیقت اِس زبان کی فطرت کے خلاف عمل کرتے ہیں۔ اس اصول مسئلہ کو اس کتاب میں نہایت مدلّل طریقے سے ثابت کیا ہے مگر قدامت پرست مترجموں نے اس پر یہ مشہور کر دیا اور مولانا پر یہ اتّہام لگایا کہ مصنّف عربی زبان کا مخالف اور ہندی کا طرفدار ہے۔ مصنّف نے اِس کتاب میں بتایا ہے کہ آریائی زبانوں میں جو مشترک اصول ہیں وہ سب اُردو زبان میں موجود ہیں۔ مثلاً آریائی زبانوں کا ایک اصول ہے کہ دو یا دو سے زیادہ لفظوں کو باہم ملا کر ایک مرکب لفظ بنا لیتے ہیں۔ اس کی مثالیں مصنّف نے اُردو زبان کے بہت سے الفاظ لکھکر دی ہیں۔ پھر بتایا ہے کہ پری فکس (سابقہ) اور سفکس (لاحقہ) کے ذریعہ سے الفاظ بنانا بھی آریائی زبانوں کا خاصّہ ہے۔ اِس کے ثبوت میں وہ تمام سابقے اور لاحقے مع مثالوں کے لکھدیئے ہیں، جو ہندی فارسی اور

ترکی وغیرہ زبانوں سے اُردو میں لئے گئے ہیں۔ نیز یہ بھی بتایا ہے کہ دونوں اُصول عربی اور دیگر سامی زبانوں میں نہیں ہیں الفاظ کو مرکب کرنے کے طریقے جو اُردو میں مستعمل ہیں وہ سب بتائے ہیں۔ پھر مفرد اور مرکب اصطلاحیں بنانے کے اصول سمجھائے ہیں اور ہر ایک اُصول کی مثالیں دی ہیں۔ اِن اصولوں کو تمام اہل الرائے نے تسلیم کیا ہے اور اکثر اِنھیں اصولوں کے مطابق دارالترجمہ میں اصطلاحیں بنائی جاتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا نے یہ کتاب لکھکر اُردو زبان پر ایک ایسا احسان عظیم کیا ہے جس کا شکریہ آیندہ صدیوں تک ادا کیا جائے گا۔ مولانا نے وضع اصطلاحات کا فن مدوّن کرکے اُردو زبان کے زندہ رہنے کا سامان مہیّا کردیا اور اب یقیناً یہ ایک علمی زبان بن جائے گی اور اس میں زندہ رہنے کی قابلیت پیدا ہو جائے گی۔ میرا تو یہ عقیدہ ہے کہ اس کتاب نے مولانا سلیم کے نام کو زندہ جاوید بنا دیا۔

**عثمانیہ یونیورسٹی سے تعلق** عثمانیہ یونیورسٹی کھلنے پر مولانا کو ادبیات اُردو کی اسسٹنٹ پروفیسری پر متعین کردیا گیا۔ مگر پروفیسر کا درجہ اس یونیورسٹی میں اُنھیں لوگوں کو دیا جاتا ہے جو ولایت کا ڈپلوما حاصل کرچکے ہوں لیکن چار سال کے بعد مولانا استثنائی طور پر پروفیسر بنا دئے گئے۔ اس وقت آپ کی عمر ۵۰ سال یا کچھ کم تھی اُس وقت سے آخر عمر تک وہ اُسی عہدہ

پر مامور رہے۔

**علمی لیاقت** انھوں نے عربی کے تمام درسی علوم حاصل کئے تھے۔ فارسی کی انتہائی کتابیں پڑھی تھیں اور پڑھائی تھیں۔ جدید علوم مغربی اُردو ترجموں کے ذریعے سے اور جدید معلومات کی کتابیں انگریزی خوانوں سے پڑھوا کر اور سُنکر حاصل کئے تھے۔ جب وہ سرسیّد کے لٹریری اسسٹنٹ مقرّر ہوئے تو سرسیّد پر اُن کی ہمہ دانی کا سکّہ بیٹھ گیا اور مرتے دم تک انھیں اپنے پاس سے جُدا نہیں کیا۔ گو انھوں نے انگریزی کی اعلےٰ تعلیم حاصل نہیں کی تاہم انگریزی تعلیم یافتوں سے جب کسی علمی مسئلے پر گفتگو ہوتی تو اُن کو اکثر حیران ہونا پڑتا تھا۔ پروفیسری کے زمانے میں بھی وہ اُردو ادبیات کی تعلیم انھیں جدید طریقوں کے مطابق دیتے تھے جن پر انگریزی لٹریچر کی تعلیم کا دارومدار ہے۔

**شاعری** مولانا کے ابتدائی حالات کی تحقیق سے معلوم ہوا کہ انھیں شاعری کا شوق چودہ برس کی عمر سے تھا۔ ابتدا میں اُردو غزلیں اُسی ڈھنگ کی لکھیں جیسی عام طور سے لکھی جاتی ہیں۔ لاہور کے زمانۂ تعلیم میں اُن کے خیالات بدلے اور انھوں نے بہت سی قومی نظمیں لکھیں اس زمانے میں عربی اور فارسی زبانوں میں بھی بہت سے اشعار لکھے۔ اُن دونوں زبانوں میں بھی اُنکا کلام پختہ سمجھا گیا تھا۔ سرسیّد کے لٹریری اسسٹنٹ مقرّر ہونے سے پہلے

یہ سلسلہ جاری رہا مگر اس خدمت پر پہنچکر نثر کی طرف زیادہ میلان ہوگیا۔ تاہم اُردو شاعری نہیں چھوٹی۔ وقتاً فوقتاً دل جوش اُبھرآتا تھا اور کسی نظم کے پیرائے میں دل کی بھڑاس نکل جاتی تھی یہ نظمیں جن دوستوں کے ہاتھ لگیں وہ لے گئے۔ اُس زمانے کا کلام اب باقی نہیں۔ معارف۔ زمیندار۔ مسلم گزٹ میں البتہ اسکا کچھ جزو موجود ہے۔ مگر وہ سب فرضی ناموں سے ہے۔ اکثر نظموں کے آخر میں لبرل مسلمان لکھا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ مولانا سلیم باوجود ایک کہنہ مشق اور زبردست شاعر ہونے کے اپنے تئیں شاعر مشہور کرنے اور اپنے کلام کو شائع کرنے سے ہمیشہ گریز کرتے رہتے تھے اور باوجود اپنے احباب کے اصرار کے اپنا بقیہ کلام چھپوانے پر آمادہ نہیں ہوئے۔ یہ غیر مطبوعہ کلام قیام حیدرآباد کے وقت سے تعلق رکھتا ہے۔ اُن دنوں وہاں ایک مشاعرہ ماہوار ہوتا تھا۔ اُس میں بڑے بڑے کہنہ مشق شاعر جمع ہوتے تھے۔ دوستوں کے اصرار سے مولانا بھی اُن مشاعروں میں شریک ہونے لگے اور اُن کے دوستوں اور شاگردوں نے اُن کا کلام رسالوں میں چھپنے کے لئے باہر بھیجنا شروع کردیا۔ غزلوں کے علاوہ اب اُن کی مستقل نظمیں بھی اخباروں اور رسالوں میں شائع ہونے لگیں۔ جب مولانا حالی زندہ تھے تو اکثر اُنھوں نے اپنا کلام مولانا مرحوم کو سُنایا۔ مگر اصلاح اُن سے کبھی نہیں لی۔ مولانا حالی مرحوم اُن کے طرزِ بیان اور خیالات پر اکثر پہروں وجد کیا کرتے اور فرمایا کرتے

تھے کہ تم شاعری کے پیچھے ہوئے دیوتا ہو۔

مولانا حالی نے اپنے مقدمۂ شعر وشاعری میں اُردو شاعری کے جو عیوب خاص کر غزل گوئی کے متعلق بیان کئے ہیں مولانا سلیم نے اُن کو ترک کر دیا تھا۔ غزل میں جو مضامین وہ باندھتے تھے وہ اکثر سیاسی اور اخلاقی ہوتے تھے، جو استعارے اور تمثیل کے پیرایے میں ادا کئے جاتے تھے۔ سمجھنے والے اُن اشاروں کو سمجھتے تھے اور مزے لیتے تھے۔ ایک بڑی خصوصیت اُن کے کلام کی یہ ہے کہ اُنھوں نے مسلمانوں کے فرقوں کے اختلاف کو کبھی نمایاں نہیں کیا۔ وہ ہندو مسلمانوں کو ہمیشہ اتحاد کا سبق دیتے رہے۔ کوئی بات جو کسی اسلامی فرقے یا ہندوؤں کے لئے دل آزاری کا باعث ہو کبھی اُن کے قلم سے نہیں نکلی۔ آپ نے ہندوؤں کے بزرگوں اُن کی تاریخ اور ادب کا اُسی طرح عظمت کے ساتھ نام لیا ہے جس طرح ایک مہذب شاعر کو لینا چاہئے۔

مولانا کی مستقل نظمیں | مستقل نظموں میں دو قسم کی نظمیں ہیں۔ ایک وہ ہیں جو طبیعت کی اُپج سے لکھی ہیں۔ دوسری وہ ہیں جو انگریزی شعرا کے کلام سے ماخوذ ہیں پہلی قسم کی نظموں میں بعض نظمیں ایسی ہیں، جو انداز بیان اور نئے اور صرا نے استعاروں کے لحاظ سے نیز اُن عمیق اور بلند خیالات کے لحاظ سے جو اُن میں بیان کئے گئے ہیں فی الواقع ماسٹر پیس (شہپارہ) کہلانے کے قابل ہیں۔ دوسری قسم کی نظموں میں اُنھوں نے شاعری کی روح کو برقرار رکھا ہے لفظی

ترجمہ کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ جسکا اثر یہ ہوا ہے کہ یہ نظمیں بالکل ایسی ہیں جیسی اپنی طبیعت کے تقاضے سے لکھی جاتی ہیں۔

مولانا سلیم ہمیشہ اس بات کی کوشش کرتے تھے کہ شعر میں کوئی نہ کوئی جدّت ضرور ہو۔ انداز بیان نرالا ہو یا کوئی نیا استعارہ ہو یا کوئی نیا خیال ہو۔ اگر کوئی جدّت نہ ہو تو وہ اُس شعر کو پسند نہ کرتے تھے۔ اُن کے کلام میں تصوّف بھی ہے اور فلسفہ بھی۔ تصوّف کا عنصر اُس فیضِ صحبت کے اثر سے ہے جو بچپن میں حضرت مولانا سیّد غوث علی صاحب مرحوم سے حاصل ہوا اور فلسفہ کا عنصر جدید معلومات کی بنا پر ہے۔ اُن کی غزلیں بالعموم عمدہ اور نفیس ہیں مگر وہ غزلیں خاصکر اعلیٰ ترین ہیں جو حیدرآباد کے مشاعروں میں پڑھی گئی ہیں۔ اُن کے مخاطب اکثر نوجوان ہیں جن کے جذبات ترقی کو وہ غزلوں میں بھی اُکساتے رہتے ہیں۔

وہ متعصب مذہبی آدمی نہیں تھے۔ اُن کے خیالات تصوّف اور فلسفہ کی وجہ سے آزادانہ تھے۔ اُس آزادی کی جھلک اُن کے کلام میں جابجا ہے۔

نثر نگاری | مولانا نے زیادہ تر اُس زمانے سے نثر لکھنی شروع کی جبکہ وہ سرسیّد کے لٹریری اسسٹنٹ تھے۔ سرسیّد کی صحبت کے اثر سے اُن کی نثر میں یہ خصوصیت پیدا ہوگئی ہے کہ ہر مطلب کو وہ واضح طور سے بیان کرتے ہیں۔ اُن کے بیان میں کوئی ایسی گنجلک نہیں ہوتی جس سے پڑھنے والے کو سمجھنے میں

وقت پیش آئے۔ وہ ہر مضمون کو رواں لکھتے جاتے ہیں۔ لکھتے لکھتے جب جوش آتا ہے تو اُبل پڑتے ہیں اور اُن کے قلم سے ایسے موقعوں پر جو عبارتیں نکل جاتی ہیں وہ نہایت موثر اور دلگداز ہوتی ہیں۔ وہ خواہ مخواہ عربی کے موٹے موٹے الفاظ لکھکر ناظرین کو مرعوب کرنا نہیں چاہتے۔ وہ کسی موقع پر لفظوں کی تراش خراش کے پیچھے نہیں پڑتے۔ نئی نئی ترکیبیں گھڑکر اپنی لیاقت کا سکہ پڑھنے والوں کے دلوں میں بٹھانا نہیں چاہتے۔ بلکہ ہر بیان کو اول سے آخر تک سادہ اور رواں لکھنا چاہتے ہیں۔ یہ بات خود مضمون کے ہاتھ ہے کہ کسی موقع پر خود بخود فصاحت کا دریا اُبل پڑے اور اُن کے خیالات کو اپنی رو میں بہالے جائے۔ اُن کے ارادے اور آورد کو اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔

غرضکہ نثر نگاری میں وہ سرسید کے اسکول کے پیرو تھے۔ عربی دانوں کا گروہ آجکل جس قسم کی عربی نما اردو لکھتا ہے اُس کو وہ اپنے لئے پسند نہیں کرتے تھے حالانکہ اگر وہ چاہتے تو اپنی زبردست علمی لیاقت اور عربی زبان کی بدولت وہ دقیق سے دقیق عربی آمیز عبارت لکھ سکتے تھے۔ لیکن حقیقتاً اُنھیں اس سے سخت وحشت ہوتی تھی۔

چونکہ راقم الحروف کو مولانا سے فیض صحبت کے استفادے کے مواقع بہت کثرت سے حاصل ہوئے ہیں، مہینوں یکجائی نشست و برخاست رہی ہے۔ اس لئے اس بارہ میں مجھے اُن کی اُفتاد مزاج اور رجحان طبع کا خاص اندازہ

ہوا ہے۔ بارہا ایسا اتفاق ہوا ہے کہ مولانا کوئی اخبار یا رسالہ پڑھ رہے ہیں۔ وہ پڑھتے پڑھتے کسی جگہ رک گئے اور اپنے مخصوص انداز میں اس عبارت کے حُسن و قبح پر تبصرہ فرمانا شروع کر دیا۔ یا آواز کے اُتار چڑھاؤ یا لہجے کے تغیّرات سے عبارت کی تحسین یا مذّمت ظاہر فرمانے لگے۔ مولانا کی صحبت میں اس قسم کے مواقع نہایت دلچسپ ہوتے تھے۔

مولانا جس مضمون کو اختیار کرتے تھے۔ اکثر اُس سے گہری واقفیت کا اظہار کرتے تھے۔ اس قسم کے مضامین میں سے دو "کسی داس کی شاعری" اور "عرب کی شاعری" رسالہ اُردو۔ اورنگ آباد (دکن) میں شائع ہو کر مقبول عام ہو چکے ہیں۔ اُن کے مضامین تہذیب الاخلاق انسٹیٹیوٹ گزٹ۔ معارف۔ علی گڑھ منتھلی وغیرہ وغیرہ رسائل و اخبارات میں شائع ہوئے ہیں۔ اُن تمام مضامین کا انتخاب کیا جائے تو ایک نہایت نفیس و پاکیزہ ادبی مجموعہ تیار ہو سکتا ہے۔



گوپال کرشن گوکھلے

# آنریبل گوپال کرشن گوکھلے

ناموران ہند کے سوانح زندگی بالعموم نہایت حوصلہ افزا و جرأت بخش مطالعے ہیں مگر اُس بے غرض حب الوطنی اور قربانیِ نفس کی نظیر جس نے گوپال کرشن گوکھلے کو آج ساری قوم کا مایۂ ناز و افتخار بنا رکھا ہے مشکل سے کہیں اور مل سکتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قوم میں ایسے بزرگوار موجود ہیں جن کی ذہنی قابلیتیں بالاتر ہیں۔ جن کی استعدادِ علمی زیادہ دقیق ہے۔ جو عزّ و وقار۔ جاہ و حشمت کے لحاظ سے آپ پر فوق رکھتے ہیں۔ مگر وہ سچّا جوش وطن جس نے آپ کو فنا فی القوم بنا دیا ہے۔ اپنی وسعت عمیق اور مصروفیت میں فرد ہے۔ آپ کی زندگی پُرجوش نوجوانوں کے لئے اولوالعزمیوں اور بلند حوصلگیوں کا ایک نہایت مفید سبق اور قابل تقلید نمونہ ہے۔ آج آپ کو قوم کے پولیٹکل حلقوں میں نہایت ممتاز درجہ حاصل ہے۔ اور یہ کہنا مبالغہ نہیں ہے کہ آپ کے ہم وطن آپ کی پرستش کرتے ہیں۔ اس کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے کہ مہاتما گاندھی جیسے قابل تعظیم بزرگ بھی آپ کو اپنا مرشد تسلیم کرتے ہیں اور اس میں کو کسی کو

شک وشبہ کی گنجائش ہی نہیں ہے کہ مجلس قانون ساز میں آپ نے جو نمایاں کام کئے وہ اُس کی تاریخ میں یادگار رہیں گے۔

آپ ۱۸۶۶ء میں بمقام کولہاپور پیدا ہوئے۔ والدین اگرعسرت وتنگ حالی میں نہ مبتلا تھے تو کسی طرح خوشحال بھی نہ تھے۔ آپ نے وہیں کے اسکول میں ایف۔اے کی سند حاصل کی۔ بعدازاں بمبئی کے انفنسٹن کالج میں تحصیل علم کے لئے گئے۔ یہ کالج ہندوستان کے سب کالجوں کا بلحاظ قدامت اور بلحاظ خدمات سرتاج ہے۔ دادا بھائی نوروجی، سرفیروز مہتہ جیسے ہادیانِ قوم کی تعلیم وتربیت کا فخر اسی کالج کو حاصل ہے۔ یہاں مسٹر گوکھلے کی خداداد قابلیتوں کی بہت جلد دھوم مچ گئی۔ طلباء اور پروفیسر سبھی اعزاز کی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ ریاضی سے آپ کو خاص مناسبت تھی اور مسٹر ہاتھارن جو اُس کالج کا پروفیسر ریاضی تھا اپنے ہونہار شاگرد کی عطیات پر فخر کیا کرتا تھا۔ چونکہ آپ کے والدین تعلیمی اخراجات کے متحمّل نہ ہوسکتے تھے۔ یہ ازبس ضروری تھا کہ آپ امتحان میں وظیفہ دار قرار پائیں اور کوئی بھی جو آپ کی ذات وصفات سے واقف تھا۔ آپ کی کامیابی پر ذرّہ بھر بھی شک نہ کرسکتا تھا مگر کچھ ایسے اتفاقات پیش آگئے کہ آپ سندِاعزازی حاصل کرنے سے قاصر رہے۔ اِس نامبارک ناکامی سے جو صدمہ وملال آپ کو ہوا اُس کا اندازہ وہی

خوب کر سکتا ہے جس کی امیدوں پر بھی اسی طرح پانی پھر گیا ہو۔ آخر فکر معاش نے آپ کو پونا میں پہنچایا۔ یہاں انجنیئرنگ کالج میں داخل ہونے کا قصد تھا جس کے لئے آپ کی ریاضی نے آپ کو بہت موزوں بنا دیا تھا مگر ناکامی نے روسے بد دکھایا۔ داخلہ کا امتحان ختم ہو چکا تھا اور پرنسپل نے آپ کو داخل کرنے سے معذوری جتائی۔ یہ تازہ ناکامی اور بھی دلشکستگی کا باعث ہوئی۔ اگر نتیجہ حسب دلخواہ ہوتا تو آپ کسی ڈویژن کے انجنیئر ہو جاتے اور دولت و ثروت کے لحاظ سے آپ کی حالت بدرجہا بہتر ہوتی۔ مگر پھر نہیں معلوم آپ کی اعلیٰ دماغی و دلی اوصاف کا اظہار کس دائرہ میں ہوتا۔ حق تو یہ ہے کہ آپ کی قسمت میں ملک و قوم پر نثار ہونا لکھا تھا۔ آپ کی وہ ناکامیاں جو ذاتی مقاصد میں حارج ہوئیں قوم کے لئے عطیہ عظمیٰ ثابت ہو گئیں۔ خدا کرے ایسی ناکامیاں جس کے مبارک نتیجوں پر ہزاروں کامیابیاں رشک کرتی ہیں ہر شخص کو حاصل ہوں۔

اُسی زمانہ میں دکن کے چند دریا دل۔ پُر جوش ہمدردان قوم نے عوام کی تعلیم کے لئے ایک انگریزی مدرسہ کی بنیاد ڈالی تھی اور مسٹر تلک اور مسٹر اپیٹے اور چند دیگر بزرگوں کی سرپرستی میں ایک تعلیمی انجمن قائم ہوئی تھی جس کا مقصد اعلےٰ تعلیم کی اشاعت تھا۔ مسٹر گوکھلے

نے کسب معاش کی کوئی اور صورت نہ دیکھ کر اسی مدرسہ میں ایک اسامی قبول کر لی۔ آگے چلکر یہی مدرسہ ترقی پاکر فرگسن کالج پونا کے نام سے مشہور ہوا اور آج تک دکن کی ہمدردی۔ جوش حبّ وطن اور ایثار کی زندہ یادگار ہے۔ تعلیمی انجمن کے ہر ممبر کا یہ عہد ہوتا تھا کہ وہ اس کالج میں بلا خیال معاوضہ تعلیمی خدمات بحسن تمام انجام دے گا۔ ہندوستان اُن بزرگوں کی نفس کشی کا قیامت تک مشکور رہے گا جنھوں نے ذاتی مفاد کو نظر انداز کر کے اپنی زندگی قومی خدمات کے نذر کی اور جن کی مساعی جمیلہ کی بدولت ایک چھوٹا سا اسکول آج ہندوستان کے نہایت نامی و گرامی قومی کالجوں میں ہے۔ شکر ہے کہ وہی قومی جوش جس نے فرگسن کالج کو پالا پوسا، آج ہمارے تاریک صوبہ میں بھی نمایاں طور پر ظاہر ہو رہا ہے۔ چند روشن خیال حامیانِ قوم نے ہندو سنٹرل کالج کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دی ہیں جو زمانہ آئندہ میں ضرور بالضرور بار ور ہوں گی۔

دیگر متوسط الحال نوجوانوں کی طرح مسٹر گوکھلے کے سینہ میں بھی علاوہ نام و نمود کے دولت و ثروت کے ارمان بھرے ہوئے تھے۔ انھوں نے یہ ملازمت ضرورت سے مجبور ہو کر محض عارضی طور پر قبول کر لی تھی مگر جب تعلیمی انجمن کے ممبروں کے ساتھ رہنے سہنے، اُٹھنے بیٹھنے اور تبادلہ خیالات کا موقع ملا تو اُن کے فیاضانہ و ہمدردانہ خیالات کا زبردست اثر

مسٹر گوکھلے پر بھی پڑا۔ آپ بھی اُسی رنگ میں رنگ گئے اور حبّ وطن کا جوش یہاں تک اُمڈا کہ نام و نمود دولت و ثروت کے ہوائی قلعے یک لخت منہدم ہو گئے۔ آپ جیسے نوجوان شخص کے لئے جس کی موروثی جائداد کچھ نہ تھی اور نہ تو وسیع آمدنی کے دوسرے ذرائع موجود تھے اس تعلیمی انجمن کی کوششوں میں ہاتھ بٹانا معمولی کام نہ تھا۔ خصوصاً اُس حالت میں جبکہ متوسلین کی ایک معقول تعداد آپ کی کفالت کی محتاج ہو۔ عہدنامہ پر دستخط کرنے سے پہلے کچھ عرصے تک آپ بڑے پس و پیش میں مبتلا تھے مگر آخر کشش حب وطن کی کشش غالب آئی اور آپ دکن کی تعلیمی انجمن میں شریک ہو گئے۔ جس کے معنی یہ تھے کہ آپ پچھتّر روپیہ ماہوار کی تنخواہ کو معراج ترقی سمجھ کر بیس برس تک تعلیمی خدمات انجام دیں گے۔ اِس قربانی سے ظاہر ہو سکتا ہے کہ آپ کی نگاہوں میں رفاہ عامّہ کا درجہ دنیا کے دوسری مادّی خواہشوں کے مقابلے میں کیا تھا جب یہ خیال کیجئے کہ اُس وقت آپ کی عمر کل اٹھّارہ سال کی تھی جبکہ دل میں ولولے اور اُمنگوں کا دریا جوش مارتا ہوتا ہے تو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ آپ واقعی فرشتہ خصلت بزرگوار تھے۔ ایسے محبّان وطن تو بہت ملیں گے جو لذّات دنیا سے کامل طور پر سیر ہو جانے کے بعد حیات چند روزہ کے چند آخری دن قومی کاموں کے نذر کرتے ہیں مگر ایسے کتنے ہیں جو مسٹر گوکھلے کی طرح قوم کے لئے

تن من دھن سبھی سونپ دینے پر آمادہ ہو جائیں گے؟

اس انجمن میں شریک ہونے کے بعد آپ نے نہایت دلسوزی سرگرمی و یکسوئی کے ساتھ سلسلۂ تدریس جاری کیا۔ آپ کی پُرجوش کوششوں نے بہت جلد آپ کو پروفیسروں میں ممتاز جگہ دیدی۔ اور چند ہی دنوں میں آپ اُس کالج کے روح رواں ہو گئے۔ اُس وقت کالج کی مالی حالت ایسی ابتر ہو رہی تھی کہ مجبوراً ایک معمولی عمارت میں گزر کرنا پڑتا تھا۔ آپ نے اُس کے لئے ایک شاندار شایان شان عمارت بنوانے کا قصد مصمم کر لیا اور اپنے ہم پیشہ اصحاب کے ساتھ دکن کا دورہ کرنا شروع کیا۔ تقریباً تین برس کی جانفشانیوں کے بعد آپ نے دو لاکھ روپیہ فراہم کر لئے۔ اس کامیابی نے آپ کی حُسن کوشش۔ خوبی تدبیر اور قابلیت انتظام کا سکہ بٹھا دیا۔ کالج کے لئے بہت جلد ایک عالیشان عمارت تعمیر ہوئی جو ہمیشہ اصحاب دکن کی سچی قومی ہمدردی اور بے لوث کوششوں کا مظہر رہے گی۔ اس عظیم الشان کالج اور اُس کے دلدادہ کارکنان کے سعی موفور کی داد جن الفاظ میں لارڈ نارتھ کوٹ اور دیگر قدر دانوں نے دی ہے، وہ واقعی نہایت حوصلہ افزا ہے۔ چونکہ ملک کو آپ کی خدمات حسنہ کا مشکور ہونا تھا اُس کے سامان بھی غیب سے مہیّا ہوتے گئے۔ تعلیمی خدمات کو انجام دیتے ابھی تین برس بھی نہیں گذرے تھے کہ آپ کو اُس ذی کمال،

فرشتہ خصال۔ کریم النفس بزرگوار سے عقیدتمندی کا مبارک موقع ملا۔ جس کا جشن آج ہندوستان کا بچہ بچہ گا رہا ہے۔ ایسا کون ہوگا جو مہادیو گوبند رانا ڈے مرحوم کے نام نامی سے واقف نہ ہو۔ ہندوستان کا ہر در و دیوار اُس نیک مرد کی تعریف میں ترنم ساز ہے۔ اُن کی زندگی دُنیا کے سارے اوصاف حمیدہ کی ایک مثال ہے۔ اس حبیب وطن کے دل میں ملک وقوم کی یاد ہر دم بنی رہتی تھی۔ ہندوستان کی ایسی کوئی سوسائٹی یا انجمن نہ تھی جس کو اُس مرد نیک نفس کی ذات بابرکات سے فیض نہ پہنچا ہو۔ اُن دنوں اُن کی پونا کی سارو جنک سبھا کے متعلق اخبار نکالنے کے لئے ایک جفاکش۔ ذی حوصلہ۔ روشن خیال۔ پُر جوش اور دیانت دار نوجوان اڈیٹر کی ضرورت تھی۔ مسٹر گوکھلے کا سن اُس وقت بائیس سال سے زیادہ نہ تھا۔ کتنے ہی پراتم جہاں دیدہ حضرات اس خدمت کے داعی تھے مگر مسٹر رانا ڈے کی مردم شناس نگاہوں میں اس کام کے لئے کوئی شخص آپ سے زیادہ موزوں نہ معلوم ہوا۔ سبحان اللہ! کیا نبض شناسی ہے۔ واقعات نے ثابت کر دیا کہ مسٹر رانا ڈے کا انتخاب اس سے بہتر ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

اڈیٹری کا قلمدان دست مبارک میں لیتے ہی آپ نے ملکی، مالی، و تمدنی پیچیدہ مسائل کا محققانہ مطالعہ شروع کیا اور اُن گتھیوں کو سلجھانے

کے لئے مسٹر راناڈے سے بڑھ کر کس کے ناخن فکر ہو سکتے تھے۔ ایک بزرگوار کا قول ہے کہ "مسٹر گوکھلے ایک قومی ترکہ ہے جو راناڈے مرحوم نے ملک کو بخشا ہے" اور یہ قول نہایت صادق ہے۔ اِس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ آپ اپنے پیرو مرشد کے رنگ میں ہمہ تن ڈوبے ہوئے تھے۔ آپ نے ایک اسپیچ میں خود شاگردانہ افتخار سے فرمایا تھا کہ "مجھے بارہ برس تک اُس مردِ نیک سے فخرِ تلمذ رہا۔ اور اس مدّت میں میں اُن کے ارشادات سے بغایت مستفید ہوا"۔ اِن الفاظ سے جس قدر جوشِ عقیدت ٹپکتا ہے محتاجِ بیان نہیں۔ سبحان اللہ! کیسا فرشتہ خصال اُستاد تھا۔ اور کیسا ذی کمال شاگرد۔ آج مسٹر راناڈے کی روح جنّت میں اپنے شاگرد کے بے لوث حبِّ وطن پر وجد کر رہی ہو گی۔ آپ کو ملک کے مالی مسائل اور معاملات پر جو قدرت حاصل تھی وہ اُسی بزرگوار کے فیضانِ صحبت کا اثر تھا۔ آپ نے اِس دوازدہ سالہ تلمّذ میں متعدد مالی رپورٹوں اور رسالوں کے خلاصے کئے جو تصحیح و تہدید کے لئے مسٹر راناڈے کی خدمت میں پیش کئے جاتے تھے اور کیا اس میں کوئی شک ہے کہ اُن کی اصلاحیں وفادار عقیدتمند شاگرد کے لئے حرزِ جان ہو جاتی تھیں۔ یہ اُنھیں عرق ریزیوں کی برکت تھی کہ آپ سرکاری مالی رپورٹوں کی بھول بھلیاں کی ذرا بھی حقیقت نہیں سمجھتے تھے اور چٹکی بجاتے میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی

الگ کر کے دکھا دیتے تھے۔

مسٹر راناڈے کی خدمت میں نیاز حاصل ہونے سے آپ کو صرف یہی فائدہ نہیں ہوا کہ آپ کو ملکی مسائل کے دقیق و عمیق نکات پر عبور حاصل ہو گیا۔ بلکہ شب و روز کی قربت نے آپ کے لوح دل پر اپنے مرشد کی حیرت انگیز جفاکشی۔ وسعت نگاہ۔ بے تعصبی۔ قوت امتیاز اور صادق الطبعی کا نقش کر دیا۔ جو زمانہ کے ساتھ ساتھ بجائے مٹنے کے اور بھی نمایاں طور پر ظاہر ہوتا گیا۔ آٹھ برس تک آپ نے علاوہ تعلیمی خدمات کے سارو جنک سبھا کا اخبار مسٹر راناڈے کی زیر ہدایت بڑی قابلیت سے چلایا۔ آپ کی رائیں ایسی پختہ و صائب ہوتی تھیں۔ اور آپ کے ملکی مضامین میں وہ تازگی۔ جدت اور زور قلم ہوتا تھا کہ تھوڑے ہی دنوں میں وہ رسالہ تعلیم یافتہ حلقوں میں اعزاز کی نگاہوں سے دیکھا جانے لگا اور ملک کو معلوم ہو گیا کہ آپ کی ذات سے یہاں کی پبلک لائف میں ایک قابل قدر اضافہ ہو گیا ہے۔ اس کا عملی ثبوت یہ ملا کہ آپ بمبئی پراونشل کاؤنسل کے سکریٹریٹ پر ممتاز ہوئے اور چار سال تک ان فرائض کو کمال تن دہی و لیاقت سے ادا کیا۔ ان خدمات سے آپ کی شہرت ہندوستان کے دیگر صوبجات میں بوئے مشک کی طرح پھیلنے لگی اور آخر کار ۱۸۹۷ء میں آپ انڈین نیشنل کانگریس کے سکریٹری کے عہدے پر مامور ہوئے۔

اسی سال آپ کو اظہارِ حب وطن کا ایک اور نہایت نادر موقع ہاتھ لگا۔ نیشنل کانگریس اور دیگر ہمدردانِ قوم کی متواتر شکایت نے کہ مناصب جلیلہ پر بالعموم انگریز ہی مامور ہوتے ہیں اور ہندوستانی باوجود زیادہ قابلیت رکھنے کے محروم رہتے ہیں، پارلیمنٹ کی توجہ اپنے جانب پھیری۔ ایک شاہی کمیشن لارڈ دلبی کی صدارت میں مقرر کیا گیا تاکہ وہ اس امر کی تحقیقات کرے کہ یہ شکایتیں کس حد تک واقعات پر مبنی ہیں۔ اور چند ایسی عملی تجاویز پیش کرے جو گورنمنٹ ہندوستان کے لئے بمنزلۂ دستور العمل ہوں۔ افسوس کہ یہ انگریزی دیانت داری و معدلت پروری کا آخری اظہار تھا اور جس بیرحمی سے اینگلو انڈین طبقہ نے اُن تجاویز کی خلاف ورزی کی ہے وہ ہمیشہ اُن کے طرزِ عمل پر دھبہ لگاتی رہے گی۔

مسٹر گوکھلے کی نکتہ سنجی۔ پُرزور قوت بیان۔ ہندوستانی معاملات سے باخبری اور اقتصادی مسائل کی موشگافی کی قابلیت نے جس کا اس وقت تک سارے ہندوستان میں غلغلہ مچ رہا تھا۔ آپ کو اصحاب دکن کا وکیل بناکر دلبی کمیشن کے روبرو اظہار خیالات کے لئے بھیجا۔ اور آپ مسٹر سورینیدر ناتھ بنرجی۔ مسٹر ونشا ایڈل جی واچا اور مسٹر سبرمینا ائیر کے ساتھ اسی سال انگلستان تشریف لے گئے۔ وہاں کمیشن کے سامنے جو آپ نے اسپیچ فرمائی وہ فصاحت حسنِ بیان۔ پُرزور دلائل

اور جوش حب وطن کے لحاظ سے بے نظیر ہے۔ باوجودیکہ یہ اسپیچ بہت مطول تھی مگر کمشنروں نے اُس کی بڑی فراخ دلی اور خندہ پیشانی سے داد دی اور اِس میں شک نہیں کہ اس کا پُرزور اثر ان کی تجویزوں پر بھی پڑا۔ آپ نے ہندوستان کے افلاس اور گورنمنٹ کی بیجا سختی کا دردناک الفاظ میں تذکرہ کرنے کے بعد فرمایا۔

"موجودہ نظام سلطنت کا یہ اثر ہو رہا ہے کہ ہمارے قوار دماغی وجسمانی روز بروز ضعیف وکمزور ہوتے جاتے ہیں۔ ہم مجبور کئے جاتے ہیں کہ ذلت وحقارت کی زندگی بسر کریں۔ قدم قدم پر ہم کو یاد دلایا جاتا ہے کہ تم ایک پادر افتادہ قوم کے ممبر ہو۔ ہماری آزادیوں کا بے رحمی سے گلا گھونٹا جا رہا ہے اور یہ سب محض اس لئے کہ موجودہ نظام کی تقویت ہو۔ انگلستان کا ہر نوجوان جس کو خدا نے ذہن اور حوصلہ عطا فرمایا ہے اُمید کرتا ہے کہ کسی نہ کسی دن میں بھی قومی جہاز کا ناخدا بنوں گا۔ کسی نہ کسی دن میں بھی گلیڈسٹن کا رتبہ اور نلسن کی شہرت حاصل کروں گا۔ یہ خیال گو خواب ہی کیوں نہ ہو۔ اُس کی اولوالعزمیوں اور اُمنگوں کو اُبھارتا ہے۔ وہ ہمہ تن کسب کمال میں محو ہو جاتا ہے۔ ہمارے ملک کے بدقسمت نوجوان ایسے حوصلہ بڑھانے والے خواب بھی نہیں دیکھ سکتے۔ وہ ایسے عالی شان

ہوائی قلعے بھی نہیں بنا سکتے۔ موجودہ نظام کے ہوتے ہوئے ممکن نہیں کہ ہم اُن بلندیوں تک پہنچ سکیں جس کے قابل ہم کو قدرت نے بنا دیا ہے۔ وہ اخلاقی قوت جو ہر آزاد قوم میں ہوتی ہے ہم میں معدوم ہوتی جاتی ہے۔ آخر کار اس کا عبرتناک نتیجہ یہی ہوگا کہ رفتہ رفتہ ہماری انتظامی و جنگی قابلیتیں ترک استعمال سے ملیا میٹ ہو جائیں گی اور ہماری قوم ایک ایسی ذلیل قوم ہو جائے گی جو بجز لکڑیاں کاٹنے اور پانی بھرنے کے اور کسی کام کی نہ رہے گی۔

کمیشن کے روبرو شہادت دینے کے بعد مسٹر گوکھلے نے لندن اور دوسرے اضلاع انگلستان میں دورہ کرنا شروع کیا تاکہ اپنی پُرجوش تقریروں سے انگریزی عوام النّاس کے دلوں میں ہندوستان سے ہمدردی پیدا کر دیں۔ اور اُن کی اس قابل افسوس بے خبری کو جو ہندوستانی معاملات سے ہے، رفع کریں۔ آپ کی اِن مساعی جمیلہ کی داد انگریزی رعایا نے خوب دل کھول کر دی۔ آپ کی تقریروں سے بڑی دلچسپی ظاہر کی گئی۔ ہر طرف تحسین و آفرین کی صدائیں بلند ہوئیں۔ مبارکباد کے خطوط آنے لگے اور چند ہی دنوں میں آپ کی فصاحت و بلاغت ہمہ دانی و خوش بیانی مسلّمہ ہو گئی مگر عین اُس وقت جبکہ آپ سرخرو و کامیاب ہو کر ہندوستان کو واپس آنے والے تھے ایک نامبارک واقعہ پیش ہوا جس نے کچھ دنوں

تک آپ کو اپنے بے خبر ہموطنوں کی ناقدردانی - سرد مہری اور علانیہ تضحیک کا نشانہ بنا دیا۔ اُن دنوں بمبئی کی زمامِ حکومت - لارڈ سینڈھرسٹ کے ہاتھوں میں تھی - لارڈ موصوف نے انسداد پلیگ کے لیئے بڑے سخت قوانین وضع کئے تھے اور وہ اہلکاران جو اُن قوانین پر کاربند ہونے کے لیئے مامور تھے اُن پر حاشیہ چڑھا کر رعایا کے ساتھ ایسی بے عنوانیاں اور مظالم کرتے تھے جو ناگفتہ بہ ہیں - چنانچہ جب پونا اس مہلک وبا کا شکار ہوا اور اہلکاران گورنمنٹ اُس کے انسداد کے جوش میں اندھیر مچانے لگے تو رعایا برانگیختہ ہوگئی - تعلیم یافتہ اصحاب کو بھی سرکار کی یہ رخنہ اندازیاں ناگوار معلوم ہوئیں - اُنھوں نے اِس کی پُرزور مخالفت کی - اخباروں نے بھی اُنکا جنبہہ کیا - مگر نوکرشاہی خوابِ خرگوش سے نہ چونکے - آخر مسٹر انگریز صاحبان رینڈ اور آئرسٹ کو جو عوام کی نگاہ میں اُن تمام بے عنوانیوں کے محرک اور بانی سمجھے جاتے تھے گورنمنٹ کی بے اعتدالیوں اور رعایا کے جوشِ غضب کا خمیازہ اُٹھانا پڑا -

اِن دو انگریزوں کے قتل سے انگریزی حُکّام کے کان کھڑے ہوئے - اُن کو شُبہ ہوا کہ یہ ہنگامہ تعلیم یافتہ فرقہ کا برپا کیا ہوا ہے - انگریزی اخبارات نے بھی واویلا مچانی شروع کی اور جوشِ انتقام میں خدا معلوم کیا کیا زبان درازیاں اور خامہ فرسائیاں کیں - کسی نے صلاح دی ہندوستانی

اخبارات کی دھجیاں اڑا دو۔ کسی نے کہا پونا کو نیست ونابود کردو۔ ہندوستانی اخبارات کی جرأت بھی قابل تعریف ہے کہ وہ حق کہنے سے نہ چوکے۔ انگریزوں کا خوب ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ اور انجام کار یہ ہوا کہ گورنمنٹ نے چند رہنمایان قوم کے خون سے اپنے آتش غضب کو ٹھنڈا کیا۔ اینگلو انڈین حضرات نے گھی کے چراغ جلائے۔ خوشیاں منائیں اور گورنمنٹ کے بغایت ممنون ہوئے۔

ابھی مسٹر گوکھلے انگلستان ہی میں تھے کہ ان کے احباب نے گورنمنٹ ہند کے جور و تعدی کے دل ہلا دینے والے واقعات پونا سے لکھنے شروع کئے۔ ان کو امید تھی کہ آپ انگلستان میں گورنمنٹ کی ان بیجا کارروائیوں کی تشہیر کرکے ان کی طرف پارلیمنٹ کی توجہ مبذول کرائیں گے۔ ممکن نہ تھا کہ اپنے ہموطنوں کی یہ تباہی گت ایسے فدائی قوم کا جوش نہ ابھارتی۔ تاہم آپ نے بڑے ضبط و استقلال سے کام لیا۔ آپ کو خوب معلوم تھا کہ گورنمنٹ پر ان الزامات کے عاید کرنے کے لئے ثبوت بہم پہنچانا محال ہو جائے گا اور قبل اس کے کہ آپ ان واقعات کا اعلان کریں۔ آپ نے بڑے غور و خوض سے کام لیا۔ مگر اسی اثنا میں رینڈ اور آئرسٹ قتل کی ہولناک خبر پہنچی اور اس نے انگریزی رعایا میں عجب ہل چل مچا دی۔ ہندوستانیوں کی سرزنش کرنے کے لئے تدبیریں سوچی جانے لگیں۔ افواہ اڑی کہ شہر

کے بچیس سربرآوردہ روسا، دار پر کھینچے جائیں گے۔ علاوہ ہذا اور بھی ایسی ہی وحشت ناک خبریں جو بالکل بے بنیاد تھیں مشہور ہوئیں۔

آپ سے اب ضبط نہ ہوسکا لازم آیا کہ آپ بھی اپنی آواز بلند کریں۔ چنانچہ آپ نے اُنھیں خطوط کی بنیاد پر جو آپ کے احباب نے پونا سے لکھے تھے گورنمنٹ کے تشدّدات اور بے موقع سختیوں کا پُرزور اعلان کیا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ یہ رعایا کا قصور نہیں ہے کہ وہ برگشتہ ہورہی ہے بلکہ یہ گورنمنٹ کی نادانی ہے کہ وہ رعایا کو اس طرح آزردہ کرکے اشتعال دلا رہی ہے۔

آپ نے جو کچھ فرمایا بالکل اُنھیں خطوط کی بنا پر تھا۔ مگر لارڈ جارج ہملٹن نے جو اُس وقت سکریٹری ہندوستان تھے آپکے اُن الزامات و بیانات کی تردید لارڈ سینڈہرسٹ کے تحریر کی بنا پر کی۔ اور اب آپ کے لئے بجز اس کے اور کوئی طریق نہ تھا کہ یا تو واقعات اور مشاہدات سے اپنے دعووں کو پایۂ ثبوت تک پہنچائیں یا اُن کو ندامت کے ساتھ واپس لیں۔ چنانچہ آپ ہندوستان لوٹے مگر اسی اثنا میں بمبئی گورنمنٹ نے پونا کے سرغناؤں کی گرفتاری

کے احکام نافذ کردئے تھے اور جب آپ عدن میں پہنچے تو آپ کو انھیں مخبر احباب کے خطوط ملے جنہیں التجا کی گئی تھی کہ ہمارے نام شائع نہ کئے جائیں۔ گرفتاری کے احکام نے اُن لوگوں کو ایسا خوف زدہ کردیا تھا کہ وہ قسم کھانے پر آمادہ تھے کہ وہ خطوط ہمارے لکھے نہ تھے۔ اِس وقت اُس تشویش و دلخستگی کا اندازہ لگانا محال ہے جو دوستوں کی بے وفائی و بزدلی سے سینہ بے کینہ میں پیدا ہوئی۔

کچھ دنوں تک تو سب کو خدشہ تھا کہ اب آپ ہمیشہ کے لئے پبلک تحریکوں سے علٰحدگی برتنے پر مجبور کئے جائیں گے۔ آپ کو یقین ہوگیا کہ اُن الزامات کو جو میں نے گورنمنٹ پر لگائے تھے ثابت کردینا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ لہذا اب اقتضائے شرافت و مردی یہی تھا کہ آپ اپنی معذرت سے اُن الفاظ کی تلافی کریں جنسے گورنمنٹ کے ردائے عصمت پر دھبہ لگتا تھا۔ اپنے دعوؤں پر مستقل رہنا جبکہ اُن کے ثابت کرنے کی کوئی صورت نہ نظر آتی تھی۔ آپ کی منصفانہ نگاہوں میں گورنمنٹ کی توہین ناحق تھی چنانچہ آپ نے ہر ایک پہلو سوچنے کے بعد اپنا مشہور معروف معذرت نامہ شائع کیا مگر آپ کے ہموطن جو روئداد سے کماحقہ آگاہ نہ تھے آپ سے فوراً بدظن ہو گئے۔ آپ کے اس فعل کو تلوّن طبعی اور بزدلی سے منسوب کیا۔ آپ بڑی بیرحمی سے

تیرِ ملامت کا نشانہ بنائے گئے۔ حتیٰ کہ آپ پر زرگری اور خوشامد کا جُرم لگایا گیا۔ حالانکہ اُس وقت بھی ہندوستان اور انگلستان دونوں ہی ملکوں میں ایسے منصف مزاج راسخ الخیال بزرگوار تھے جنہوں نے آپ کی اِس جرأت ودلیرانہ حرکت کی بڑی فراخ دلی سے داد دی۔ جسٹس رانا ڈے مرحوم و مغفور نے جو اپنے قابلِ فخر اور سعادتمند شاگردوں کی نقل و حرکت کو پدرانہ شفقت و دلچسپی سے دیکھ رہے تھے آپ کی اس صفائی قلب کے ثبوت پر اظہار خوشنودی کیا مگر سبحان اللہ کیا ہمّت عالی اور کیا حوصلہ رفیع ہے کہ دوستوں و ہمدردوں کے دلشکن و مایوس کن اقوال و افعال نے آپ کی ہمتّوں کو ذرا بھی پس پا نہ کیا۔ آپ نے "ہرچہ از دوست میرسد نیکوست" کے مصداق پر اُن تمام اہانت آمیز کلمات کو جو آپ کی شان میں استعمال کئے گئے تھے ماتھے پر چڑھا لیا۔ ایسی حالت میں ایک نمائشی محبّ وطن اپنے ہموطنوں کو ناشکری اور احسان فراموشی کا مرتکب ٹھہراتا۔ اپنے ملک کی ناقدری و بیوفائی کا رونا روتا۔ اور غالبًا ہمیشہ کے لئے پبلک معاملات سے مُنہ پھیر لیتا۔ مگر آپ اُن محبّانِ وطن میں نہیں تھے جنم بھوم کی محبت اور بھائیوں کی بھلائی آپ کی سرشت میں خمیر ہو گئی تھی آپ اپنی خلقی استقلال و اطمینان سے پھر ملک کی خدمت میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ شکر ہے وہ دن بہت جلد آیا کہ آپ کے گم گشتہ مخالفین اپنی حرف گیریوں پر نادم و متاسف ہوئے۔

ابھی اخبار نویسوں کا غصہ دھیما نہ ہوا تھا کہ بمبئی میں پلیگ نے ہنگامۂ قیامت برپا کیا۔ لوگ گھر بار۔ لڑکے بالے چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ اس کی سخت ضرورت محسوس ہوئی کہ پُرجوش ہمدردانِ قوم مریضوں کے معالجہ و عیادت کے لئے اپنی جان جوکھوں میں ڈالیں۔ اس پُرخطر وادی میں سب سے پہلے جس نے قدم رکھا وہ آپ ہی تھے جس خودفراموشی۔ کسرنفسی۔ محویت و سرگرمی سے آپ نے افسرانِ پلیگ کا ہاتھ بٹایا وہ آپ ہی کا حصہ تھا۔ سارا ملک آپ کی تعریف سے گونجنے لگا۔ لارڈ سینڈھرسٹ نے بھی جنہوں نے پہلے بارہا آپ کو طعن و تشنیع کا آماجگاہ بنایا تھا اُس وقت آپ کی جوش قومی و خالص دردمندی کے قائل ہوگئے اور اجلاس کونسل میں آپ کا شکریہ ادا کرکے اپنا افتخار بڑھایا۔

آپ کی بہبودِ خلائق کی ان تھک کوششوں نے ملک کو پھر آپ کا معتقد بنالیا۔ اصحاب دکن نے یک زباں ہوکر بمبئی کاؤنسل کی ممبری پر آپ کو سرفراز کیا۔ یہاں آپ نے ملک کی خدمت ایسی یکجہتی اور خلوص سے کی کہ دلوں میں آپ کی عظمت قائم ہوگئی۔ بمبئی "لینڈ ریوینیو بل" کے متعلق جو سرگرم مباحثے ہوئے، اُن میں آپ نے نمایاں حصہ لیا اور بمبئی گورنمنٹ کو یقین دلایا کہ غیر ملازم ممبران گورنمنٹ کی نکتہ چینی

مخالفت کی نیت سے نہیں کرتے ۔بلکہ ہمدردانہ اتفاق کی نیت سے۔ غیر قومی گورنمنٹوں میں ہمیشہ یہ نقص رہتا ہے کہ اُس کی ہر تجویز میں دو پہلو ہوا کرتے ہیں ۔گورنمنٹ اپنے پہلو کے فوائد و نقصانات پر غور کر لیتی ہے مگر غریب رعایا کے پہلو کو بالکل نظر انداز کر جاتی ہے ۔آپ نے ہمیشہ اس کی صدق دل سے کوشش کی کہ گورنمنٹ کے روبرو ہر تجویز اور مسئلے پر رعایا کے پہلو سے نظر ڈالیں اور گورنمنٹ کو اُس کے لازمی نتائج سوجھائیں ۔تاکہ وہ رعایا کے خیالات اور ضروریات سے آگاہ ہوکر اُن کی بہبودی کی فکر میں رہیں۔

مسٹر گوکھلے کی اِن قابل وقعت خدمات نے مداحوں اور قدردانوں کا حلقہ اور بھی وسیع کر دیا ۔اور آپ بمبئی کی غیر سرکاری جماعت کی طرف سے وائسرائے کی کونسل کے ممبر منتخب ہوئے ۔ہر باخبر شخص جانتا ہے کہ یہاں پر آپ نے اپنے فرائض کیسی صادق الطبعی ۔جانفشانی و کاوش سے ادا کئے ۔آپ کے بحث کی تقریریں وسعت تحقیقات ۔جامعیت زورِ بیان اور دلیرانہ لہجہ کے لحاظ سے اپنی نظیر نہیں رکھتیں ۔آپ کے وہ نعرے جو آپ نے یونیورسٹی بل ۔اور آفیشل سیکرٹ بل کے خلاف بلند کئے ابھی تک ہمارے کانوں میں گونج رہے ہیں اور یقین ہے کہ ہمیشہ اپنے رنگ کا بہترین نمونہ سمجھے جائیں گے ۔آپ کی گرج سے

لارڈ کرزن جیسے شیر کی آواز بند ہو جاتی تھی - اِس میں شک نہیں کہ وائسرائے کی کونسل میں آپ ہی ایک ایسے مرد جری تھے جس سے لارڈ موصوف آنکھیں بچاتے پھرتے تھے - آپ کی نکتہ چینیاں بسا اوقات مخالفت پر بھی محمول کی گئی ہیں مگر اس کا سبب صرف یہ ہے کہ لارڈ کرزن جیسا خود پسند اور خود سر شخص اپنے طرزِ عمل کی قلعی کھلتے نہیں دیکھ سکتا تھا اور آپ کی نیتوں میں خامی دکھا کر اپنے دل کا بخار نکالتا تھا - آپ جیسا عالم فاضل اور باخبر شخص یہ جانے بغیر نہیں رہ سکتا کہ غیر قومی گورنمنٹیں ہمیشہ غلط فہمیوں اور ناہمدردیوں کا نشانہ بنی رہتی ہیں ' اُن کو ایک ایک قدم خوب نشیب و فراز دیکھ کر دھرنا ہوتا ہے - اِسی لحاظ سے آپ نے کبھی گورنمنٹ کو عام نگاہ میں حقیر یا خطاوار بنانے کی کوشش نہیں کی بلکہ جب کبھی موقع ملا ہے آپ نے بڑے فخر سے اُن عطیاتِ عظمیٰ کا ذکر کیا ہے جو انگریزی گورنمنٹ کی بدولت ہم کو حاصل ہیں - آپ انگریزوں کی دیانت راست معاملگی اور نیک نیتی کے ہمیشہ سے مدّاح تھے - مگر اس کے ساتھ ہی آپ اُن عیوب و کمزوریوں سے بے خبر نہیں تھے جو انگریزی گورنمنٹ میں موجود ہیں اور جنھوں نے اُس کو بدنام کر رکھا ہے - آپ کو یقین تھا کہ یہ نقائص بدنیتی کے باعث سے نہیں ہیں بلکہ غلط اور بے موقع اصولوں کی پابندی کی وجہ سے ہیں - اور اُن کے دفعیہ کی تدبیر اگر ہے تو یہی ہے کہ

اہل ہند کی ترقی تعلیم و تہذیب کے ساتھ ساتھ ملکی معاملات میں زیادہ دخل دیا جائے۔ اُن کی آوزیں زیادہ ہمدردی سے سُنی جائیں اُن کے کسب و کمال کی داد زیادہ فیاضی سے دیجائے اور بتدریج اُن کو اپنی پاسبانی آپ کرنے کی تعلیم دی جائے۔ بلاشک آپ کا معیار بہت بالا ہے مگر یہی معیار ہمیشہ نہ صرف اولوالعزم ہندوستانیوں کا رہا ہے بلکہ اُن عالی منش حق پسند انگریزوں کا بھی جو زمانہ گذشتہ میں ہندوستان کی قسمتوں کے مالک تھے۔ جان برائٹ۔ بریڈلا۔ میکالے اور فاسٹ جیسے جیسے انسان دوست۔ دریا دل بزرگوں کے پیش نظر یہی معیار تھا۔ لارڈ ناربروک۔ لارڈ بنٹنک اور لارڈ رپن جیسے جیسے باکمالوں نے اسی معیار پر عمل کرنے کی کوشش کی۔ اور راجہ رام موہن رائے جسٹس رانا ڈے اور دادا بھائی نوروجی جیسے جیسے پیغمبرانِ قوم پکار پکار کر اسی معیار کی تائید کرتے گئے۔ مسٹر گوکھلے بھی اسی معیار کے پُرجوش حامیوں میں تھے اور تا وقتیکہ وہ مبارک دن نہ آئے جبکہ گورنمنٹ اس معیار پر عمل کرے ہر اولوالعزم ہمدرد قوم کا فرض اولین ہو گا کہ وہ اسی معیار کو عملی صورت میں لانے کی کوشش میں سرگرم کار رہے۔

مسٹر گوکھلے کو قوم کی نگاہوں میں جو ہر دلعزیزی اور قوم کے سرغناؤں میں جو ممتاز درجہ حاصل تھا اُس پر ہر فرد بشر کو ناز ہو سکتا ہے۔

آپ نے اپنے کو قوم پر نثار کر دیا تھا۔ اگر آپ کو کوئی دنیاوی خواہش تھی تو یہ کہ ہندوستان دنیا کے سربرآوردہ اقوام میں اعزاز و وقار حاصل کرے اور قعرِ افلاس سے نکلکر سرسبزی کے معیار پر اپنا نشان نصب کرے۔ آپ شب و روز فلاحِ قوم کی تجاویز سوچنے میں محو رہتے تھے۔ فی الواقع آپ قوم کے نام پر بک گئے تھے۔ اور گو گورنمنٹ نے آپ کی خدمات شائستہ، بے غرض ہمدردیِ قوم۔ فلاحِ عامہ کی سچّی خواہش اور منصفانہ طرزِ خیال کی قدر افزائی کی اور آپ کو ستارۂ ہند کا معزز و محترم لقب دیا۔ مگر آپ اس حد تک متواضع و منکسر مزاج تھے کہ ان قدردانیوں کو اپنے سے بالا تصوّر فرماتے تھے۔ بہبود قوم کے سچے جوش میں آپ کو اعزاز و امتیاز حاصل کرنے کا ذرا بھی شوق نہیں تھا۔ آپ مسٹر دادا بھائی نوروجی کے گرم دل عقیدت کیشوں میں ہیں بمبئی میں جب مسٹر ممدوح کی سالگرہ کا جلسہ ہوا تھا اُس میں آپ نے ایک نہایت پُرجوش مدحیہ تقریر فرمائی۔ جس کے یہ آخری الفاظ آبِ زر سے لکھے جانے اور گوشۂ دل میں جگہ پانے کے قابل ہیں۔

"میرے نوجوان دوستو! خیال کرو کہ مسٹر دادا بھائی کی زندگی کیسا شاندار نمونہ ہے جو خدا نے تمھارے لئے مہیّا کیا ہے! وہ جوش و خروش جس سے تم نے اس نام کی تعظیم کی ہے نہایت دل خوش کن ہے۔ مگر ہم اس جلسہ کو ہرگز کامیاب نہ سمجھیں گے اگر تمھارے اُبھرے ہوئے جوش اتنے

ہی سے آسودہ ہوجائینگے۔ تمہارا فرض ہے کہ اِس زندگی سے سبق لو اور اپنا ظاہر و باطن اُسی نمونہ پر سنوارنے کی کوشش کرو۔ تاکہ کسی دن یہ خصائل تمہارے عناصر میں شامل ہو جائیں۔ حضرات! خدائے علیم و بصیر ہر ملک کو وقتاً فوقتاً اُس کی ضروریات کے موافق ایسے ارواح عالی عطا فرماتا رہتا ہے جو گم گشتگانِ طریقت کے لئے رہنماؤں کا کام دیں اور جنکے نقش قدم پر چل کر ہم بھولے بھٹکے مسافر اپنے منزل مقصود کو پہنچیں۔ بلاشک دادا بھائی اِس تیرۂ خاکدانِ ہند کے چشم و چراغ ہیں۔ اگر کوئی مجھ سے پوچھے تو میں ضرور کہونگا کہ آپ جیسا عالی خیال محب وطن دُنیا کے کسی ملک میں مشکل سے پیدا ہوگا۔ ہم میں سے غالباً کوئی بھی ایسا نہ ہوگا جو اُس بلندی تک پہنچ سکے۔ ایسے بہت کم ہوں گے جن میں ایسی مستقل مزاجی اور ایسی عالی دماغی کا جوہر موجود ہو لیکن ہم سب آپ کی طرح بلالحاظ ملّت و مذہب اپنے ملک کو پیار کر سکتے ہیں۔ ہم سب اُس مقصد اعلیٰ کے لئے جس پر آپ نے اپنی حیات نثار کر دی ہے کچھ نہ کچھ کوشش کر سکتے ہیں۔ آپ کی زندگی کا سب سے اہم سبق یہی ہے کہ ملک و قوم کی خدمت کرو۔ اگر ہمارے نوجوان بھائی اِس سبق سے تھوڑا بہت فائدہ بھی اُٹھائیں گے تو زمانہ آئندہ ضرور بااُمید نظر آئیگا چاہے کبھی کبھی سماں تاریک ہی کیوں نہ ہو جائے۔

مسٹر گوکھلے کے دل سے لگی تھی کہ جناب دادا بھائی نے جس مفید کام کی اپنے مدّت العمر کی کوشش میں محض ابتدا کی تھی وہ اُن کے ہموطنوں کی غفلت و پست ہمتی سے ضائع نہ ہو جائے اِس کے لیئے آپ نے بہترین تدبیر یہی سوچی کہ جناب موصوف کے طرز عمل کی پیروی کریں اگرچہ اِتنے دنوں کے تجربہ کے بعد اب اہلِ ہند کو معلوم ہو گیا ہے کہ اپنے تکالیف کی داستان اہلِ انگلستان کو سُنانا عبث ہے اور ہماری نجات اپنی ہی ہمت اور اصلاح پر مبنی ہے مگر آپ کو یقین تھا کہ انگریز رعایا کو ہندوستانی معاملات سے جو یہ ناہمدردی ہے وہ محض اُن کی جہالت کی وجہ سے ہے۔ بالذاتہ اُن میں انصاف پسندی کا یہ جوہر معدوم نہیں ہے۔ آپ کو توقع کامل تھی کہ جب اُن کو ہندوستانی معاملات سے آگاہی ہو گی تو وہ ضرور بالضرور اُن کی طرف توجہ کرینگے۔

ہمارے رہنمایانِ قوم کا ہمیشہ یہی خیال رہا ہے۔ چنانچہ وقتاً فوقتاً کانگرس ڈیلیگیٹوں کو ولایت بھیجنے کی تحریکیں بھی ہوا کی ہیں پہلی بار جو ڈیلیگیٹ گئے تھے۔ اُن میں سر سُرِیندر ناتھ بنرجی اور مسٹر منموہن گھوش مرحوم جیسے قادرانِ فن فصاحت تھے اُن کی سرگرمیاں بہت کچھ نتیجہ خیز ثابت ہوئی تھیں۔ ۱۹۰۴ء میں سال بھر ایسی ہی تحریک ہوئی اور یہ قصد مصمم کیا گیا کہ ہر صوبہ سے ایک ایک ڈیلیگیٹ انگلستان کو

بھیجا جائے۔ اِس اہم خدمت کے لئے سارے صوبہ بمبئی کی التجا آمیز نگاہیں مسٹر گوکھلے کی طرف اُٹھیں اور آپ کی مشکل پسند طبیعت نے اِس مہتم بالشان کام کو بڑی مستعدی سے ہاتھوں میں لیا۔ جس کے انجام دینے کے لئے آپ سے زیادہ موزوں دوسرا اہل نہیں سکتا تھا۔ ستمبر کے مہینے میں آپ دوبارہ ولایت تشریف لے چلے۔

انگلستان میں آپ کا استقبال باخبر حلقوں میں بڑی گرمجوشی اور اخلاص سے کیا گیا مگر چونکہ اِسی اثنا میں تقسیم بنگال اور سودیشی تحریک کے چرچے ہونے لگے تھے۔ اہل ہند کو خدشہ تھا کہ مبادا مانچسٹر اور لنکاشائر کے باشندگان جو سودیشی تحریک سے بدظن ہو رہے ہیں آپ سے سرد مہری اور تغافل برتیں۔ یہ خیال کیا جاتا تھا کہ اُن مقامات پر جاتے ہوئے آپ خود بھی ہچکیں گے مگر آپ کی تعمق نظری نے بھانپ لیا کہ اُن سے محترز رہنا اور بھی بیگانگی کا باعث ہوگا۔ جب دوا کی اُمید اُن سے ہے تو درد بھی اُنھیں سے کہنا چاہیے۔ چنانچہ آپ نے اُن شہروں میں جاکر ایسی پُرمغز دزنی اور پُرجوش تقریریں فرمائیں کہ سامعین کے خیالات پلٹ دئے۔ آپ نے سودیشی تحریک کی خوب حمایت کی۔ جو آپ کی اخلاقی جرأت کا زبردست ثبوت ہے۔ آپ نے فرمایا کہ بنگالے میں انگریزی اشیاء کی ناقدری کا باعث یہ نہیں ہے کہ بنگالی خدانخواستہ باغیانہ خیالات رکھتے ہیں

تاریخ و تجربہ شاہد ہے کہ مطیع و فرمانبردار قوم جیسی ہندوستانیوں کی ہے۔ ایسی دُنیا کی کوئی دوسری قوم نہیں ہو سکتی جو قوم ڈیڑھ سو برس سے ذرا بھی گردن نہ اُٹھائے اُس کا یکایک برافروختہ ہوجانا غیر ممکن ہے۔ تاوقتیکہ اُس کے دل کو کوئی جانگداز و ناقابل برداشت صدمہ نہ پہنچے۔ اِس میں کلام نہیں کہ لارڈ کرزن کی حرکات اور بالخصوص اُن کے آخری فعل نے بنگالیوں کو شکستہ حال بنا دیا ہے۔ تاہم ابھی تک کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوا جو کسی مہذّب گورنمنٹ کی مداخلت یا مزاحمت کا باعث کہا جاسکے۔ امن وامان میں ذرّہ برابر فرق نہیں آیا۔ انھیں صورتوں میں دُنیا کی کوئی دوسری مہذّب قوم خدا معلوم کیا کیا شور و شر فتنہ و فساد مچاتی۔ کوئی غیر متعصب شخص اہل بنگال کے ضبط و استقلال کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ خیال کرنا غلط فہمی ہے کہ سودیشی تحریک پر اس لئے زور دیا جارہا ہے کہ اُن کو انگریزوں سے دشمنی ہے۔ بہت سے اینگلو انڈین اخبارات لوگوں کو گمراہ کر رہے ہیں۔ جو اس غلط فہمی کا شکار ہوگیا ہے۔ اُس پر ظاہر ہو کہ یہ طریقہ محض اِس لئے اختیار کیا گیا ہے کہ اہل بنگال اپنی چیخ پکار۔ گریہ و زاری کی آوازیں اہل انگلستان کے کانوں تک پہنچائیں اور اُن کو اپنی ہمدردی و دلسوزی پر آمادہ کریں جو اِس طریقے سے بدظن ہو وہ بتلائے کہ اِس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے ہندوستانیوں کے ہاتھوں

میں دوسری کون سی تدبیر ہے۔ کیا سکریٹری انڈیا کے دروازے پر گداگری کرنے سے کام چلے گا؟ یا پارلیمنٹ میں دو ایک سوال پوچھنے سے مطلب حاصل ہوگا؟ اب انگریزوں کی منصف مزاجی کا اقتضا یہ ہے کہ وہ سکریٹری سے ملتجی ہوں۔ غریب ہندوستان پر جھلّانا جو خود ہی ذلیل و پائمال ہو رہا ہے مردمی سے بعید ہے۔

آپ نے ہر موقع پر ایسی ہی پُرزور تقریریں فرمائیں ناگوار نامرغوب صداقتوں کے بیان کرنے میں آپ کو ہرگز پس وپیش نہیں ہوتا تھا اور اہل انگلستان کی بھی عالی ہمتی ہے کہ اپنے ہی قوم کے جور و جبر کی کہانی سُننے کے لئے ہزاروں کی تعداد سے جمع ہوتے تھے۔ گو ان برہنہ سچائیوں سے اُن کی تفاخر قومی کو ضرور چوٹ لگتی تھی۔ تاہم آپ کے پاس مختلف انجمنوں اور سوسائٹیوں سے کچھ ارشاد فرمانے کے لئے اتنی دعوتیں آتی تھیں کہ آپ باوجود ریاضت شاقّہ کے عادی ہونے کے سب دعوتیں منظور نہ کر سکتے تھے اور اثنائے تقریر میں ایسے جوش سے تحسین و مرحبا کے نعرے بلند ہوتے تھے اور اوّل سے آخر تک ایسی غمخواری اور دردمندی کا اظہار ہوتا تھا کہ آپ کو اعتراف کرنا پڑتا تھا کہ صداقت پسندی کا جوہر ابھی تک انگریزوں میں ماند نہیں پڑا۔ آپ نے ڈیڑھ مہینے کی قلیل مدت میں کل انگلستان کا دورہ کیا اور متعدد تقریریں کیں مگر جس قوم نے مدّتوں

سے ہندوستان کو اپنی ملکیت سمجھ رکھی ہو اس پر ایسی تقریروں کا کیا دیرپا اثر پڑ سکتا تھا۔ معزز اور نیک دل انگریز اصحاب نے اظہار ہمدردی کیا اور بس نظام حکومت اسی پرانی رفتار سے چلتا رہا۔

مادرِ ہند! وہ لوگ بے انصافی کرتے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہندو قوم بےجان۔ مُردہ۔ افسردہ ہو گئی ہے۔ جب تک تیری گود میں دادابھائی راناڈے اور گوکھلے جیسے بچّے کھیلیں گے ہندو قوم کبھی مردہ نہیں کہی جا سکتی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اگر ان صاحب کمالوں کا جنم کسی آزاد ملک میں ہوا ہوتا تو وہ گلیڈسٹن یا بسمارک یا لائیڈ یا روزولٹ نہ ہوتے!

تمام شد

نیشنل پریس الہ آباد میں باہتمام رمضان علی شاہ چھپی

۹۲۰.۵۴

۲۴ پ

(ب ر)

**DUE DATE**

... Collection.

۳۲۶۸۵

سکینہ

۹۲۰.۵۰۵۴ پ ۲۴

(د ب و)

۳۲۶۸۵

| DATE | NO. | DATE | NO. |
| --- | --- | --- | --- |